رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

کے 9 مقالاتِ سیرت کا مجموعہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org

جملہ حقوق بحق مرکزی انجمن خدام القرآن اور دینِ حق ٹرسٹ محفوظ ہیں!

مذکورہ بالا دونوں ادارے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتابوں' تحریروں اور اقتباسات کے ضمن میں اجازت دیتے ہیں کہ کوئی شخص یا پبلشر اگر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے علمی مواد کو شائع کرنا چاہتا ہے تو وہ اشاعت سے قبل چند ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے' قیمتاً فروخت کرنے یا مفت تقسیم کرنے کے لیے' تحریری اجازت بلا معاوضہ مذکورہ بالا دونوں اداروں میں سے کسی ایک سے ضرور حاصل کر لے۔ اگر کوئی فرد/پبلشر معین کردہ ضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نام کتاب ——— رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم

طبع اوّل تا پنجم (جون 2014ء تا دسمبر 2020ء) ——— 11,000

طبع ششم (مارچ 2021ء) ——— 3300

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: 3-35869501

مطبع ——— حیدری پریس' لاہور

قیمت (اشاعت خاص) ——— 600 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 031 - 4

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

پیش لفظ — 4

○ عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم — 7

○ رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم — 61

○ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت — 147

○ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں — 205

○ اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں — 245

○ حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُس کے تقاضے — 335

○ معراجُ النّبی صلی اللہ علیہ وسلم — 371

○ رسولِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ انقلاب — 415

○ ختمِ نبوّت کے دو مفہوم
اور تکمیلِ رسالت کے عملی تقاضے — 471

پیش لفظ

رسول اکرم ﷺ نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا تھا:

((تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا : کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ رَسُوْلِہٖ)) (الموطأ)

''میں تم لوگوں کے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں' اگر تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے' اور وہ ہیں: اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت۔''

اس اُمت پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ پے در پے فتنوں کے علی الرغم ہر دور میں ایسے داعیانِ دین پیدا ہوتے رہے ہیں جو رجوع الی القرآن والسنۃ کے علَم بردار بن کر اُمت کو صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ عصرِ حاضر میں بانی تنظیم اسلامی وموسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہوا کہ انہیں اپنی کتاب سے خصوصی تعلق ونسبت عطا فرمائی اور آپ نے اپنی پوری زندگی قرآن حکیم کے علم وحکمت کی نشرو اشاعت اور اس کی انقلابی دعوت کو عام کرنے میں صرف کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے رسول اکرم ﷺ کی سنت وسیرت کو بھی اپنی دعوت کا موضوع بنایا اور خاص طور پر رسول اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت اور آپؐ کے منہجِ انقلاب پر اُمت کی توجہات مرکوز کرانے کی کوشش کی۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے نزدیک آج اُمتِ مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے اس طریق کار کو سمجھ لے جس پر رسول اکرم ﷺ نے تاریخ اسلامی کا عظیم ترین اور جامع ترین انقلاب برپا فرمایا۔

قریباً دو سال قبل ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کی آٹھ کتابوں اور کتابچوں کو یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب ''قرآن حکیم اور ہم'' پیش کی گئی تھی۔ اب اس سلسلے کی دوسری کتاب ''رسول اکرم ﷺ اور ہم'' پیش کی جارہی ہے۔ پیش نظر کتاب ''ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نو (۹) مقالات وخطابات کو جمع کر کے ترتیب دی گئی ہے جو متفرق کتابوں اور کتابچوں کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

◆ کتاب کا آغاز محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے ایک خطاب ''عظمتِ مصطفیٰ ﷺ'' سے کیا گیا ہے' جو یکم جولائی ۱۹۹۹ء کو لاہور میں ہوا۔ رسول اکرم ﷺ کی شخصیت کی عظمت کے مختلف پہلو ہیں' جن میں بعض پہلوؤں کا بیان تو درکنار ان کا ادراک وشعور بھی ہمارے لیے ناممکنات میں سے ہے۔ البتہ آپ ﷺ کی عظمت کے بے شمار پہلو ہمارے لیے قابلِ ادراک ہیں۔ مثلاً ایک سپہ سالار' ایک مدبر ومنتظم

ایک قاضی القضاۃ' ایک مقنن' ایک داعی' ایک مربی' مزکّی اور معلم کی حیثیت سے آپ کے عظیم کردار کی دنیا معترف ہے۔ اس خطاب میں نبی اکرم ﷺ کی عظمت بحیثیت ایک داعی انقلاب کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

◆ ''رسولِ کامل ﷺ'' محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی بارہ مختصر تقاریر پر مشتمل ہے' جو پندرھویں صدی ہجری کے پہلے ربیع الاول میں (یکم تا بارہ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ) پاکستان ٹیلی ویژن سے قومی نشریاتی رابطہ پر پیش کی گئیں۔ پندرہ پندرہ منٹ کی ان تقاریر میں ڈاکٹر صاحب نے نبوت و رسالت کی غرض و غایت' رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں اور خصوصیت کے ساتھ آپ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ جیسے موضوعات کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا۔

◆ ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت: قرآن حکیم کی روشنی میں'' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی دوسری سالانہ قرآن کانفرنس کے دوران ۱۲/ربیع الاول ۱۳۹۵ کو پیش کیا گیا تھا' جبکہ دوسرا مقالہ ''انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج'' شامِ ہمدرد لاہور کی تقریب میں ۱۲/ربیع الاول ۱۳۹۷ھ کو پیش کیا گیا۔ ان میں سے مقالۂ اولیٰ دو ابواب میں منقسم ہے' یعنی ''بعثت انبیاء کا اساسی مقصد'' اور ''بعثتِ محمدیؐ کی اتمامی اور تکمیلی شان۔''

◆ ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کی ایک تقریر ہے جو اوائل ۱۹۷۳ء میں کراچی کی ایک جامع مسجد میں کی گئی تھی۔ اس تقریر میں سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی چار بنیادوں (۱) ایمان' (۲) توقیر و تعظیم' (۳) نصرتِ رسولؐ اور (۴) اتباعِ قرآن مجید کی وضاحت کی گئی ہے اور اس ضمن میں دعوتِ فکر دی گئی ہے۔

◆ ''اُسوۂ رسول ﷺ'' سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی آیات کے درس پر مشتمل ہے' جو محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے مسلسل درسِ قرآن کریم کے دوران جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں مئی ۱۹۷۹ء میں دیا تھا۔ اس رکوع میں اُسوۂ حسنہ سے متعلق جو مضامین آئے ان کو صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفا نہیں کیا گیا' بلکہ ان مضامین میں ہمارے لیے جو عملی سبق مضمر ہے اس کو بعد ازاں ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر وضاحت سے بیان کیا گیا۔ یوں تو نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہر مسلمان کے لیے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے' لیکن آیۂ مبارکہ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ میں لفظ ''اُسوۂ حسنہ'' خاص طور پر غزوۂ احزاب کے تناظر میں آیا ہے۔ یعنی وہ صبر و ثبات' اللہ کے دین کے لیے سرفروشی و جاں فشانی کہ جاں نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ ہر مشقت میں شریک تھے۔ ہمارا اس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ اصل ''اُسوہ'' ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

◆ ''حُبِّ رسول ﷺ اور اس کے تقاضے'' ایک مختصر مگر جامع خطاب ہے' جو اسلامی جمعیت طلبہ

علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ۱۴/نومبر ۱۹۷۸ء کو ارشاد فرمایا تھا۔

◆ ’’معراج النبی ﷺ‘‘ واقعہ معراج کے متعلق محترم ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک خطاب ہے جو آپ نے ۲۷/رجب المرجب ۱۴۰۲ھ کو فرمایا تھا۔ اس خطاب میں اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ قرآن و حدیث سے ثابت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو جسد اقدس کے ساتھ ہی معراج کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ مزید برآں عقلی دلائل سے بھی اس محیرّ العقل واقعہ کے استبعاد کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جس کے متعلق کچھ تجدد پسند دانشوروں نے غلط فہمیاں اور مغالطے پیدا کر کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اذہان میں ریب و تشکیک کے کانٹے بو دیے ہیں۔

◆ محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے ۸۵۔۱۹۸۴ء کے دوران مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نبی اکرم ﷺ کے منہجِ انقلاب کے موضوع پر گیارہ خطابات فرمائے تھے۔ ان خطابات کے مجموعے پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ’’منہجِ انقلابِ نبویؐ‘‘ کے نام سے شائع ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر آنجناب نے ’’رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب‘‘ کے عنوان سے ۱۶/مئی ۲۰۰۴ء کو الحمرا ہال لاہور میں خطاب فرمایا‘ جسے بجا طور پر ’’منہجِ انقلابِ نبویؐ‘‘ کے ایک جامع خلاصے کی حیثیت حاصل ہے۔

◆ ’’ختمِ نبوت کے دو مفہوم اور تکمیلِ رسالت کے عملی تقاضے‘‘ ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کا ایک جامع خطاب ہے جو آپ نے ۲۳/جون ۲۰۰۲ء کو الحمرا ہال لاہور میں فرمایا۔

ان مقالات اور خطابات میں قارئین کو کئی جگہ تکرار (repetition) کا تأثر بھی ملے گا۔ مختلف اوقات میں‘ مختلف مقامات پر کیے گئے خطابات میں بعض مضامین کی تکرار ایسا معاملہ ہے جس سے مفر نہیں۔ تاہم قارئین یہ محسوس کریں گے کہ یہ تکرارِ محض نہیں ہے‘ بلکہ ع ’’اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!‘‘ والا معاملہ ہے۔

پیش نظر کتاب میں شامل بعض خطابات کی ترتیب و تسوید شیخ جمیل الرحمن مرحوم نے فرمائی تھی اور بعض کی سعادت راقم الحروف کے حصے میں آئی ہے۔ کتاب کی تدوین و تزئین اور طباعت کے کام میں عزیزم حافظ محمد زاہد (ادارتی معاون) اور محترم شیخ رحیم الدین (انچارج پرنٹنگ سیکشن) کی خصوصی لگن اور دلچسپی لائق ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس خدمتِ دینی کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے لیے صدقہ جاریہ اور رفعِ درجات کا ذریعہ بنائے اور اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت کی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے اسے سعادتِ دارین کا باعث بنائے۔

حافظ خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات

۱۴/جون ۲۰۱۴ء

عظمتِ مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب

- عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے قابلِ ادراک پہلو — 12
- عظمتِ مصطفیٰ ﷺ بحیثیتِ داعیٔ انقلاب — 13
- غیر مسلموں کا اعتراف اور شہادت — 14
- انقلابِ نبویؐ کا دیگر انقلابات سے تقابل — 21
- دس برس کی محنتِ شاقہ کا حاصل — 27
- یومِ طائف: حیاتِ طیبہ کا شدید ترین دن — 33
- بیعتِ عقبہ اولیٰ و بیعتِ عقبہ ثانیہ — 39
- داخلی استحکام کی خاطر اقدامات — 43
- مستشرقین کی کوتاہ نظری — 44
- رسول اللہ ﷺ کی طرف سے چھاپہ مارمہموں کا آغاز — 46
- غزوۂ بدر: مسلح تصادم کا آغاز — 48
- انقلابِ اسلامی کی توسیع و تصدیر کا مرحلہ — 51
- عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا ظہورِ کامل —— کب اور کیسے؟ — 54

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریکِ خلافت پاکستان کے تحت داعیٔ تحریکِ خلافت و امیرِ تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فکر انگیز خطاب

بمقام: فورسیزنز ہال لاہور' یکم جولائی ۱۹۹۹ء

معزز حاضرین! آپ کو معلوم ہے میرا آج کا موضوع ''عظمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے مجھے یہ تمہیدی بات آپ کے گوش گزار کرنی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی عظمت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک تو آپؐ کا مقام و مرتبہ اور آپؐ کی عظمت بحیثیت نبی ہے اور ایک آپؐ کی عظمت اور آپؐ کا مقامِ رفیع و بلند بحیثیت انسان ہے۔ پھر انسان کی حیثیت سے بھی ایک پہلو روحانیات کا ہے' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ روحانی اعتبار سے اور دوسرا پہلو عام انسانی معاملات کا ہے' جن میں سے انسان اپنی زندگی کے دوران لامحالہ گزرتا ہے اور مختلف حیثیتوں سے اس دنیا میں کام کرتا ہے۔ عظمتِ محمدیؐ کے یہ جو مختلف پہلو ہیں' ان میں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا بیان تو درکنار اس کا ادراک و شعور اور فہم بھی ہمارے لیے ناممکنات میں سے ہے۔ سادہ سی مثال ہے کہ ایک معالج' ڈاکٹر یا حکیم کا اپنے فن میں کیا مقام و مرتبہ ہے' ظاہر ہے اسے صرف کوئی ڈاکٹر' حکیم یا معالج ہی جان سکتا ہے۔ اسی طرح ایک انجینئر کا اپنے فن میں کیا مقام و مرتبہ ہے' ظاہر ہے اس سے کوئی انجینئر ہی واقف ہو سکتا ہے —— لہٰذا ایک نبی کی حیثیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ یہ صرف کسی نبی ہی کے لیے ممکن ہے کہ اس کا اندازہ کر سکے' کسی غیر نبی کے لیے یہ محالِ عقلی ہے۔ مزید برآں کسی انسان کا کسی ادارے یا فرم میں کیا مقام و مرتبہ ہے اس کا صحیح تعین وہی شخص کر سکتا ہے جو اس ادارے

میں اس سے بالاتر ہو‘ اس لیے کہ نیچے والا تو اوپر کی طرف صرف دیکھے گا‘ اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اپنے سے بلند تر مقام کے حامل شخص کا اصل مقام و مرتبہ معیّن کر سکے۔ ظاہر بات ہے نبی اکرم ﷺ سے بالاتر مقام کسی نبی کا نہیں‘ لہٰذا کسی نبی کے لیے بھی یہ محالِ عقلی ہے کہ حضور ﷺ کے اصل مقام و مرتبہ کو سمجھ سکے‘ کجا یہ کہ کوئی عام انسان اور غیر نبی حضور ﷺ کے مقام کا تعین کرے۔ اسی طرح روحانی اعتبار سے حضور ﷺ کا مقام کیا ہے؟ ظاہر بات ہے ہم جیسے لوگوں کے لیے اس کا ادراک و شعور ممکن نہیں۔

بعض اعتبارات سے خود حضور ﷺ نے اسے واضح کیا ہے کہ یہ تمہارے لیے ناممکن ہے کہ تم ان مقامات کو سمجھ سکو! مثال کے طور پر حضور ﷺ صومِ وصال رکھتے تھے۔ صومِ وصال یہ ہے کہ آج روزہ رکھا اور شام کو افطار نہیں کیا اور وہی روزہ رات سے گزر کر اگلے دن تک چلا‘ اور اگر اگلے دن شام کو افطار کیا گیا تو یہ دو دن کا صومِ وصال ہوا‘ اور اگر یہی روزہ تیسرے دن تک چلا تو وہ تین دن کا صومِ وصال ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ خود صومِ وصال رکھتے تھے‘ لیکن آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں (صحابہ کرام ؓ) کو یہ روزہ رکھنے سے روکے رکھا۔ اس پر کسی صحابیؓ نے سوال کر لیا تو آپؐ نے فرمایا: ((وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ)) ”تم میں سے کون ہے جو میرے مانند ہو؟“ ((اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ)) ”میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے“۔ (1) ہمارے لیے کس طرح ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی اس شب بسری کا تصور کر سکیں جو اللہ کے ہاں ہوتی تھی‘ اس کی نوعیت اور اس کی کیفیت کیا تھی! وہ کھلانا اور پلانا کس نوعیت کا تھا! معلوم ہوا کہ یہ چیز ہمارے دائرے سے خارج ہے۔ میں سمجھتا ہوں بڑے سے بڑے صوفی اور بڑے سے بڑے ولی اللہ کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے روحانی مقام کا پورا پورا ادراک کر سکے۔

ان دونوں پہلوؤں سے جب ہماری عقلیں‘ ہمارا فہم اور شعور و ادراک عاجز ہے تو

---

۱) صحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب النھی عن الوصال فی الصوم۔ وصحیح البخاری (قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ) کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة‘ باب ما یکرہ من التعمق والتنازع فی العلم والغلو فی الدین۔

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اس کو بیان کرنے کی کوشش کرنا بھی بہت بڑی خطا ہے۔ یہ بڑی خطا کس اعتبار سے ہے؟ ایک سادہ سی مثال سے بات سمجھ میں آ جائے گی۔ کسی دیہاتی کی کوئی مشکل تھی جسے کسی شہری بابو نے حل کر دیا' وہ شہری شخص ڈپٹی کمشنر تھا' لیکن اس دیہاتی نے اسے دعا دی کہ خدا تجھے پٹواری بنائے۔ اس لیے کہ اس دیہاتی کے نزدیک تو سب سے بڑا عہدہ اور سب سے زیادہ صاحبِ اختیار ہستی پٹواری کی تھی' کیونکہ اس کی ذرا سی جنبشِ قلم سے زمین کسی اور کے نام ہو جاتی ہے اور اسی کی قلم کی جنبش سے مالیانہ معاف ہو جاتا ہے۔ اس کاشت کار اور دیہاتی سے متعلق سارے اختیارات تو پٹواری کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اسے کیا معلوم کہ پٹواری سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک کتنے عہدے درمیان میں ہیں اور وہ شخص کس بلند مقام پر فائز ہے جسے وہ دیہاتی پٹواری بننے کی دعا دے رہا ہے۔ چنانچہ اگر ہم حضور ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے تو شدید خطرہ ہے کہ ہم حضور ﷺ کی توہین کے مرتکب ہو جائیں۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کے مقام کا کماحقہٗ بیان ممکن نہیں۔ اور جب کماحقہٗ بیان ممکن نہیں ہے تو ہم اپنے تصور کے مطابق بیان کریں گے' جو حضور ﷺ کے اصل مقام و مرتبہ سے بہت کمتر ہوگا۔ اور اسی کا نام توہین ہے۔ شیخ سعدیؒ نے نہایت سادگی کے ساتھ اس ساری بحث کو ایک رباعی میں سمو دیا ہے۔

يَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَ يَا سَيِّدَ الْبَشر
مِن وَّجْهِكَ الْمُنِيْرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمر
لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءَ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر!

حضور ﷺ کی ثنا کا جتنا حق ہے وہ ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے' لہٰذا ''لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءَ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ''، ہمیں بس یہ کہہ کر اس بات کے دامن میں پناہ لینی ہے کہ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر''۔ اللہ کے بعد آپ ہی کی ہستی عظیم ترین و بلند ترین ہے' ہم اسے کس طرح اور کیا بیان کریں؟ ہمارا تصور بلکہ ہمارا تخیل بھی سرنگوں ہے کہ وہ اس بلند و

رفیع مقام کا ادراک اور شعور کر سکے۔ اسی بات کو نہایت خوبصورت انداز میں غالب نے بایں طور پر بیان کیا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است!

کہ ہم نے آنحضور ﷺ کی نعت وثنا کو خدا تعالیٰ (یزداں) کے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اس کی کوشش ہی نہیں کرتے' اس لیے کہ وہی ذاتِ پاک ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے اصل مقام و مرتبہ سے واقف ہے۔

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے قابلِ ادراک پہلو

میں نے دو اعتبارات سے آنحضور ﷺ کی عظمت اور آپ کے مقام و مرتبہ کو اپنے بیان کے دائرے سے بلند و بالا' برتر' اعلیٰ و ارفع اور اس اعتبار سے خارج قرار دیا ہے۔ البتہ ہماری سمجھ میں حضور ﷺ کی عظمت کا جو پہلو آ سکتا ہے وہ ہے آپؐ کی عظمت بحیثیت ''انسان''۔ لیکن اگر اس کا بھی تجزیہ کریں گے تو بحیثیت انسان بھی آپؐ کی عظمت کے بے شمار پہلو ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ کی حیثیت اور آپؐ کا مرتبہ و مقام بحیثیت ایک سپہ سالار کیا تھا۔ بڑے بڑے فوجی جرنیلوں سے پوچھیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے مختلف غزوات میں جو جنگی حکمت عملی اختیار فرمائی اس میں آپؐ نے کس مہارت کا ثبوت دیا' حالانکہ جنگِ بدر سے پہلے آپؐ نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ جنگ بدر سے پہلے آپ ﷺ نے صرف چند مہمات میں شرکت کی' باضابطہ جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی' لیکن دنیا دنگ ہے کہ جنگ کی مہارت اور اس کی حکمت عملی کو مرتب و معین کرنے میں آپؐ نے کس درجے صلاحیت و قابلیت کا ثبوت دیا۔ پھر کسی سے صلح کرنی ہوتی تو صلح کی گفت و شنید (negotiation) میں آپؐ نے کس مہارت' کیسی واقفیت اور کیسی اہلیت کا مظاہرہ فرمایا۔ صلح حدیبیہ ہو' میثاقِ مدینہ ہو' یا اس سے بھی پہلے یثرب کے مختلف طبقات کو آپس میں جمع کرنے کے لیے آپؐ نے جو معاہدہ فرمایا' ان معاہدات کا مطالعہ کیجیے' عقلیں دنگ رہ جائیں گی۔

ایک قاضی القضاۃ کی حیثیت سے آپ ﷺ کا مقام کیا ہے؟ آج بھی اس دنیا میں ’’قضا‘‘ (Judiciary) کے سلسلے میں جس قدر اصول اختیار کیے گئے ہیں وہ سب کے سب محمد رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ ہیں‘ مثلاً کسی بھی مقدمے میں ایک فریق کی بات سن کر فیصلہ نہ کیا جائے جب تک کہ فریق ثانی کو بھی سن نہ لیا جائے۔ یہ اصول آپؐ کا بیان کردہ ہے۔ شک کا فائدہ ملزم کو دیا جائے گا‘ الزام لگانے والے کو نہیں۔ یہ فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ اسی طرح یہ اصول آپ ﷺ ہی نے بنایا ہے کہ سو مجرم چھوٹ جائیں تو کوئی حرج نہیں‘ لیکن کسی بے گناہ کو سزا نہ ملے۔ عالمی سطح پر پورا عدالتی نظام انہی اصولوں پر قائم ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے ہاں کرپشن نے بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ ہماری خیانتیں‘ بدعنوانیاں‘ جانبداریاں‘ ہمارا ایک جانا اور سیاسی لوگوں کا آلۂ کار بن جانا وغیرہ‘ یہ چیزیں ہیں جنہوں نے عدلیہ کا بیڑہ غرق کیا ہوا ہے‘ لیکن جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے یہ اصول تو محمدِ عربی ﷺ کے عطا کردہ ہیں۔

اس سے ذرا نیچے اتریئے۔ حضور ﷺ کا بحیثیت باپ کردار کیا تھا؟ یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھئے۔ حضور ﷺ کا بحیثیت شوہر کردار کیا تھا اور آپؐ کی کیا عظمت تھی؟ یہ حضرت عائشہ‘ حضرت حفصہ‘ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہن سے پوچھئے۔ پھر یہ کہ ایک داماد ہونے کے اعتبار سے آپؐ کا کیا کردار تھا؟ یہ حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما سے پوچھئے۔ گویا جتنے انسانی علائق ہو سکتے ہیں ان کے اعتبار سے آپؐ کی شخصیت کی عظمت اور کردار کی بلندی ہماری سمجھ میں آ سکتی ہے۔

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ بحیثیتِ داعیٔ انقلاب

اسی طرح ایک داعی کی حیثیت سے آپؐ کا کیا مقام ہے؟ ایک مربّی اور مزکّی کی حیثیت سے آپؐ کا کیا مقام ہے؟ ایک معلّم کی حیثیت سے آپؐ کا کیا مقام ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہماری سمجھ میں آ سکتی ہیں اور ہم ان کا کچھ نہ کچھ ادراک و شعور کر سکتے ہیں۔ لیکن ان تمام حیثیتوں یعنی داعی‘ مربّی‘ مزکّی اور معلّم کو میں ایک لفظ میں جمع کرنا چاہتا

ہوں' یعنی ایک انقلاب کے داعی اور انقلابِ عظیم کے برپا کرنے والے کی حیثیت سے آپؐ کا مقام کیا ہے؟ گویا ہم جن پہلوؤں سے حضور ﷺ کی عظمت کو سمجھ سکتے ہیں ان میں سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے جو تبدیلی برپا کی یا اصطلاحاً جو عظیم انقلاب برپا کیا' اس انقلاب کا مطالعہ کیا جائے' اس کا حاصل اور اس کے نتائج مرتب کیے جائیں' اس کے لیے جو جِدّوجُہد ہوئی اس کے بارے میں غور کیا جائے تو واقعتاً حضور ﷺ کی اصل عظمت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ یہ ہے آپؐ کی عظمت کا وہ پہلو جس کا اقرار پوری دنیا نے کیا اور جس کی گواہی پوری دنیا نے دی۔

غیر مسلموں کا اعتراف اور شہادت

واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی اس اعتبار سے نمایاں ترین صدی ہے کہ سابقہ صدیوں کے دوران حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک سے جو تعصب غیر مسلموں کو تھا وہ رفتہ رفتہ اس صدی کے دوران ختم ہوا ہے اور اس صدی کے دوران آپؐ کی عظمت کا اس پہلو سے اعتراف اور اقرار تدریجاً پوری دنیا میں ہوا ہے۔ اس صدی کے بالکل آغاز میں اسی شہر لاہور میں ایم این رائے (۱۸۸۷ء۔۱۹۵۴ء) نے ۱۹۲۰ء میں ''بریڈلا ہال'' میں (جو اَب شاید کھنڈرات کی صورت اختیار کر گیا ہو گا یا وہاں کوئی اور چیز تعمیر ہو چکی ہو گی) ایک لیکچر دیا تھا' جس کا موضوع ''The Historical Role of Islam'' تھا۔ یہ کتاب اب بھی ہندوستان میں طبع ہوتی ہے' جسے بمبئی کا ایک ناشر شائع کرتا ہے۔ میں نے حیدر آباد دکن میں اس کا نسخہ دیکھا ہے' لیکن پاکستان میں کہیں دستیاب نہیں ہے۔ ایم این رائے کون تھا؟ یہ ''کیمونسٹ انٹرنیشنل'' کا ممبر تھا۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں اشترا کی انقلاب آیا اور اس کے بعد پوری دنیا میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ اس کے بعد عالمی سطح پر کیمونزم کی جو تنظیم قائم ہوئی وہ ''کیمونسٹ انٹرنیشنل'' کہلاتی تھی۔ دنیا کے چوٹی کے انقلابی لوگ اس کے ممبر تھے۔ ایم این رائے ہندوستان کی جانب سے اس کا رکن تھا جو کہ بہت بڑا انقلابی تھا' لیکن وہ ''The Historical Role of Islam'' میں صاف صاف کہتا ہے اور بڑی تفصیل سے کہتا ہے کہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ

تھا جو محمد عربی (ﷺ) نے برپا کیا تھا۔ حضور ﷺ کے جانشینوں اور جاں نثاروں نے جس سرعت کے ساتھ فتوحات حاصل کیں اور عراق' شام' ایران' مصر جس تیزی کے ساتھ فتح کیے' اگرچہ اس تیزی کے ساتھ تاریخ انسانی میں فتوحات پہلے بھی ہوئی ہیں...... ریکارڈ پر ہے کہ سکندرِ اعظم مقدونیہ سے چلا تھا اور دریائے بیاس تک پہنچا اور وہ جس تیزی کے ساتھ علاقے فتح کرتے ہوئے آیا وہ اپنی جگہ بہت بڑی مثال ہے۔ وہ تو مغرب سے مشرق کی طرف آیا تھا جبکہ اٹیلا مشرق سے مغرب کی طرف گیا تھا۔ چین کے شمال میں صحرائے گوبی سے نکل کر وہ ڈینوبر کی وادی تک جا پہنچا تھا۔ لیکن ایم این رائے کہتا ہے کہ ان فاتحین کی فتوحات محض ہوسِ ملک گیری کا شاخسانہ تھیں۔ اس نے انہیں "brute military campaigns" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے نتیجے میں کوئی نئی تہذیب یا کوئی نیا تمدن وجود میں نہیں آیا' دنیا میں کوئی روشنی نہیں پھیلی' کوئی علم کا فروغ نہیں ہوا۔ جبکہ محمد عربی ﷺ اور آپؐ کے جانشینوں کے ذریعے سے شرقاً غرباً جو فتوحات بڑی تیزی کے ساتھ ہوئی ہیں' ان کے نتیجے میں ایک نیا تمدن' نئی تہذیب' علم کی روشنی اور انسانی اقدار کا فروغ وجود میں آیا۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو ہر طرح کی زیادتیوں سے پاک تھا۔ اس میں سیاسی جبر نہیں تھا' اس میں معاشی استحصال نہیں تھا' اس میں کوئی سماجی فرق و تفاوت نہیں تھا۔ جیسے کہ علامہ اقبال نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہا ہے۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

دنیا میں اور بھی بڑے بڑے لوگ رہے ہیں جو سالہا سال تک پہاڑوں کی غاروں کے اندر تپسیائیں کرتے رہے ہیں' لیکن محمدِ عربی ﷺ نے غارِ حرا میں چند روز کے لیے جو خلوت گزینی اختیار کی تھی وہ اس قدر productive اور نتیجہ خیز تھی کہ اس سے ایک نئی قوم' نیا تمدن' نیا آئین اور حکومت وجود میں آ گئی۔ یہ ہے آنحضور ﷺ کی وہ عظمت کہ جس کا اظہار ایم این رائے نے اس صدی کے رُبع اوّل کے آخری سالوں میں کیا' جو

مسلمان نہیں، ہندو کمیونسٹ تھا۔

دوسری طرف اس صدی کے رُبع آخر کے ابتدائی سالوں میں امریکہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ (پیدائش: اپریل ۱۹۳۲ء) کی کتاب "The Hundred" ۱۹۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی، جس میں اُس نے پوری معلوم تاریخِ انسانی کا جائزہ لیا ہے کہ تاریخ کے سفر کے دوران کن کن شخصیات نے اس تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا ہے۔ اُس نے ایسے سو افراد کو چُن کر اُن پر کتاب لکھی ہے اور ان کے اندر بھی درجہ بندی (gradation) کی ہے کہ کس شخصیت نے سب سے زیادہ تاریخ کے دھارے کو متاثر کیا ہے اور سب سے زیادہ گھمبیر انداز میں اسے موڑا ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت محمد ﷺ کو اس درجہ بندی میں سب سے اوپر رکھا ہے۔ اس کتاب کا مصنف تاحال عیسائی ہے اور ابھی زندہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تیسرے نمبر پر لایا ہے، جبکہ نیوٹن کو دوسرے نمبر پر لایا ہے۔ نیوٹن کی فزکس نے جس طرح سے تاریخِ انسانی کو متاثر کیا ہے اس میں واقعتاً کوئی شک نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پورے explosion کا نقطۂ آغاز نیوٹن ہے۔ شخصیات کے انتخاب اور درجہ بندی میں مؤلف نے کوئی مذہبی پہلو مدنظر نہیں رکھا، نہ ہی اپنے عقائد کو پیشِ نظر رکھا ہے، بلکہ اس کا موضوع ہی یہ ہے کہ تاریخِ انسانی کے دھارے کے رُخ کو موڑنے والی کون کون سی شخصیات ہیں۔ ان شخصیات میں نمبر ایک پر محمد رسول اللہ ﷺ نمبر دو پر نیوٹن اور نمبر تین پر حضرت مسیح علیہ السلام ہیں۔ مسلمانوں میں سے اس نے ایک اور شخصیت کو ان سو (۱۰۰) کی فہرست میں شمار کیا ہے اور وہ ہیں ٹھیک پچاسویں نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، بلکہ اس نے خود سوال اٹھایا ہے کہ میں ایک عیسائی ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے محمد (ﷺ) کو میں نمبر ایک پر کس اعتبار سے رکھ رہا ہوں؟ اس کا جواب وہ خود دیتا ہے:

"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others,

but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یہ بہت گمبھیر اور معانی خیز جملہ ہے‘ لیکن اسے سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ اِس وقت کی عالمی فضا میں انسانی زندگی کو دو جداگانہ گوشوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک مذہب کا گوشہ ہے‘ اس کا تعلق اجتماعیات سے نہیں ہے‘ بلکہ صرف افراد سے ہے کہ ہر فرد کو اجازت ہے کہ جس کو چاہے مانے‘ جس پر چاہے یقین رکھے‘ ایک خدا کو مانے‘ سو کو مانے‘ کسی کو نہ مانے‘ فرد کو اس کی پوری آزادی حاصل ہے‘ جسے چاہے پوجے‘ پتھروں کو پوجے‘ درختوں کو پوجے‘ ستاروں کو پوجے‘ چاند کو پوجے‘ یہاں تک کہ اعضاءِ تناسل کو پوجے‘ ٹھیک ہے اسے اجازت ہے۔ لیکن یہ معاملہ انفرادی ہے۔ اس میں مراسمِ عبودیت (rituals) کے علاوہ کچھ سماجی رسومات (social customs) کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچے کی پیدائش ہوئی ہے تو اس کی خوشی کیسے منائیں‘ کوئی فوت ہو گیا ہے تو اس کی میت کو کیسے ٹھکانے لگائیں؟ جلائیں‘ دفن کریں یا کہیں رکھ دیں کہ چیل اور کوے کھا جائیں‘ وغیرہ۔ اس کی بھی ہر شخص کو آزادی ہے۔ لیکن یہ تینوں چیزیں عقیدہ (dogma)‘ مراسم عبودیت (rituals) اور سماجی رسوم (social customs) انفرادی زندگی سے متعلق ہیں — دوسری طرف معاشرتی‘ معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق زندگی کے سیکولر میدان سے سمجھا جاتا ہے جس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پر تو لوگ خود غور کریں گے‘ ان کے نمائندے بیٹھیں گے اور طے کریں گے‘ اور وہ بیٹھ کر اکثریت سے جو طے کر لیں وہی سماجی اقدار فروغ پا جائیں گی۔ جو بھی اکثریت سے طے کر لیں کہ یہ سماجی برائیاں ہیں ان کا وہ قلع قمع کریں گے۔ اگر وہ شراب کی اجازت دینا چاہیں تو دے دیں اور اگر شراب پر پابندی لگانا چاہیں تو پابندی لگا دیں۔ زنا بالجبر کو قابل دست اندازیٔ پولیس جرم قرار دے دیں گے اور اگر زنا بالرضا ہے تو اس میں کوئی جرم والی بات ہی نہیں۔ البتہ اس ضمن میں کسی شوہر کا حق مارا گیا ہو تو وہ جائے اور سول مقدمہ دائر کر دے۔ اسی طرح اگر چاہیں گے تو دو مَردوں کی شادی کو بھی قانونی حیثیت دے دیں

گے کہ ٹھیک ہے ایک شخص ملکی قانون میں شوہر کی حیثیت اور دوسرا شخص بیوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا سماجی، معاشی یا سیاسی معاملات میں سے کسی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ secular field of life ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کا یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں جتنی عظیم شخصیات ہیں وہ اگر ایک پہلو سے بلندی کی حامل ہیں تو دوسری طرف ان کا سرے سے کوئی مقام نہیں، ممکن ہے وہ کسی معاملے میں صفر ہوں، بلکہ شاید ان کے لیے کوئی minus value معین کی جائے۔ مثلاً مشرق میں گوتم بدھ اور مغرب میں حضرت مسیح علیہ السلام، دونوں کی مذہب اور روحانیت کے میدان میں اور پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے کتنی عظمت ہے، لیکن ریاست، سیاست اور معاملاتِ ملکی میں ان کا کوئی مقام اور کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح دوسری طرف اٹیلا ہو، سکندر اعظم ہو یا اور بہت بڑے بڑے حکمران جو دنیا میں گزرے ہیں، یہ سیکولر میدان میں تو بہت بلندی پر ہیں، لیکن مذہبی میدان میں اس درجے پستی کا شکار ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ صفر سے بھی کام نہ چلے بلکہ منفی (minus) ویلیو لانی پڑے۔ سکندر اعظم کے لیے لازماً کوئی نہ کوئی منفی (minus) ویلیو لانی پڑے گی۔ مائیکل ہارٹ کا کہنا یہ ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف اور صرف ایک ہی انسان (The only man) ہے جو دونوں میدانوں میں انتہائی بلندی پر ہے۔

He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.

یعنی اور کوئی ہے ہی نہیں، اس کا تقابل کیا ہوگا؟

یہ میں نے آپ کو صدی کے اُس سرے اور اِس سرے سے دو مثالیں دی ہیں۔ اب ذرا صدی کے درمیان سے بھی مثال دے دوں۔ ایچ جی ویلز (۱۸۶۶ء۔۱۹۴۶ء) برطانوی سائنٹیفک فکشن رائٹر کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے بڑے اچھے اچھے ناول اور کہانیاں لکھیں جن میں اس نے یہ عکاسی کی کہ سائنس کدھر جا رہی ہے۔ سائنس کی جو ایجادات اور جو اکتشافات ابھی ہونے تھے ان کو پہلے سے visualize

کر کے ان پر اس نے اپنی کہانیوں اور ناول کے بنیادی خاکے اور پلاٹس کو مبنی کیا۔ لہٰذا وہ scientific fiction کے اعتبار سے مشہور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے تاریخِ عالَم پر دو کتابیں "A Short History of the World" اور "Concise History of the World" لکھیں۔ مؤخر الذکر کتاب زیادہ ضخیم ہے اور اس میں آنحضور ﷺ پر جو باب ہے اس میں اس نے (میں اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو بتا رہا ہوں کہ) ابتدا میں حضور ﷺ کی ذاتی، نجی و خانگی زندگی پر نہایت رکیک حملے کیے ہیں۔ یوں سمجھئے جیسے دو ملعون نام نہاد مسلمانوں، انگلینڈ میں سلمان رشدی اور بنگلہ دیش میں تسلیمہ نسرین نے، آنحضور ﷺ کی شخصیت پر جس قدر چھینٹے اڑائے ہیں اسی طرح کے چھینٹے H.G.Wells نے حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر خصوصاً خانگی زندگی کے حوالے سے اڑائے ہیں، لیکن جب وہ اس باب کے اخیر میں پہنچتا ہے اور خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر کرتا ہے تو آنحضور ﷺ کی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ آپؐ کے الفاظ نقل کرتا ہے:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) (۲)

((اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ)) (۳)

''لوگو! کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں! اسی طرح کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں! کسی سرخ و سفید رنگ والے شخص کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور اسی طرح کسی سیاہ فام کو کسی سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں! فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے...... تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔''

ان جملوں کا وہ باقاعدہ حوالہ دیتا ہے اور پھر لکھتا ہے:

"Although the sermons of human freedom, fraternity

---

۲) مسند احمد، ح ۲۲۹۷۸۔

۳) سنن الترمذی، ابواب المناقب، باب فی فضل الشام والیمن۔

and equality were said before. We find a lot of these sermons in Jesus of Nazareth, but it must be admitted that it was Mohammad who for the first time in history established a society based on these principles."

''اگرچہ انسانی حریت' مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔''

آپ اندازہ کیجیے کہ یہ دشمن کا خراج تحسین ہے جو کہ معتقد نہیں ہے۔ میں نے اسی لیے جبر کر کے بتایا ہے کہ وہ شخص اتنی بڑی حماقت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' نقل کفر کفر نباشد) محمد جیسے گھٹیا آدمی کے گرد خدیجہ' ابوبکر' عثمان اور عمر جیسے عظیم انسان کیسے جمع ہو گئے!'' حالانکہ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ اس سوال کا جواب تو تمہیں دینا چاہیے۔ درخت تو اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ تم مخمصے میں ہو جبکہ تمہیں حضرت خدیجہ' ابوبکر' عمر' عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی عظمت کا اعتراف و اقرار ہے پھر بھی تمہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی عظیم شخصیتیں محمد (ﷺ) کے گرد کیسے جمع ہو گئیں! آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ کے اندر ذاتی طور پر کتنا عناد' بغض اور دشمنی ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کے اعلان و اعتراف پر مجبور ہے کہ محمد عربی (ﷺ) کے ہاں انسانی حریت و اخوت و مساوات کے صرف وعظ ہی نہیں ملتے بلکہ آپؐ نے ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ قائم کر کے دکھایا۔ سچ ہے کہ ''اَلْفَضْلُ مَا شَہِدَتْ بِہِ الْاَعْدَاءُ'' یعنی اصل فضیلت تو وہ ہے جس کا اعتراف و اقرار دشمن بھی کریں۔ گویا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ظاہر بات ہے جو دوست ہے' عقیدت مند ہے اور محبت کرنے والا ہے' اس کی نگاہ تو محبوب کی کسی خامی کو دیکھ ہی نہیں سکتی' اس کی طرف سے تو گویا وہ نابینا ہو جاتی ہے' جبکہ دشمن میں کوئی خیر اور خوبی نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر کوئی

دشمن کسی کی فضیلت کا اعتراف کرے تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہاں البتہ ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ آنحضور ﷺ کی مدح میں H.G.Wells نے اپنی کتاب میں یہ جملے جو لکھ دیے تھے انہیں کتاب کے موجودہ مرتبین اور نئے ایڈیٹرز نے حذف کر دیا ہے۔ یہ جملے ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر پائے۔ H.G.Wells کو تو فوت ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اب ''Concise History of the World'' کا جو نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے اس میں وہ جملے حذف کر دیے گئے ہیں۔ یہ وہ کڑوی گولی تھی جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اُتر پائی۔ لیکن آپ کو پنجاب پبلک لائبریری یا کسی اور پرانی لائبریری سے یہ پرانے نسخے مل جائیں گے جن میں مذکورہ بالا الفاظ موجود ہیں۔

انقلابِ نبویؐ کا دیگر انقلابات سے تقابل

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی اصل عظمت جس کو ہم بحیثیت انسان سمجھ سکتے ہیں، جس کا لوہا آج پوری دنیا مان رہی ہے اور جس کا انکشاف پورے عالم انسانی پر ہو چکا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے ایک عظیم ترین، گھمبیر ترین، جامع ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب برپا کیا اور یہ انقلاب کم از کم وقت میں برپا کیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ اس انقلابی جدوجہد کی ابتدا سے لے کر اختتام تک جتنے مراحل بھی آئے آنحضور ﷺ نے اس کے ہر ہر مرحلے پر قیادت کی ذمہ داری خود ادا فرمائی۔ اس اعتبار سے تقابل کر لیجیے کہ تاریخِ انسانی کے دو انقلابات بہت مشہور ہیں۔ انقلابِ فرانس یقیناً ایک بہت بڑا انقلاب تھا، دنیا سے بادشاہت کے خاتمے اور جمہوریت کے دور کا آغاز اسی انقلابِ فرانس سے ہوا، جو سوا دو سو برس قبل کی بات ہے۔ انقلابِ روس یعنی بالشویک انقلاب بھی یقیناً ایک عظیم انقلاب تھا، جو ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اگرچہ ستر برس کے اندر اندر اس انقلاب کی موت واقع ہو گئی، لیکن ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!'' وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ وجود میں آیا تھا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ پھیلتے ہوئے روس سے لاطینی امریکہ تک جا پہنچا۔ کتنی عظیم توسیع بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ہوئی ہے۔ لیکن ان دونوں انقلابات کا جائزہ لیں تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) دونوں جزوی انقلاب ہیں۔ انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی ڈھانچہ بدلا' باقی عقائد' رسومات' سماجی نظام' سماجی اقدار' معاشی نظام اور تمام معاشی ادارے اسی طرح قائم رہے۔ سیاسی نظام کے سوا باقی زندگی جوں کی توں رہی۔ دوسری طرف بالشویک انقلاب کے ذریعے معاشی ڈھانچہ بدل گیا' اس میں انفرادی ملکیت ختم ہوگئی' تمام وسائل پیداوار قومی ملکیت میں آ گئے' لیکن مکمل تبدیلی نہیں آئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں جیسے پہلے کرسچین موجود تھے اسی طرح بعد میں بھی رہے' جو عقائد پہلے تھے وہی بعد میں رہے۔ سماجی اقدار بھی وہی رہیں۔ سارا نقشہ جوں کا توں رہا' بس معاشی انقلاب آ گیا۔ اس کو پس منظر میں رکھ کر دیکھئے محمدِ عربی ﷺ کا لایا ہوا انقلاب کس قدر جامع اور گھمبیر ترین تھا۔ یہاں آپ خوردبین لگا کر دیکھ لیجیے' کیا کوئی ایسی چیز ہے جو سابقہ حالت میں باقی رہ گئی ہو؟ جواب نفی میں ملے گا۔ عقائد و نظریات بدل گئے' شخصیتیں بدل گئیں' اخلاق بدل گئے' ان کے شب و روز کے انداز بدل گئے' صبح و شام بدل گئے' نشست و برخاست کے انداز بدل گئے۔ پھر یہ کہ سماجی نظام' سیاسی نظام اور معاشی نظام بدل گیا۔ وہ قوم جس میں پڑھے لکھے لوگ بمشکل انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے وہ علوم کے موجد ہو گئے' دنیا کے استاد بن گئے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے علوم ہند و یونان سے لیے اور انہیں ترقی دے کر پورے عالم میں پھیلا دیا۔ آپؐ کا انقلاب ہمہ گیر ترین' جامع ترین اور عظیم ترین انقلاب تھا۔ انقلابِ محمدیؐ کے مقابلے میں انقلابِ روس اور انقلابِ فرانس کی کیا حیثیت ہے؟ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

(۲) فرانس اور روس کے انقلابات بلکہ دنیا کے دوسرے تمام انقلابات کے اندر یہ چیز قدرِ مشترک ہے کہ فکر دینے والے اور دعوت کا آغاز کرنے والے کچھ اور لوگ تھے' لیکن وہ صرف قلم کار اور مصنفین تھے' وہ مردِ میدان نہیں تھے' چنانچہ وہ انقلاب کی عملی جِدّوجُہد میں سامنے نہیں آئے۔ نہ انہوں نے خود آگے بڑھ کر کوئی انقلابی جماعت بنائی اور نہ آگے بڑھ کر انقلابی جدوجہد کی قیادت کی۔ وہ تو صرف people of the desk تھے۔ انقلاب کچھ اور لوگوں کے زیرِ قیادت و زیرِ راہنمائی وجود میں آیا' کیونکہ انقلابی فکر

فراہم کرنے والے میدان کے آدمی تھے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ فرانس بڑا خونی انقلاب کہلاتا ہے‘ کیونکہ قیادت کوئی نہیں تھی‘ وہ تو ایک فکر تھا جو پھیل گیا اور اس نے لوگوں میں جوش و خروش پیدا کر دیا‘ اور پھر اچانک وہ لاوا پھٹ پڑا۔ چونکہ کوئی تنظیم نہیں تھی اور کوئی قیادت نہیں تھی لہٰذا انتہائی خونی انقلاب آیا۔ روس میں بالشویک انقلاب کی بنیاد ’’Das Capital‘‘ نامی کتاب بنی‘ جو کارل مارکس اور اینجلز نے مشترکہ طور پر لکھی۔ اندازہ کیجیے کہ یہ کتاب کتنے ٹھوس دلائل پر مبنی ہوگی کہ اس نے کس طرح انسانی ذہن کو اپنی گرفت میں لیا اور کس طرح ساری تعبیرات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کتاب میں پوری حیاتِ انسانی کی خالصتاً مادی تعبیر کی گئی ہے اور مذہب و روحانیات کی بالکل نفی کی گئی ہے‘ لیکن اس کتاب کے دلائل نے لوگوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لے کر انہیں متحرک کیا کہ لوگ جانیں تک دینے کو تیار ہو گئے اور انقلاب برپا کر دیا۔ اقبال نے یونہی نہیں کہا کہ ؏

’’نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب!‘‘

تو واقعتاً اس ایک کتاب نے یہ بالشویک انقلاب برپا کیا ہے‘ جس کے مصنف مارکس اور اینجلز تھے۔ ان دونوں نے اپنی یہ کتاب جرمنی اور لندن میں بیٹھ کر لکھی‘ لیکن جرمنی اور لندن میں کوئی انقلاب واقع نہیں ہوا۔ پھر یہ دونوں مصنف اپنی زندگی میں اپنی قیادت اور سرکردگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب برپا نہیں کر سکے۔ انقلاب تو وہاں سے ہزاروں میل دور بالشویک پارٹی کے ذریعے روس میں آیا۔ اور جس طرح انقلابِ ایران سے پہلے خمینی صاحب فرانس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور انہوں نے عین وقت پر آ کر ایران میں ہونے والے ہنگاموں کی قیادت سنبھال لی‘ اسی طرح عین وقت پر لینن نے آ کر اس تحریک کو ہائی جیک کیا اور انقلاب برپا کر دیا۔

اس تناظر میں دیکھئے کہ محمد عربی ﷺ نے ایک فردِ واحد کی حیثیت سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ آپ ﷺ ہی فکر دینے والے تھے‘ آپؐ ہی دعوت دینے والے تھے‘ آپؐ ہی مکہ کی گلیوں میں گھوم پھر کر تبلیغ کر رہے تھے: (یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

تُفْلِحُوْا))(٤) ''اے لوگو! کہہ دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' کوئی الٰہ نہیں' کامیاب ہو جاؤ گے''۔ آپؐ ہی ہیں جو کبھی اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے ان کے سامنے دعوت پیش کر رہے ہیں اور کبھی کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارتے ہوئے لوگوں کو جمع کرتے ہیں اور دعوت پیش کرتے ہیں۔ آپؐ ایک فردِ واحد اور داعی کی حیثیت سے سامنے آئے اور کل بائیس برس میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب کی تکمیل کر دی اور ہر ہر مرحلے پر اس کی قیادت خود فرمائی۔ وہی گلیوں میں تبلیغ کرنے والے غزوۂ بدر میں کمانڈر ہیں' غزوۂ احد میں وہی سپہ سالار ہیں۔ جیسے کہ میں نے مائیکل ہارٹ کی کتاب کا حوالہ دیا ہے' یہ نقشہ دنیا نے کبھی دیکھا ہی نہیں' اس کی کوئی نظیر یا مثال ہی نہیں۔ کیونکہ گلی کوچوں میں تبلیغ کرنے والے تو یہی کام کرتے رہ جاتے ہیں۔ مربی اور مزکی کا اپنا ایک دائرہ ہوتا ہے' جو ان کے پاس چل کر آئیں' ان کی خانقاہ میں طالب بن کر آئیں تو ان کا کچھ تزکیہ کر دیں گے' کچھ اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن یہ منظر چشمِ فلک نے ایک ہی بار دیکھا ہے کہ ایک فردِ واحد فکر دے رہا ہے' وہی دعوت دے رہا ہے اور اس مرحلے میں بظاہر کیسی کیسی ناکامیاں سامنے آتی ہیں۔

جب پہلی مرتبہ حکم ہوا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾﴾ (الشعراء) ''(اے نبی ﷺ!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجیے''۔ تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو کہ آپؐ کے زیر کفالت اور زیر تربیت تھے اور گھریلو سامان لانا اور اس کا بندوبست کرنا انہی کے ذمہ تھا' حکم دیا کہ ایک دعوتِ طعام کا انتظام کرو اور تمام بنو ہاشم کو بلاؤ۔ چنانچہ دعوت کا اہتمام ہوا اور تمام بنی ہاشم جمع ہو گئے۔ جب لوگوں نے کھانا کھا لیا تو اب حضور ﷺ بات کرنے کے لیے کھڑے ہوئے' لیکن کچھ لوگوں نے ہوٹنگ کی' کچھ نے فقرے چست کیے اور کچھ نے شور مچایا اور سارا مجمع چلا گیا۔ حضور ﷺ اپنی بات کہہ بھی نہ سکے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ادھر آپؐ نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور ادھر کامیابیوں نے قدم چومنے شروع کر دیے ہوں۔ آنحضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے اس اہم نکتے کو نوٹ

---

٤) مسند احمد' ح ١٥٥٩٣ و ١٦١٦٨ و ١٨٥٢٥ و ٢٢٦٤٠ و ٢٢٦٨١۔

کر لیجیے کہ یہ جدوجہد خالص انسانی سطح پر ہوئی اور اس میں وہ سارے مراحل آئے جو کسی بھی انسانی جدوجہد میں آتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی طور پر ناکامیاں اور مایوسیاں بھی آئیں' بے پناہ محنت اور مشقت کا نتیجہ مرئی طور پر صفر دکھائی دیتا تھا۔

لیکن حضور ﷺ نے چند دن کا وقفہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوبارہ فرمایا کہ پھر دعوت کا اہتمام کرو۔ میں کہا کرتا ہوں کہ شاید لوگوں کو شرم آ گئی ہو۔ آخر اتنی شرافت تو ان لوگوں کے اندر بھی تھی کہ دو دفعہ ان کے دسترخوان پر کھانا کھا لیا ہے' اب آخر ان کا حق بن گیا ہے کہ ان کی بات سن لیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے دعوت پیش کی۔ آپؐ نے نہایت عظیم' مختصر مگر جامع اور نہایت مؤثر خطبہ پیش کیا۔ بہرحال لوگوں نے سن لیا اور پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا کہ کوئی نہیں بولا۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ اگرچہ میں سب سے کم عمر ہوں' اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں' اگرچہ میری آنکھیں دکھتی ہیں' لیکن میں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آشوبِ چشم کا عارضہ بچپن ہی سے تھا' معلوم ہوتا ہے کہ ککروں کا مرض تھا جو بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے۔ مختلف جنگوں کے مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھ دکھتی تو حضور ﷺ اپنا لعابِ دہن لگا دیتے جس سے انہیں کچھ سکون حاصل ہوتا اور پھر وہ جنگ میں حصہ لے سکتے۔) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات سن کر پورا مجمع کھلکھلا کر ہنس پڑا کہ یہ دنیا کی تقدیر بدلنے چلے ہیں اور یہ ہیں ان کے ساتھی! ذرا غور کیجیے کہ یہاں سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس کے بعد حکم آتا ہے: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر:۹۴) ''(اے نبی ﷺ!) ڈنکے کی چوٹ کہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے''۔ شروع میں تین سال تک حضور اکرم ﷺ نے انفرادی طور پر ذاتی رابطے کے ذریعے دعوت کو پھیلایا۔ تاہم یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ حضور ﷺ کی ذاتی زندگی میں خفیہ دعوت کا کوئی دور نہیں آیا' آپؐ نے کوئی بات خفیہ طور پر نہیں کی' آپؐ کی کوئی زیر زمین سرگرمیاں نہیں تھیں۔ البتہ low profile میں ذاتی رابطوں کے ذریعے یہ بات پھیلائی۔ لیکن اب حکم آ گیا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ یعنی ''(اے محمد ﷺ!) اب ڈنکے کی چوٹ کہو جس کا تمہیں حکم دیا

جا رہا ہے'' تو آپؐ کوہِ صفا پر چڑھے۔ اب تو کوہِ صفا کی بس علامت باقی رہ گئی ہے۔ حضورﷺ کے زمانے میں وہ باقاعدہ پہاڑی تھی' ایسی پہاڑی کہ جس کے پیچھے کوئی لشکر بھی چھپ سکتا تھا۔ کوہِ صفا پر چڑھ کر آنحضورﷺ نے عرب کے مروّجہ دستور کے مطابق قوم کو ندا دی۔ یہیں سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دعوت و ابلاغ کے لیے اپنے زمانے میں جو بھی مروّجہ طریقے ہوں ان سب کو اختیار کیا جانا چاہیے۔ البتہ اگر حیا اور شرافت کے منافی کوئی شے ہو تو اس سے احتراز کیا جائے۔ اُس دور میں غارت گری اور لوٹ مار کے لیے قبائل ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ یہ حملہ عام طور پر رات کو ہوتا' بلکہ رات کے بھی پچھلے پہر (small hours of the morning) میں' یعنی رات کے دو' تین' چار بجے' جبکہ نیند کا انتہائی غلبہ ہوتا ہے۔ اُس وقت سوئے ہوؤں پر آکر ٹوٹ پڑنا اور قتل و غارت گری اور لوٹ مار کر کے بھاگ جانا' یہ ان کا ایک عام رواج تھا۔ لہٰذا کسی قبیلے کے کسی فرد کو اگر یہ اطلاع مل جاتی کہ کوئی قبیلہ ان پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو وہ بلند مقام پر چڑھ کر کپڑے اتار کر مادر زاد برہنہ ہو کر نعرہ لگاتا تھا: ''وَاصَبَاحَا'' (ہائے وہ صبح جو آیا چاہتی ہے) یعنی جس میں غارت گری' لوٹ مار اور کشت و خون ہوگا۔ اب اس میں دونوں صورتیں یعنی سمعی اور بصری جمع ہو جاتیں۔ اس لیے کہ جہاں تک تو اس کی آواز جا رہی ہوتی وہاں تک لوگ اس کی آواز کو سنتے اور دوڑے چلے آتے اور جہاں اس کی آواز نہیں جا رہی ہوتی تو وہ کھڑا ہوا عریاں نظر آتا۔ اسی لیے اسے ''نذیر عریاں'' کہا جاتا تھا' یعنی وہ خبردار کرنے والا' متنبہ کرنے والا جو بالکل ننگا ہو گیا ہو۔ حضورﷺ نے بھی قوم کو آگاہ کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا اور کوہِ صفا پر چڑھ گئے۔ آپؐ نے اس طریقے میں صرف یہ کمی کی کہ آپؐ نے کپڑے نہیں اتارے' کیونکہ ظاہر ہے یہ حیا و فطرت کے خلاف ہے اور آپؐ کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا' لیکن نعرہ وہی لگایا: ''وَاصَبَاحَا!''

اب لوگ آکر جمع ہو گئے اور انہوں نے آپؐ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ آپؐ اونچائی پر کھڑے تھے' آپؐ نے قوم کو اپنی دعوت پیش کی۔ اس پر آپؐ کا چچا ابولہب کہنے

لگا: ”تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟“ ”تمہارے لیے ہلاکت و بربادی ہو‘ کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا ہے؟“ ہم تو سمجھے تھے کہ تم واقعتاً کوئی خبر دینے والے ہو‘ کوئی بات بتانے والے ہو۔ نوٹ کیجیے کہ حضور ﷺ نے پہلے فرمایا: لوگو! میں اگر تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات مانو گے یا نہیں؟ یعنی وہ پہاڑی اتنی بڑی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی لشکر چھپ سکتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ضرور! اس لیے کہ آپؐ پہاڑ کی بلندی پر کھڑے ہیں اور پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں‘ آپؐ تو الصادق اور الامین ہیں۔ آپؐ نے لوگوں سے پہلے یہ گواہی لے کر بات کی ہے کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں‘ آخرت کے محاسبے سے خبردار کرتا ہوں۔ جس پر آپؐ کے چچا نے کہا تھا: ”تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟“ اس پر پھر یہ سورۃ نازل ہوئی: (۵)

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤﴾ (اللھب)

یہ میں نے آنحضور ﷺ کی دعوت کے دو مناظر آپ کو دکھائے ہیں‘ اندازہ کیجیے کہ دل کو توڑ دینے والا آغاز ہے‘ انسان کے لیے کس قدر ہمت شکن اور صبر آزما ہے یہ معاملہ جس سے کہ آغاز ہوا ہے۔

دس برس کی محنتِ شاقّہ کا حاصل

الغرض رسول اللہ ﷺ کی پورے دس برس کی محنت و مشقت کو ذہن میں رکھئے کہ آپ جیسا مبلّغ‘ آپؐ جیسا مربّی‘ مزکّی اور معلّم نہ پہلے پیدا ہوا نہ کبھی ہو سکتا ہے‘ کیونکہ حضور ﷺ کی نظیر محالِ مطلق ہے۔ آپؐ کی نظیر کوئی ہوئی ہے نہ ہو گی۔ لیکن مکہ میں آپؐ کی

---

۵) صحیح البخاری‘ کتاب تفسیر القرآن‘ باب وانذر عشیرتک الاقربین وباب قولہ ان ھو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید‘ وباب قولہ سیصلی نارًا ذات لھب۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب فی قولہ وانذر عشیرتک الاقربین۔

دس برس کی شب و روز کی محنت شاقہ کا تصور کیجیے‘ جس میں دن کی مشقت کا یہ عالم ہے کہ ﴿اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ⑦﴾ (المزمل) آپؐ دن کے اوقات میں گھوم رہے ہیں‘ گلی کوچوں میں تبلیغ کر رہے ہیں‘ گھر گھر جا کر دستک دے رہے ہیں اور رات کی یہ کیفیت ہے کہ ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ② نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ③ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ④﴾ (المزمل) آپؐ دن میں لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں تو رات کو کھڑے ہو کر جھولی پھیلا کر اللہ سے دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے۔ لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دس برس تک شب و روز کی محنت شاقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو‘ سوا سو یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو افراد آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ ۶۱۰ عیسوی میں وحی کا آغاز ہوا تو لگ بھگ ۶۲۰ عیسوی کو حضور ﷺ نے عام الحزن یعنی غم کا سال قرار دیا۔ کیونکہ اسی سال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں دلجوئی کرنے والی ایک وفادار‘ وفا شعار اور محبت کرنے والی زوجہ محترمہ تھیں‘ جن کا انتقال ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ باہر سے آدمی تکدر لے کر آتا ہے تو مونس و غم خوار شریکِ حیات اسے زائل کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ کوئی پاگل کہہ دیتا‘ کسی نے مجنون تو کسی نے شاعر کہہ دیا‘ کسی نے کہا کہ انہوں نے ایک عجمی غلام کو اپنے گھر کے اندر بند کر رکھا ہے جو بڑا عالم فاضل ہے‘ تورات اور انجیل کا جاننے والا ہے‘ یہ اس سے ڈکٹیشن لیتے ہیں‘ اسے یاد کر کے پھر ہم پر آ کر دھونس جماتے ہیں۔ حضور ﷺ سب کچھ سنتے تھے۔ قرآن مجید میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا قلب انتہائی حساس تھا‘ اور یہ باتیں سن کر آپؐ کو رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ ⑨⑦﴾ (الحجر) یعنی ”اے نبیؐ! ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے۔“ آپ کو تکدر‘ غم‘ رنج اور افسوس ہوتا ہے کہ یہی تو وہ لوگ تھے جو کبھی میری راہ میں اپنی آنکھیں بچھاتے تھے‘ یہی لوگ مجھے الصادق اور الامین کا خطاب دیتے تھے‘ یہ مجھ سے انتہائی محبت کرنے والے لوگ تھے‘ لیکن انہی میں سے آج کوئی مجنون کہہ رہا ہے‘ کوئی

پاگل کہہ رہا ہے' کوئی شاعر' کوئی ساحر' کوئی مسحور اور کوئی کذاب کہہ رہا ہے (نقل کفر کفر نباشد) یہ سب کچھ سن کر آپ ﷺ گھر آتے تھے تو گھر پر کوئی تسلی دینے والی تھی' لیکن اب وہ نہیں رہی تھی۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ واقعات بڑے اہم ہیں۔ جب پہلی وحی آئی تو حضور ﷺ پر ایک دہشت اور گھبراہٹ کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ آپ ﷺ کی زندگی میں یہ عالم بشریت کا پہلا معاملہ تھا جو عالم ملکیت کے ساتھ ہوا تھا۔ غارِ حرا میں جبرائیل علیہ السلام سے پہلی ملاقات ہوئی تھی' اس سے آپ ﷺ پر طبعاً گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ آپ گھر آئے تو کانپ رہے تھے' پھر بخار ہوا اور اس میں آپ نے فرمایا کہ ''خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ'' یعنی مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ ایسے میں وہی غم خوار اور ہمت بندھانے والی زوجہ محترمہ تھیں جنہوں نے کہا کہ ''اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا' آپ فکر مت کیجیے۔ آپ یتیموں کی سرپرستی کرتے ہیں' بیواؤں کی خبر گیری کرتے ہیں' آپ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں' غریبوں کی خدمت کرتے ہیں' اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔''

آنحضور ﷺ کی پچیس برس تک کی زندگی بڑی محنت و مشقت اور افلاس میں گزری ہے۔ عین بچپن میں آپ بھیڑ بکریاں چراتے رہے۔ حضور ﷺ کے اپنے الفاظ ہیں کہ میں چند ٹکوں کے معاوضے میں (عَلٰى قَرَارِيْطَ) اہل مکہ کی بھیڑ بکریاں چراتا رہا۔[٦] اس لیے کہ ابوطالب بہت ہی مفلس انسان تھے۔ حضور ﷺ کی سرپرستی تو وہ کر رہے تھے — لیکن واقعہ یہ ہے کہ خاندانِ ابوطالب کی پرورش رسول اللہ ﷺ نے اپنی محنت و مشقت اور مزدوری سے کی ہے۔ پھر آپ نے ملازمت کی شکل میں تجارت شروع کی۔ یہ مشقت اور افلاس کے دن تھے' جن کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝﴾ (الضحٰی) ''اللہ نے آپ کو تنگ دست پایا تو آپ کو غنی کر دیا''۔ اللہ نے آپ کو غنی کس طرح سے کیا؟ پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی شادی ہوئی جو عرب کی متمول ترین خاتون تھیں۔ یہ شادی حضرت

---

٦) صحیح البخاری' کتاب الاجارۃ' باب رعی الغنم علی قراریط۔

خدیجہ ؓ کی اپنی فرمائش پر ہوئی۔ آپؓ انتہائی محبت کرنے والی شریکۂ حیات تھیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جو حضور ﷺ کے پچیس سال سے لے کر پچاس سال کی عمر کے درمیان کہیں پیش آیا کہ حضور ﷺ ایک دفعہ مکہ مکرمہ سے باہر نکل گئے۔ مکہ کے باہر پہاڑوں کے درمیان مختلف وادیاں ہیں' ایک وادی میں آپؐ نے دیکھا کہ کوئی قبیلہ آ کر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جو انتہائی مفلوک الحال ہے' جن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے' تن پر کپڑے نہیں ہیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ گھر آئے اور انتہائی ملول اور غمگین ہو کر چادر لے کر لیٹ گئے۔ اب حضرت خدیجہ ؓ نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں فلاں وادی میں گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک قبیلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جس کا حال یہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے پاس دولت نہیں ہے کہ میں ان کی مدد کروں۔ کیونکہ سرمایہ تو حضرت خدیجہ ؓ کا تھا' آپ ﷺ کی اپنی ذاتی دولت تو نہیں تھی۔ اس پر حضرت خدیجہ ؓ نے فرمایا کہ آپؐ جایئے اور قریش کے بڑے بڑے سرداروں کو بلا لایئے۔ حضور ﷺ انہیں بلا کر لائے تو اتنی دیر میں حضرت خدیجہ ؓ نے اشرفیوں کا اتنا بڑا ڈھیر لگا دیا کہ جب حضور ﷺ آ کر بیٹھے تو اس کے پیچھے چھپ گئے۔ حضرت خدیجہ ؓ نے سردارانِ قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ سب گواہ رہیں' میں نے یہ ساری دولت محمد ﷺ کے حوالے کر دی ہے' وہ جیسے چاہیں اسے خرچ کریں۔ حضرت خدیجہؓ ایسی بیوی تھیں' انہوں نے ہر طرح سے آپؐ کا ساتھ دیا۔ حضرت خدیجہ ؓ کا کیا مقام تھا' ہم میں سے اکثر اس سے واقف نہیں۔

ہمارے ہاں تو بعض محترم شخصیات کے مابین افضلیت کا جھگڑا ہے ع

اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش!

اہلِ سنت کے نزدیک حضرت ابوبکر ؓ کی افضلیت اور اہلِ تشیع کے نزدیک حضرت علی ؓ کی افضلیت مسلمہ ہے اور دونوں اسی میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ ؓ اور حضرت فاطمہ ؓ کی افضلیت کا جھگڑا ہے۔ ایک گروہ حضرت عائشہ ؓ کو اور دوسرا گروہ حضرت فاطمہ ؓ کو بہت زیادہ بلند کرتا ہے' لیکن حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کا

ذکر اوّل تو کہیں ملتا نہیں' اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو بہت کم۔ چند سال پہلے جب میں ایران گیا تھا تو وہاں کے مشاہدات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے وہاں خواتین یونیورسٹی قائم کی ہے جس کا نام ''جامعۃ الزہراء'' رکھا ہے۔ انہوں نے اس یونیورسٹی کا نام حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نام پر رکھا ہے۔ اس یونیورسٹی کے چوٹی کے سٹاف اور انتظامیہ سے جب ایک ملاقات میں مَیں نے کہا کہ کاش کہ آپ نے اس کا نام جامعہ خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) رکھا ہوتا تو وہ چونکے۔ میں نے کہا کہ دیکھئے' اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مابین یہ تفریق ہے کہ جب بھی کوئی سُنّی بچیوں کا مدرسہ بنائے گا تو اس کا نام ''مدرسہ العائشہ للبنات'' رکھے گا' جبکہ شیعہ حضرت فاطمہؓ کے نام پر مدرسہ بنائے گا' لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو صدیقۃ الکبریٰ ہیں' ان کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح صدیق اکبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اسی طرح الصدیقۃ الکبریٰ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ حضرت مریم سلام علیہا کے بارے میں قرآن حکیم میں ''صِدِّیقہ'' کا لفظ آیا ہے: ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾۔ اس اُمت کی صدیقۃ الکبریٰ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ مزید بیان کرتا چلوں۔ آغازِ وحی کے بعد جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ بشریت اور عالمِ ملکیت کے درمیان اتصال کا نیا تجربہ ہوا تھا اور جس کی وجہ سے آپؐ پر خوف کی سی کیفیت تھی اور ایک تشویش کا سا انداز تھا تو ایک روز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اب جب وہ فرشتہ یا بدروح جو بھی ہے' آپؐ کے پاس آئے تو مجھے بتایئے گا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ آ گئے ہیں۔ اب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بال کھول لیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا کہ کیا اب بھی وہ نظر آ رہا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! اس پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا یقیناً یہ بدروح نہیں ہے' فرشتہ ہے' جس نے حیا کی ہے' اگر کوئی بدروح ہوتی تو وہ لذت لیتی اور غائب نہ ہوتی۔ اب آپ ان کی عظمتِ فکر' سوچ اور شعور کی بلندی کا اندازہ کیجیے۔

بہر حال سال ۱۰ نبوی میں حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال ابوطالب بھی

انتقال فرما گئے۔ اس طرح قبائلی زندگی میں حضور ﷺ کو جو ایک تحفظ حاصل تھا وہ ختم ہو گیا۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے اوس' خزرج اور مہاجرین کے درمیان پہلا معاہدہ کرایا تھا تو اس میں یہ شق بھی شامل تھی کہ اگر کوئی ایک مسلمان بھی کسی کو پناہ دے دے گا تو وہ سب کی طرف سے شمار ہو گی۔ یہی معاملہ قبائل کا ہوتا تھا کہ اگر کوئی ایک شخص کسی کو پناہ دے دیتا تھا تو وہ پورے قبیلے کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس حوالے سے خاندان بنوہاشم کی سرداری ابوطالب کے پاس تھی جو کہ آپ کو تحفظ دے رہے تھے۔ اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن ان کو آپ سے طبعی محبت تھی اور اس طبعی محبت کی بنیاد پر انہوں نے حضور ﷺ پر خاندان بنوہاشم کا سایہ کیا ہوا تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اگر دوسرے قبیلے اور ان کے سردار حضور ﷺ کے خلاف کوئی اقدام کرتے تو یہ گویا بنوہاشم کے خلاف اعلانِ جنگ ہو جاتا اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ دس برس تک کسی کو حضور ﷺ پر اقدام کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ ابوطالب کے پاس سفارتیں لاتے رہے اور لالچ پیش کیا کہ آپ ان سے کہیے کہ اگر انہیں دولت چاہیے تو ہم سیم وزر کے انبار لگا دیتے ہیں' انہیں کوئی سیادت چاہیے تو انہیں ہم اپنا بادشاہ ماننے کو تیار ہیں' اگرچہ ہمارا مزاج ایسا نہیں ہے کہ ہم کسی کو بادشاہ مانیں' لیکن ان کو مان لیں گے' اور اگر کہیں شادی کرنا چاہیں تو اشارہ کر دیں' قریش کے جس بڑے سے بڑے گھرانے میں کہیں گے شادی کر دیں گے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ چچا جان! چاہے یہ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنی اس دعوت سے باز نہیں آؤں گا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ دعوتِ توحید سے باز آ جائیں' ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں۔

جب جناب ابوطالب بسترِ مرگ پر تھے اس وقت قریش کی جانب سے آخری سفارت آئی اور انہوں نے آخری چیلنج کیا کہ اے ابوطالب! اب بھی اگر تم اپنے بھتیجے کی پشت پناہی سے باز نہیں آتے تو ٹھیک ہے' ہمارا الٹی میٹم ہے کہ میدان میں آ کر مقابلہ کر لو یا اپنے بھتیجے کو روک لو۔ اس پر ابوطالب نے حضور ﷺ کو بلایا اور کہا: ''بھتیجے! مجھ پر اتنا

بوجھ نہ ڈال جو میں برداشت نہ کرسکوں''۔ ظاہر بات ہے کہ اکیلا خاندانِ بنو ہاشم پورے قبیلہ قریش کا مقابلہ کیسے کرسکتا تھا؟ پھر خود ابوطالب نہایت ضعیف ہو گئے تھے اور تقریباً بسترِ مرگ پر تھے۔ ابوطالب کی اس بات پر حضور ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ دنیا میں اسبابِ عالم کے اعتبار سے ایک ہی سہارا تھا وہ بھی آج جواب دے رہا ہے۔ تاہم آپؐ نے کہا: اب یا تو یہ بات پوری ہو کر رہے گی یا میں اپنے آپ کو اسی میں ہلاک کر دوں گا' میرے لیے پسپائی (retreat) کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بہرحال عام الحزن کے سال میں ابوطالب کا بھی انتقال ہو گیا اور بنو ہاشم کا سردار ابولہب بن گیا جو خود انتہائی زہریلا دشمن تھا اور جس نے آغازِ دعوت پر ہی حضور ﷺ سے کہہ دیا تھا کہ "تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟'' یہ وہ بدبخت شخص تھا جس نے اپنے دونوں بیٹوں سے حضور ﷺ کی دونوں صاحبزادیوں کو طلاق دلوائی۔ آنحضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں کی نسبت ابولہب کے دو بیٹوں کے ساتھ طے تھی۔ اور وہاں تو نسبت کا طے ہو جانا ایک طرح سے نکاح ہی ہوتا تھا۔ ابولہب کے اکسانے پر ان دونوں نے نہایت گستاخانہ اور توہین آمیز انداز میں آ کر حضور ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم تمہاری دونوں بیٹیوں کو طلاق دیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے یہ سارے صدمے جھیلے ہیں۔

یومِ طائف۔ حیاتِ طیبہ کا شدید ترین دن

ابوطالب کی وفات سے چونکہ حضور ﷺ کو حاصل وہ ظاہری تحفظ ختم ہو گیا تھا اور اب اندیشہ تھا کہ قریش دار الندوہ میں جو چاہیں گے فیصلہ کریں گے' لہٰذا آپؐ نے طائف کا سفر اختیار فرمایا۔ یہ حضور ﷺ کی مکی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپؐ کا شعب بنی ہاشم کے اندر گھیراؤ اور مقاطعہ رہا اور کھانے پینے کی چیزیں روک گئیں۔ اس دوران پورے خاندانِ بنو ہاشم کو بدترین قسم کی فاقہ کشی جھیلنی پڑی' حالانکہ وہ سب کے سب ایمان تو نہیں لائے تھے' لیکن اس جرم کی پاداش میں کہ بنو ہاشم محمد ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑ رہے' اس پورے خاندان کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا' جس کے نتیجے میں خاندان بنی ہاشم تین سال تک شعب بنی ہاشم (جسے شعب ابی طالب بھی کہتے

ہیں) میں محصور رہا۔ ان تین سالوں کے دوران کھانے پینے کی کوئی چیز اُن تک نہیں جانے دی گئی۔ وادی کے دونوں اطراف میں پہرے لگا دیے گئے‘ چنانچہ کوئی وہاں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ حکیم بن حزام جیسا کوئی اللہ کا بندہ جو بنیادی طور پر نیک شخصیت تھی‘ وہ کہیں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اور دوسری طرف نیچے اتر کر کوئی چیز پہنچا دیتے‘ کیونکہ وہ حضرت خدیجہؓ کے بہت قریبی عزیز تھے‘ ورنہ تو وادی کے دونوں سروں پر پہرے تھے۔ وہ وقت بھی آیا کہ بنو ہاشم کے پھول جیسے بچے بلک رہے ہیں اور ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں‘ سوائے اس کے کہ سوکھے ہوئے چمڑے ابال کر پانی ان کے حلق میں ٹپکایا گیا۔

لیکن حضورﷺ کے لیے ذاتی طور پر جو سخت ترین مرحلہ آیا وہ یومِ طائف تھا جس کی گواہی حضورﷺ کے اپنے قول میں موجود ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورﷺ سے پوچھا کہ کیا آپؐ پر یومِ اُحد سے بھی کوئی زیادہ سخت دن گزرا؟ ظاہر بات ہے کہ ان کے ہوش میں یومِ اُحد کے دوران حضورﷺ زخمی ہوئے‘ آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے‘ خون کا فوارہ چھوٹا‘ آپؐ پر بے ہوشی طاری ہوئی‘ آپؐ کی زبانِ مبارک سے ایک بددعا بھی نکل گئی کہ ((کَیْفَ یُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِیِّهِمْ بِالدَّمِ))(۷) ’’وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگین کر دیا۔‘‘ پھر یہ کہ ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے جن میں اَسَدُ اللّٰہِ وَاَسَدُ رَسُوْلِہٖ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے‘ جو آپؐ کے چچا زاد‘ خالہ زاد‘ دودھ شریک بھائی اور ساتھ میں کھیلے ہوئے ہمجولی بھی تھے۔ ان کی لاش آپؐ کے سامنے آئی تو دیکھا کہ ناک‘ کان‘ کٹے ہوئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبایا گیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک سخت ترین دن یوم اُحد تھا۔ لیکن حضورﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر سخت ترین دن یومِ طائف تھا۔

آپؐ مکہ سے مایوس ہو کر طائف گئے۔ اور نوٹ کیجیے کہ یہ واحد موقع ہے جہاں نظر آتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی حضورﷺ کے ساتھ نہیں ہیں‘ ورنہ وہ تو سائے کی طرح ساتھ رہنے والی شخصیت تھی۔ اس موقع پر صرف آپؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

---

۷) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الفتن‘ باب الصبر علی البلاء۔ ومسند احمد‘ ح ۱۲۷۲۵۔

آپؐ کے ساتھ تھے' جو مُنہ بولے بیٹے بھی قرار دے دیے گئے تھے۔ مکہ سے طائف کے لیے دو راستے ہیں' ایک طریق الجبل کہلاتا ہے اور دوسرا طریق السھل۔ پہاڑی راستہ انتہائی دشوار گزار تھا۔ آج بھی آپ وہاں جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کیسے پہاڑوں کو کاٹ کر سڑک بنائی ہوگی۔ آپؐ نے عام راستہ سے گریز کرتے ہوئے دشوار گزار پہاڑی راستہ اختیار فرمایا۔ اس لیے کہ عام راستے پر تو خطرہ ہوسکتا تھا کہ کہیں حملہ نہ ہو جائے۔ غالباً' دار الندوہ میں حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

طائف جا کر آپ ﷺ نے وہاں کے تین سرداروں کے سامنے اس اُمید پر اپنی دعوت پیش کی کہ ان میں سے کوئی ایک بھی دعوت قبول کر لے اور ایمان لے آئے تو میں یہاں منتقل ہو جاؤں اور یہ میرا دار الہجرت بن جائے۔ لیکن حکمتِ خداوندی اور مشیتِ الٰہی میں یہ شرف یثرب کے لیے طے تھا' طائف کے مقدر میں نہ تھا۔ حضور ﷺ اپنی سوچ بچار کے حوالے سے طائف پہنچے۔ تینوں سرداروں نے کلیجے سے پار ہونے والے جواب دیے۔ ایک نے کہا یہاں سے فوراً روانہ ہو جاؤ' اگر تم واقعی رسول ہو اور میں نے کوئی توہین کر دی تو میں مارا جاؤں گا' اور اگر تم جھوٹے ہو تو جھوٹے کو میں منہ نہیں لگانا چاہتا۔ دوسرے نے کہا مکہ اور طائف میں تمہارے سوا اللہ کو رسول بنانے کے لیے کوئی اور نہیں ملا تھا؟ قرآن حکیم میں ان کے یہ دل آزار الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ﴿وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾﴾ (الزخرف) یعنی ان دو بستیوں میں کوئی شخص بڑی عظمت والا ہوتا' اس کی جائیداد مکہ میں بھی ہوتی اور طائف میں بھی' ایسا شخص اللہ کو نبی بنانے کے لیے نہیں ملا تھا؟ تم جیسا مفلوک الحال یتیم شخص جس کا اپنا کوئی ذاتی سرمایہ ہی نہیں تھا' کوئی سرمایہ تھا بھی تو وہ بیوی کا تھا' یہ شخص اللہ نے چنا ہے؟ بہر حال آپؐ ان سے مایوس ہو کر واپس روانہ ہونے لگے تو ان بدبختوں نے گلیوں کے آوارہ چھوکروں کو اشارہ کر دیا کہ ذرا ان کی خبر لو۔ چنانچہ انہوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے اس پتھراؤ کے آگے ڈھال بن جانے کی پوری کوشش کی' لیکن زید بن حارثہؓ اگر سامنے سے آ کر حضور ﷺ کے آگے ڈھال بنتے تو وہ پیچھے سے

پتھراؤ شروع کر دیتے اور اگر وہ پیچھے جاتے تو سامنے سے پتھراؤ شروع کر دیتے۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کو نشانہ بنایا گیا۔ آپ ﷺ کی پنڈلیاں بھی زخموں سے چور ہو گئیں۔ خون بہہ بہہ کر نعلین کے اندر جا کر جم گیا۔ وہاں سے آپؐ نکلے' ایک جگہ ٹھہرے تو حضور ﷺ کی زبانِ مبارک پر فریاد آ گئی:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ، یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ' اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ! اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟ اِنْ لَمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ! وَلٰکِنْ عَافِیَتُکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ! اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ وَصَلُحَ عَلَیْہِ اَمْرُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ مِنْ اَنْ یَّنْزِلَ بِیْ غَضَبُکَ اَوْ تَحُلَّ عَلَیَّ سَخَطُکَ ' لَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی ' وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِکَ!)) (۸)

''اے اللہ! میں تیری ہی جناب میں اپنی بے بسی' وسائل و ذرائع کی کمی اور لوگوں میں میری جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا ربّ ہے اور میرا بھی! اے پروردگار! تو مجھے کن کے سپرد کر رہا ہے؟ وہ دور دراز کے لوگ جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں' کہ وہ مجھے تختۂ مشق بنا لیں! یا تو نے میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں ہے' لیکن کچھ بھی ہو' تیری عنایات تو مجھ پر بے پایاں ہیں۔ میں تیرے چہرۂ انور کے نور کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام اندھیارے دور ہو جائیں اور جس کے پرتو سے دنیا اور آخرت کا معاملہ درست ہو جائے' اس سے کہ مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے یا تیرا غضب ٹوٹے۔ تجھے منانا ہے' اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے۔ نہ قابو ہے نہ زور ہے' مگر تیری ہی مدد سے۔''

گویا پہلے آنحضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کی' اس کے بعد آپ ﷺ نے

---

۸) سیرت ابن ہشام بحوالہ تاریخ الطبری ۲/۳۴۵۔

مقامِ عبدیت والی بات کہی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو ''عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ'' والی دو نسبتیں حاصل ہیں' مقامِ عبدیت کا تقاضا کچھ اور ہے' یعنی سرِ تسلیم خم کر دینا کہ کوئی شکوہ شکایت زبان پر نہ آئے۔ چنانچہ عرض کیا: ((اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ)) ''اے اللہ! (اس سب کے باوجود) اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں!'' گویا ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے! اندیشہ ہے کہ کہیں تو ناراض نہ ہو گیا ہو۔ جیسے ابتدا میں وحی کی آمد کا سلسلہ رُک گیا تھا تو آپؐ کو اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اللہ ناراض نہ ہو گیا ہو کہ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ پھر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَالضُّحٰی ① وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ② مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ③ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ④﴾ (الضحی)

اسی کو فارسی میں کہتے ہیں ''عشق است ہزار بدگمانی'' یعنی جہاں عشق و محبت کا معاملہ ہوتا ہے وہاں بڑی جلدی بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ کہیں محبوب کسی وجہ سے ناراض تو نہیں ہو گیا' اسے میری کوئی بات ناگوار تو نہیں گزر گئی۔ بہرحال خواہ کچھ بھی ہو' اس سب کے باوجود اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے' تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔

سفرِ طائف ذاتی طور پر محمد رسول اللہ ﷺ پر ابتلاء و آزمائش' امتحان اور سختی کا نقطۂ عروج ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی تصنیف ''اَلنَّبِیُّ الْخَاتِمُ'' میں اسے سیرتِ طیبہ کا ایک اہم موڑ (turning point) قرار دیا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو خصوصی حفاظت اور protection حاصل ہوئی۔ لیکن طائف سے فوری طور پر واپسی کے بعد عالمِ اسباب میں حضور ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ آپؐ مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے' وہاں آپ ﷺ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا' داخل ہوں گے تو قتل کر دیے جائیں گے۔ اور جب دارالندوہ میں فیصلہ ہو چکا ہو تو ایسا اقدام کرنے والے پر کوئی جرم والزام نہیں' اس پر کوئی مقدمہ نہیں بنے گا۔ حضور ﷺ طائف گئے تھے اور وہاں سے خالی ہاتھ لوٹے تھے۔ نوٹ کیجیے میں یہ نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ کی عالمِ اسباب میں ساری جدوجہد قدم بقدم زمین پر چل کر ہوئی۔ چنانچہ عالمِ اسباب کو

استعمال کرتے ہوئے آپؐ نے ایک مشرک اور کافر کو پیغام بھیجا کہ اگر تم مجھے اپنی امان میں لے لو تو میں مکہ میں آ جاؤں۔ ابھی میں بتا چکا ہوں کہ قبائلی زندگی کا یہ اصول تھا کہ اگر ایک شخص نے امان دے دی تو سب کی طرف سے امان ہو جائے گی۔ لیکن اس کافر نے انکار کر دیا۔ پھر آپؐ نے زید بن حارثہ کو ایک دوسرے شخص کے پاس بھیجا' لیکن اس نے بھی انکار کر دیا۔ تیسرا شخص مطعم بن عدی شریف النفس تھا۔ اس کے پاس آپ ﷺ کا پیغام پہنچا تو اس نے کہا آپ میری امان میں ہیں' آ جائیں۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ یوں نہیں' آ ؤ اور خود لے کر جاؤ۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ حضور ﷺ ایسے ہی مکہ میں داخل ہو جاتے اور کچھ لوگ آپ ﷺ پر فوری طور پر حملہ آور ہو جاتے تو وہ بعد میں کہہ سکتے تھے کہ ہمیں کیا علم کہ انہیں مطعم بن عدی نے امان دی ہے۔ آپ ﷺ نے اس درجہ دنیوی اسباب اختیار کیے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عالمِ اسباب ہے اور یہاں جو جدوجہد کرنی ہے اس عالمِ اسباب کے اندر رہتے ہوئے اور ان اسباب کو بروئے کار لا کر کرنی ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ایک مشرک و کافر کی امان لینا قبول کی۔ اور پھر مطعم بن عدی ہتھیار سجا کر اپنے چھ بیٹوں کو ساتھ لایا اور یہ کہتا ہوا آیا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو امان دی اور آج سے محمد (ﷺ) میری امان میں ہیں۔ تب حضور ﷺ مکہ میں داخل ہوئے۔ حضور ﷺ کو اس کے احسان کا اتنا پاس تھا کہ غزوۂ بدر میں جو ستر قیدی حضور ﷺ کی قید میں آئے ان کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ ان کی سفارش کرتا تو میں ان ستر کے ستر قیدیوں کو چھوڑ دیتا۔ لیکن مطعم بن عدی کا اس دوران انتقال ہو چکا تھا اور وہ اسی حالت کفر و شرک میں رہا۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کے پہلے دس برس کی جھلک دکھائی ہے۔ حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا عرصہ بیس برس ہے۔ عرب میں انقلاب کی تکمیل ۸ ہجری میں ہوئی جب مکہ اور طائف فتح ہو گیا اور غزوۂ حنین میں آپ ﷺ کو فتح حاصل ہوئی۔ اس طرح عرب میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لہٰذا مکہ کے بارہ برس اور مدینہ کے آٹھ برس شامل کر لیجیے تو یہ بیس برس ہوئے۔ اس عرصے کو دو حصوں میں تقسیم کریں' دس سال

اِدھر اور دس اُدھر۔ پہلے دس سال کا حاصل میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے کہ کل ۱۲۵ یا ۱۵۰ افراد ایمان لائے اور طائف سے واپسی پر آپ ﷺ کی یہ حیثیت نہیں تھی کہ آپؐ مکہ میں اپنے بل پر قیام کر سکتے۔ لہٰذا آپؐ ایک کافر و مشرک کی امان لے کر مکہ میں دوبارہ داخل ہوئے۔ یہ دس برس کی محنت شاقہ ہے۔ لیکن اگلے دس برس میں اسلامی انقلاب نہایت تیزی کے ساتھ مکمل ہوا ہے۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ و بیعتِ عقبہ ثانیہ

طائف سے واپسی کے بعد اسی سال ایامِ حج میں رسول اللہ ﷺ مکہ سے باہر مختلف وادیوں میں ٹھہرے ہوئے حاجیوں سے ملاقات کر کے انہیں اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے کہ آپؐ کو یثرب سے آئے ہوئے چھ حاجی مل گئے۔ آپؐ نے ان کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ یہ چھ حاجی قبیلہ خزرج سے تھے۔ یثرب کے یہودی چونکہ یہ کہا کرتے تھے کہ عنقریب نبی آخر الزماں (ﷺ) کا ظہور ہونے والا ہے۔ اور جب ان یہودیوں کے قبیلہ اوس اور خزرج سے جھگڑے ہوتے تھے اور وہ ان قبائل سے مار کھاتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ابھی تو تم ہمیں دبا لیتے ہو' لیکن دیکھو! نبی آخر الزمان ﷺ کے ظہور کا وقت قریب ہے' جب ہم ان کے ساتھ مل کر لڑیں گے تو تم ہمیں شکست نہیں دے سکو گے۔ یہودیوں کی یہ باتیں اہل یثرب کے کانوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ لہٰذا جب یثرب سے آئے ہوئے ان حاجیوں کے سامنے حضور ﷺ نے دعوت پیش کی تو انہوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر یہود کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ یہودی حضور ﷺ پر ایمان لاتے قبیلہ خزرج کے وہ چھ آدمی ایمان لے آئے۔ واپس مدینہ جا کر انہوں نے تھوڑی بہت دعوت دی ہوگی' اس کے نتیجے میں اگلے سال حج کے موقع پر بارہ آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں کوئی مبلغ و معلم اور مُقری دیجیے جو ہمیں قرآن پڑھائے' کیونکہ آپ سے تو ہماری ملاقات اب اگلے سال ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں سفر کرنا آسان کام نہیں تھا' قتل و غارت کا خطرہ رہتا

تھا اور قافلے لوٹ لیے جاتے تھے‘ صرف اَشہرِ حُرم‘ یعنی حج کے مہینوں میں امن و امان ہوتا تھا کہ کوئی کسی کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپؐ ہمیں کوئی قرآن پڑھانے والا دیجیے۔ قرعۂ فال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے نام نکلا اور آپؐ نے انہیں یثرب سے آئے ہوئے حضرات کے ساتھ روانہ کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد آپؐ نے ایک اور صحابی حضرت عبداللہ بن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہ کو‘ جو نابینا تھے‘ یثرب بھیج دیا۔ ان دونوں حضرات نے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کیا اور اس لگن سے لوگوں کو قرآن پڑھایا کہ حضرت مصعب کا تو نام ہی ''مُقری'' پڑ گیا تھا۔ اس دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں اگلے سال پچھتر (۷۵) آدمی مکہ آئے اور بیعت عقبہ ثانیہ ہوگئی‘ جس کے نتیجے میں یثرب کی طرف ہجرت کا راستہ کھل گیا۔ ان ۷۵ افراد میں اوس اور خزرج کے بڑے بڑے لوگ بھی موجود تھے۔ ان دونوں قبائل کی بحیثیت مجموعی اسلام کی طرف پیش قدمی سے اللہ تعالیٰ کی وہ مشیت اس طور سے پوری ہوئی اور مدینے کی طرف ہجرت ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے بقیہ صحابہ کو تو ہجرت کی اجازت دے دی لیکن خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح اجازت نامہ ملنے کے منتظر رہے۔

اس ضمن میں ایک واقعہ آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے ساتھ سفر ہجرت کے لیے بالکل تیار تھے اور آپؐ سے پوچھا کرتے تھے کہ حضور ﷺ! ہجرت کی اجازت آگئی؟ آپؐ فرماتے ''ابھی نہیں آئی''۔ اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ روزانہ دریافت فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن ہم نے عجیب نقشہ دیکھا کہ عین دوپہر کے وقت رسول اللہ ﷺ چلے آ رہے ہیں اور آپؐ نے اپنے چہرے اور سر کے اوپر کپڑا اوڑھا ہوا ہے۔ عرب میں دوپہر کے وقت کسی کے ہاں جانا اور ملاقات کرنا نہ آج پسندیدہ بات ہے نہ پہلے کبھی تھی‘ کیونکہ یہ قیلولہ کا وقت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم اس وقت حضور ﷺ کی آمد پر حیران ہوئے۔ آپؐ نے آکر پہلی بات یہ فرمائی کہ ہجرت کی اجازت آگئی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے طور پر دو اونٹنیاں (ایک اپنے لیے اور ایک

حضور ﷺ کے لیے) تیار کی ہوئی تھیں اور انہیں کھلا پلا کر خوب موٹا کیا ہوا تھا تاکہ خوب تیز دوڑیں اور سفرِ ہجرت میں کام آئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خوشی کے انداز میں عرض کیا کہ حضور! میں نے سفر کے لیے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں۔ آپؐ نے ذرا توقف کے بعد فرمایا: ''ٹھیک ہے' ایک میں استعمال کروں گا لیکن میں اس کی قیمت ادا کروں گا''۔ حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر رو پڑے کہ حضور ﷺ مجھ سے بھی یہ مغائرت! یہ حضور ﷺ کی غیرت وحمیت اور خودداری تھی۔ بہرحال مدینہ کی طرف سفرِ ہجرت ہوا۔

ہجرت کے بعد آپ ﷺ کی جدوجہد کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس محدود وقت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ یہاں پورے انقلابی عمل کو بیان کیا جائے۔

مکی دور میں دعوت' تربیت وتزکیہ' تنظیم اور صبر محض' یہ چار چیزیں بیک وقت چلی ہیں۔ ''صبر محض'' تیاری کا دور ہے کہ جب تک اتنی طاقت نہیں ہے کہ کفر کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر مقابلہ کر سکیں' اُس وقت تک اگر تم پر کوئی زیادتی کی جائے تو جھیلو اور برداشت کرو اور صبر کرو۔ اس مرحلے پر کوئی جوابی کارروائی نہ کی جائے۔ یہ حضور ﷺ کی کامیابی کے ضمن میں آپؐ کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا انتہائی نازک معاملہ تھا۔ وحی جلی' یعنی قرآن مجید میں کوئی ایسا حکم نہیں آیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ لیکن اس حکم کا تذکرہ بعد میں سورۃ النساء میں بایں طور کیا گیا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ﴾ (آیت:۷۷)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو! (اس وقت بعض لوگ چاہتے تھے کہ ہمیں جنگ کی اجازت دی جائے) اب جو انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسا اللہ سے ڈرنا چاہیے' یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر' اور کہتے ہیں: پروردگار' یہ ہم پر جنگ کا حکم تو نے کیوں لکھ دیا؟

ہمیں تو نے کچھ مزید مہلت کیوں نہ دے دی؟''

مکی سورتوں میں اس حکم کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی خفی کے ذریعے سے ہاتھ بندھے رکھنے کا حکم دیا ہو' کیونکہ حضور ﷺ پر وحی جلی ہی نہیں وحی خفی بھی آتی تھی۔ اس سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا تدبر اور آپ کی اپنی تدبیر تھی۔ حضور ﷺ کی اپنی سوچی سمجھی رائے تھی کہ کوئی انقلابی جماعت جو بھی تعداد اور قوت میں تھوڑی ہے' اگر وہ پُرتشدد ہو جائے تو وہ کچل دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر تشدد کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پُرتشدد نہیں ہوئے۔ حالانکہ انہیں ستایا اور مارا جا رہا تھا' انہیں گھروں میں نظر بند کیا جا رہا تھا' انہیں بھوکا پیاسا رکھا جا رہا تھا۔ خاص طور پر غلاموں پر انتہائی تشدد کیا جا رہا تھا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والدین حضرت سُمیہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما کو تو شہید بھی کر دیا گیا۔ اس سب کے باوجود مسلمانوں کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہ انتہائی حکیمانہ اور انتہائی مدبرانہ انداز ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس مرحلے پر اگر کہیں جوابی کارروائی ہو جائے تو باطل قوتوں کو ہمیں کچلنے کا پورا جواز مل جائے گا۔ ابھی تو ہمیں وقت چاہیے کہ ہم اپنی دعوت و تربیت کے ذریعے سے اپنی بنیاد (Base) کو وسیع' مستحکم اور مضبوط کریں۔ اس کو علامہ اقبال نے یوں کہا ہے ؎

با نشّہء درویشی در ساز و دما دم زن!

یعنی درویشی کا انداز اختیار کرو اور اس سے موافقت اختیار کر لو اور اسی انداز پر محنت اور کوشش کرتے رہو۔ آخر دعوت و تبلیغ بھی تو درویشی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ درویش کو اگر کسی نے تھپڑ بھی مار دیا تو وہ اس کو جواب میں تھپڑ نہیں مارے گا۔ درویشی یہ ہے کہ ظلم و زیادتی کے باوجود کوئی جوابی کارروائی نہ کی جائے اور اپنے ہاتھ بندھے رکھے جائیں' ذاتی مدافعت (self defence) میں بھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیے جائیں۔ چنانچہ حضرت خُباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ کرتہ اتارو' انہوں نے اتار دیا' ان کی نگاہوں کے سامنے زمین پر دہکتے ہوئے انگارے بچھے ہوئے تھے۔ اب حضرت خباب سے کہا گیا کہ ان انگاروں پر لیٹ جاؤ تو وہ لیٹ گئے۔ اس لیے کہ

صبر محض اور ہاتھ بندھے رکھنا محمد عربی ﷺ کا حکم تھا۔ ورنہ یہ کہ آدمی اگر مایوس (desperate) ہو جائے کہ میرا تو یہ کباب بنانے چلے ہیں اور وہ اقدام کرنے پر آجائے تو دو چار کو مار کر ہی مرے گا۔ بلی کو بھی اگر آپ کارنر کرلیں اور اسے محسوس ہو کہ میرے لیے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا تو وہ آپ پر حملہ آور ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک انسان کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مجھے زندہ کو بھوننے لگے ہیں تو وہ اگر کوئی کارروائی کردے تو دو چار کو مار کر مرے گا' لیکن محمد عربی ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں صبر محض کے مرحلے پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔

مکہ کے بارہ برس دعوت و تبلیغ' تربیت و تزکیہ اور تنظیم کے مراحل میں گزرے' جس کا نقطۂ عروج بیعت عقبہ ثانیہ ہے' جس میں حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عہد لیا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ' وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا' لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۹)

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی تھی کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے' خواہ مشکل ہو خواہ آسانی ہو' خواہ طبیعت آمادہ ہو اور خواہ ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے' خواہ آپؐ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں' اور جنہیں بھی آپؐ ذمہ دار بنائیں گے ان سے ہم جھگڑیں گے نہیں (ان سے تعاون کریں گے)۔ اور جہاں بھی ہوں گے حق بات (اور صحیح مشورہ) ضرور پیش کریں گے' ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

یہ ایک عظیم بیعت تھی جس سے ایک تنظیم وجود میں آئی۔

داخلی استحکام کی خاطر اقدامات

مدینہ میں آکر رسول اللہ ﷺ نے داخلی استحکام کی خاطر چھ مہینے میں تین کام کیے:

۹) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمھا فی معصیۃ۔ وصحیح البخاری (اختصار کے ساتھ) کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس۔

۱) مسجد نبوی کی تعمیر کی جس سے ایک مرکز بن گیا۔ اب یہ دار الندوہ بھی تھی اور دار المشاورت بھی' یہ دار الامارہ بھی تھی اور دار الصلاۃ بھی تھی۔ یہی دار التعلیم' دار التزکیہ اور دار الاحسان بھی تھی۔ اسے آپ خانقاہ' درس گاہ' تربیت گاہ' عبادت گاہ' ایوانِ حکومت' عدالت اور پارلیمنٹ ہاؤس کہہ لیں۔ الغرض مسجد نبوی کی شکل میں ایک مرکز وجود میں آ گیا۔

۲) حضور ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے مابین ''مواخات'' قائم کر کے انہیں بھائی بھائی بنا دیا تا کہ اسلامی جماعت کے دو حصے مربوط ہو جائیں۔

۳) حضور ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ یہ معاہدہ کر کے انہیں جکڑ لیا کہ اگر مدینے پر باہر سے حملہ ہوا تو اس کا سب مل کر جواب دیں گے۔

مستشرقین کی کوتاہ نظری

یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ مستشرقین نے اپنی کوتاہ نظری کے باعث رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مکی اور مدنی دور کے طرزِ عمل کو متضاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹ء۔۱۹۷۵ء) نے حضور ﷺ کے بارے میں ایک بڑا زہر بھرا جملہ کہا تھا:

> *"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman."*

یعنی محمد (ﷺ) نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے' لیکن بحیثیت سیاست دان کامیاب ہوئے''۔ مکہ میں دعوت و تربیت' تزکیہ اور صبرِ محض کا جو نقشہ تھا اس کے نزدیک انبیاء کا کام یہی ہوتا ہے۔ یہی کام تین سال تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ محمد (ﷺ) جب مکہ میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے (معاذ اللہ) مدینہ کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ مستشرقین ہجرتِ مدینہ کو "Flight to Medina" کہتے ہیں' حالانکہ یہ فرار نہیں تھا' بلکہ ایک متبادل مرکز (alternate base) کی طرف منتقلی تھی۔ پہلے آپؐ نے متبادل مرکز کی تلاش میں طائف کا سفر اختیار فرمایا تھا' لیکن مشیتِ الٰہی کچھ اور تھی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ متبادل مرکز (alternate base) مدینہ کی شکل میں عطا کیا۔ انقلابی جدوجہد میں اقدام کے مرحلہ کے آغاز کے لیے مدینہ کی حیثیت ایک Base کی تھی۔

برطانوی پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء۔ ۲۰۰۶ء)' جسے ضیاء الحق صاحب نے خاص طور پر پاکستان بلایا تھا' نے سیرتِ محمدی ﷺ پر دو کتابیں لکھی ہیں:

1- Muhammad at Mecca

2- Muhammad at Medina

اس نے ان دونوں کتابوں میں اپنے تئیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے متضاد پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ مکے والا محمد (ﷺ) کچھ اور ہے' مدینے والا کچھ اور۔ مکے والا محمد (ﷺ) تو داعی' مبلغ' مزکی اور درویش ہے اور اس کی سیرت میں واقعتاً نبیوں والا نقشہ نظر آتا ہے جبکہ مدینے والا محمد تو ایک مدبر' منتظم' سٹیٹسمین' سیاست دان اور سپہ سالار ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں شخصیتیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ "Muhammad at Medina" میں اُس نے حضور ﷺ کے لیے مدح اور تعریف کے تمام ممکنہ الفاظ کو جمع کر دیا ہے۔ آپ کی دُور اندیشی' معاملہ فہمی' آپ کی صحیح صحیح صورت حال کے بارے میں صحیح صحیح اقدام کی صلاحیت' آپ کی انسان شناسی اور ہر انسان کی ذہنی سطح کا اندازہ کرتے ہوئے اس سے اس کی سطح پر بات کرنا اور ہر انسان سے اس کی صلاحیت واستعداد کے مطابق کام لے لینا جیسی تمام خصوصیات کا تذکرہ اس نے کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی موقع شناسی' تدبر اور سیاست وغیرہ کے جتنے بھی اعلیٰ ترین اوصاف ہیں ان کا ذکر افعل التفضیل (superlative) کے صیغے میں کیا ہے۔ اس سے ایک مسلمان دھوکا کھاتا ہے کہ یہ کتاب حضور ﷺ کی تعریف میں لکھی گئی ہے' حالانکہ درحقیقت وہ تضاد (contrast) بیان کر رہا ہے کہ بحیثیت سیاست دان (statesman) تو آپ کے یہ اوصاف ہیں جبکہ بحیثیت نبی آپ ناکام ہو گئے اور آپ کو مکے سے بھاگ کر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ یہ وہ زہر ہے جو اس نے گھولا ہے۔ لیکن حضور ﷺ کی معاملہ فہمی' دور اندیشی اور statesmanship کا اس نے گھٹنے ٹیک کر اعتراف کیا ہے۔ حضور ﷺ کے انہی اوصافِ عالیہ کا شاہکار "میثاقِ مدینہ" تھا جس

میں آپؐ نے مدینہ میں آباد یہودیوں کے تینوں قبیلوں کو پابند کرلیا۔ اگرچہ بعد میں وہ ایک ایک کر کے غداری کے مرتکب ہوتے رہے' لیکن ظاہر بات ہے کہ جب وہ غداری بھی کرتے تھے تو چھپ چھپ کر اور ڈرتے ڈرتے' کیونکہ وہ اس معاہدے میں جکڑے ہوئے تھے' کھلے عام انہیں ان سرگرمیوں کی جرأت نہیں تھی۔ لہٰذا در پردہ سازشیں کرتے رہے' وہ کبھی مکہ والوں کو ابھارتے' کبھی کسی اور کو۔ بعد میں اس معاہدے کی خلاف ورزیوں کے سبب یہودیوں کے تینوں قبائل بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ مدینہ سے نکال دیے گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے چھاپہ مار مہموں کا آغاز

حضور ﷺ نے مدینہ میں ابتدائی چھ مہینے مذکورہ بالا تین کاموں کے لیے صرف کیے اور ساتویں مہینے آپؐ نے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار دستے مکہ کی طرف بھیجنے شروع کر دیے۔ اب یہ باطل کو چیلنج دینے کا انداز ہے۔ غزوۂ بدر سے پہلے پہلے آپؐ نے ایسی آٹھ مہمات روانہ کیں۔ بدقسمتی سے سیرت کی وہ کتابیں جو انگریزی دور میں لکھی گئیں ان کے مؤلفین نے ان واقعات کو اہمیت نہیں دی اور انہیں چھپایا ہے۔ یہاں تک کہ علامہ شبلی نعمانی نے بھی ان کو نقل نہیں کیا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے ان اقدامات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جنگ کا آغاز محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوا' قریشِ مکہ کی طرف سے نہیں۔ جبکہ یورپی استعمار کے دور میں ہمارے اوپر یہ تنقید ہوتی تھی کہ اسلام تو تلوار سے پھیلا ہے ؏

"بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!"

اور یہ تو خونی اور جنونی لوگ ہیں' یہ دلیل سے بات نہیں کرتے' طاقت سے بات کرتے ہیں۔ مغرب کی طرف سے چونکہ مسلسل یہ پروپیگنڈا ہو رہا تھا لہٰذا ہمارا انداز معذرت خواہانہ سا ہو گیا تھا کہ "نہیں! حضور ﷺ نے تو جنگ نہیں کی' آپؐ نے تو دفاع کیا ہے' آغاز تو کفار کی طرف سے ہوا تھا"۔ یہ بات صد فیصد غلط ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کو اللہ نے دین کو غالب کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ آپؐ مکہ سے مدینہ وہاں کے نخلستانوں کی

ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے تو نہیں آئے تھے' وہ تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس جدوجہد کے اگلے مرحلے یعنی اقدام کی تیاری کے لیے Base فراہم کیا تھا۔ آپؐ اگلے مرحلے کا آغاز زیادہ سے زیادہ چھ مہینے مؤخر کر سکتے تھے تاکہ وہاں اپنی پوزیشن کو مستحکم کریں' اس سے زیادہ آپ کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا آپؐ نے اپنی پوزیشن مستحکم ہوتے ہی اقدام کا آغاز فرما دیا' اور یہ سلسلہ آپؐ کی جانب سے شروع ہوا۔ آپؐ کی آٹھ مہمات غزوۂ بدر سے پہلے ہیں۔ ان میں چار غزوات ہیں جن میں حضور ﷺ خود بھی شریک ہوئے اور چار سرایا ہیں جن میں حضور ﷺ خود شریک نہیں ہوئے۔

ان مہمات کا مقصد ایک تو قریش کو چیلنج کرنا اور دوسرے مکہ کی معاشی ناکہ بندی (Economic Blockade) تھا' کیونکہ اہل مکہ کی معاش کا دارومدار کلیتاً تجارت پر تھا۔ ان کے تجارتی قافلے شمالاً جنوباً سفر کرتے تھے۔ شمال میں شام کی طرف جانے والا قافلہ بدر سے ہو کر گزرتا تھا۔ بدر مدینہ سے اسّی (۸۰) میل کے فاصلے پر ہے اور مکہ سے دو سو میل کے فاصلے پر۔ لہٰذا یہ مسلمانوں کی زد میں تھا۔ ادھر جنوب کی سمت میں جو قافلہ یمن کی طرف جاتا تھا وہ وادیٔ نخلہ سے ہو کر گزرتا تھا جو مکہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے اور مدینہ سے اس کا فاصلہ کم از کم تین سو میل کا ہے۔ لیکن آپؐ نے وادیٔ نخلہ میں بھی ایک مہم روانہ فرمائی۔ ان مہموں کا مقصد قریش کو یہ بتا دینا تھا کہ اب تمہاری لائف لائن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس کو جدید اصطلاح میں مکہ کی معاشی ناکہ بندی کہیں گے۔ ان مہمات سے آپؐ نے جو دوسرا مقصد حاصل فرمایا وہ قریش کو سیاسی طور پر الگ تھلگ کرنا (Political Isolation) تھا۔ حضور ﷺ ان چار مہموں کے دوران جن میں آپؐ بنفس نفیس شریک تھے' جہاں بھی گئے آپؐ نے علاقائی قبائل سے معاہدے کیے۔ چنانچہ وہ قبائل جو پہلے قریش کے اتحادی تھے اب یا تو حضور ﷺ کے اتحادی ہو گئے' یا انہوں نے غیر جانبداری کا معاملہ کیا کہ ہم نہ قریش کے خلاف آپؐ کا ساتھ دیں گے اور نہ آپؐ کے خلاف قریش کی مدد کریں گے۔ لیکن ان دونوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کے سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ سکڑنے لگا اور محمد ﷺ کے سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ بتدریج

پھیلنے لگا۔ قرآن مجید میں جو درمیانی دور کی مکی سورتیں ہیں ان میں سے سورۃ الانبیاء میں یہ آیت آئی ہے:

﴿اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ﴾ (آیت ۴۴)

"کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں؟"

یعنی ہم زمین کو چاروں اطراف سے گھیرتے ہوئے مکہ کی طرف لا رہے ہیں۔ مکی دور ہی میں ان قبائل میں بھی اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اب گویا اسلام مکہ کی طرف دوسرے قبائل سے پیش رفت کر رہا تھا۔ اب اس کی صورت یہ بنی کہ حضور ﷺ نے ان قبائل کے ساتھ معاہدے کر لیے تو حضور ﷺ کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا اور قریش کا گھٹتا چلا گیا۔

غزوۂ بدر: مسلح تصادم کا آغاز

رسول اللہ ﷺ کے ان اقدامات کے نتیجے میں تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق قریش کا ایک ہزار کا لشکر نکلا' جس کی دو فوری وجوہات ہو گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ نخلہ میں آپ نے جو گروپ بھیجا تھا اس کی مڈبھیڑ قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہو گئی' اور جس میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک مارا گیا اور مسلمان ایک کو اسیر بنانے کے علاوہ مالِ تجارت بھی چھین کر لے آئے۔ اب مکہ میں شور مچ گیا کہ محمد (ﷺ) کی یہ جرأت کہ اُس کے آدمیوں نے ہمارا آدمی مار دیا۔ یہ ہجرت کے بعد پہلا قتل تھا اور یہ مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک کا تھا۔ ثانیاً حضور ﷺ نے قریش کے اس تجارتی قافلے کا پیچھا کر کے اسے روکنے کی کوشش کی تھی جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام جا رہا تھا' لیکن یہ قافلہ مسلمانوں کے ہاتھوں بچ نکلا تھا۔ قافلے کی واپسی کے وقت ابوسفیان کو زیادہ اندیشہ لاحق ہوا' کیونکہ یہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ تھا جس میں ایک ہزار اونٹوں پر کروڑوں کا مال تجارت لدا ہوا تھا۔ چنانچہ ابوسفیان نے قریش کو ہنگامی پیغام بھیجا کہ مجھے محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں سے خطرہ ہے کہ وہ حملہ کر کے ہمیں لوٹ لیں گے' لہٰذا فوری مدد بھیجو۔ دوسری طرف ابوسفیان نے خود راستہ بدل لیا اور بدر سے ہو کر گزرنے کے بجائے نیچے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو کر گزر گیا۔ ادھر مکہ میں ابوسفیان کا ہنگامی پیغام پہنچا اور ادھر سے

لوگ روتے پیٹتے اور کپڑے پھاڑتے ہوئے آ گئے کہ محمد (ﷺ) کے آدمیوں نے ہمارا ایک آدمی مار دیا ہے تو اس کے نتیجے میں قریش کے مشتعل مزاج لوگوں (Hawks) کا پلڑا امن پسند لوگوں (Doves) پر بھاری ہو گیا۔ Hawks اور Doves ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ ہر صورت میں لڑنے مرنے پر تیار ہونے والے Hawks کہلاتے ہیں اور جنگ سے گریز کا مشورہ دینے والے Doves کہلاتے ہیں۔ قریش میں بھی دونوں طرح کے لوگ تھے۔

Hawks میں ابو جہل' عتبہ بن ابی معیط اور بڑے بڑے لوگ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چل کر مدینہ پر فوج کشی کرو اور محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کو ختم کر دو۔ دوسری طرف ان میں Doves بھی تھے' جن میں ایک بزرگ شخصیت عتبہ بن ربیعہ بھی تھا جو بدر کے میدان میں پہلا مقتول ہے' لیکن وہ بہت شریف النفس انسان تھا۔ دوسرے حکیم بن حزام تھے' جو شاید اندر ہی اندر ایمان بھی لا چکے تھے' لیکن ابھی ظاہر نہیں کیا تھا' وہ بھی بہت شریف انسان تھے۔ یہ دونوں حضرات کہتے تھے کہ اب بلا ہمارے سر سے ٹل گئی ہے' محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی یہاں سے چلے گئے' اب تم محمد کو بقیہ عرب کے حوالے کر دو' اس لیے کہ محمد (ﷺ) چین سے بیٹھنے والے تو نہیں ہیں' انہوں نے اپنی دعوت پھیلانی ہے' تو جو ردِ عمل ہمارا ہے وہی سارے کے سارے عرب کے لوگوں کا ہو گا' کیونکہ سب مشرک اور بُت پرست ہیں۔ اب محمد (ﷺ) کی ان سے کشمکش ہو گی' جس میں اگر محمد ﷺ ان پر غالب آ گئے تو ہمارا کیا جائے گا' وہ بھی تو قریشی ہیں' بنو ہاشم سے ہیں' گویا پورے عرب پر قریش کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اور اگر بقیہ عرب نے محمد (ﷺ) کو ختم کر دیا تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں اپنی تلواریں اپنے بھائیوں کے خون سے رنگین نہیں کرنی پڑیں گی۔ آخر محمد (ﷺ) بھی تو بنی ہاشم سے ہیں! بہر حال جب یہ دو چیزیں سامنے آ گئیں تو Doves بے بس ہو گئے اور Hawks نے طبل جنگ بجا دیا۔ چنانچہ وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس کر کے لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔

ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ جب کفار عین بدر کے میدان میں پہنچ گئے اور ادھر سے حضور ﷺ بھی تین سو تیرہ کی نفری لے کر آ گئے تو لشکرِ مکہ کو یہ پیغام پہنچ گیا کہ ہمارا قافلہ تو بچ کر نکل گیا ہے۔ چنانچہ حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ ابوجہل کے پاس آئے اور آ کر کہنے لگے کہ ہمارا قافلہ بحفاظت بچ کر نکل گیا ہے' اب لڑائی کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کی حیثیت ایسی ہے کہ اگر آپ چاہیں تو یہ خون ریزی رک سکتی ہے۔ عتبہ بن ربیعہ نے ابوجہل کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ جو ہمارا ایک آدمی محمد (ﷺ) کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اس کا خون بہا میں ادا کرتا ہوں' باقی یہ کہ ہمارا قافلہ تو بچ کر نکل ہی گیا ہے' لہٰذا ہمیں اس خونریزی سے بچنا چاہیے۔

اس پر ابوجہل نے مقتول کے بھائی کو بلا کر کہا کہ تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ تمہارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے' یہ لوگ آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ نہ ہو۔ اس نے عرب کے رواج کے مطابق کپڑے پھاڑے اور چیخنے لگا کہ مجھے تو قصاص اور بدلہ چاہیے' مجھے کوئی خون بہا نہیں چاہیے! مزید یہ کہ ابوجہل نے عتبہ کو طعنہ دیا کہ شاید تم پر بزدلی طاری ہو گئی ہے' کیونکہ تمہارا اپنا بیٹا حذیفہ سامنے ہے۔ ایک عرب کے لیے تو یہ بہت بڑا طعنہ تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا یہ تو کل معلوم ہو گا کہ کون بزدل ہے اور کون بہادر ہے۔ چنانچہ اگلے دن سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو لے کر میدان میں آیا اور مبارزت طلب کی۔ ادھر سے تین انصاری صحابی مقابلہ کے لیے نکلے۔ عتبہ نے پوچھا: کون ہو تم؟ انہوں نے کہا انصارِ مدینہ۔ عتبہ نے کہا: نہیں' ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں' ہمیں اپنے ہم پلہ لوگوں سے لڑنا ہے' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے نہیں آئے۔ اس پر پھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے مقابلے میں نکلنا چاہا لیکن حضور ﷺ نے روک دیا۔ پھر حضرت علی' حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم نکل کر میدان میں آئے اور پہلا قتل حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں عتبہ کا ہوا۔ اس طرح وہی شخص جو جنگ روکنا چاہتا تھا' لیکن بزدلی کا طعنہ برداشت نہیں کر سکا' سب سے پہلے واصلِ جہنم ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ کا کام تمام کیا۔ پھر دونوں لشکر باہم ٹکرائے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی

نصرت سے اہل ایمان کو فتح عطا فرمائی اور اس دن کو ''یوم الفرقان'' قرار دیا گیا۔

یہاں سے حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد آخری مرحلے میں داخل ہو گئی۔ یہ ''مسلح تصادم'' جس کا آغاز غزوۂ بدر سے ہوا' چھ سال جاری رہا۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے بارہ سال دعوت، وتزکیہ' تنظیم اور صبر محض (کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ) کے مراحل میں گزرے۔ یہ مکہ کے بارہ برس تھے۔ مدینہ میں آ کر آپؐ نے پہلے چھ مہینے میں اپنی پوزیشن مستحکم کی' اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال کے دوران قریش کے خلاف مہمیں بھیجیں جن کے نتیجے میں یہ مسلح تصادم شروع ہوا۔ اس طرح گویا سانپ کو بل میں سے نکالا گیا۔ میں یہ بات جان بوجھ کر کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ مکہ تو حرم ہے' وہاں جا کر کشت و خون کوئی پسندیدہ شے نہیں ہے۔ لہٰذا قریش کو وہاں سے نکالنا ایسے ہی تھا جیسے کہ سانپ کو بل سے نکال کر باہر لے آیا جائے اور پھر اس کی گردن کچلی جائے۔ چنانچہ بدر میں ان کے چوٹی کے ستر سردار مارے گئے جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد چھ سال تک مسلسل جنگ لڑی گئی' جس کے نتیجے میں غزوۂ بدر' غزوۂ احد' غزوۂ احزاب' اور غزوۂ خیبر وغیرہ ہوئے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے غلبۂ دین کی جدوجہد کے لیے پوری تیاری کی تھی۔ افراد کو تیار کیا تھا' ان کا تزکیہ کیا تھا' ان کے اندر ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ ہر چہ بادا باد' جانیں دینے کو تیار ہیں' انہیں نظم کا خوگر بنا دیا تھا۔ پھر ان کی للّٰہیت اس درجے کو پہنچ چکی تھی کہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یہ ساری تیاری کر کے آپؐ میدان میں آئے تھے۔ پھر مسلح تصادم کا دور شروع ہوا اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسراءیل)

انقلابِ اسلامی کی توسیع و تصدیر کا مرحلہ

۸ھ یا ۹ھ میں اندرونِ ملک عرب انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہو گئی۔ البتہ اس کے بعد کا مرحلہ سمجھ لیجیے۔ کسی بھی سچے انقلاب کے لیے آخری مرحلہ انقلاب کی توسیع اور

تصدیر کا ہوتا ہے اور یہ اس کا لٹمس ٹیسٹ (litmus test) ہے۔ حقیقی انقلاب صرف وہ ہوتا ہے جو کسی جغرافیائی‘ قومی اور ملکی حدود کے اندر محدود نہ رہے‘ بلکہ پھیلتا جائے۔ اس لیے کہ انقلاب نظریے کی بنیاد پر برپا ہوتا ہے اور نظریہ کو پاسپورٹ درکار ہوتا ہے نہ ویزا۔ جیسے ہوا اور بادل بغیر کسی رکاوٹ کے ادھر سے ادھر جارہے ہیں اسی طرح نظریہ بھی جائے گا۔ نظریہ پھیلے گا تو انقلاب کی توسیع ہوگی۔ جو انقلاب اپنے آپ کو انقلاب تو کہے لیکن کسی حدود کے اندر محدود رہ جائے وہ حقیقی انقلاب نہیں‘ بلکہ اسے صرف ظاہری طور پر انقلاب کہیں گے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ایران کا انقلاب ہے۔ اگرچہ یہ ظاہری انقلاب ہے کہ بادشاہت ختم ہوئی اور علماء کی حکومت قائم ہوگئی‘ لیکن یہ حقیقی انقلاب نہیں‘ کیونکہ اس کی توسیع نہیں ہوسکی۔ اس کو پاکستان برآمد کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یہاں کے اہلِ تشیع نے ۱۹۷۹ء کے انقلابِ ایران کے بعد جارحانہ انداز اختیار کیا تھا‘ لیکن ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ یا پھر یہ انقلاب سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ عراق میں ایکسپورٹ ہوسکتا تھا‘ کیونکہ وہ ملحق بھی ہے اور وہاں کی پچپن فیصد آبادی شیعوں پر مشتمل ہے‘ لیکن وہاں بھی خمینی صاحب سے strategic غلطی ہوئی اور دونوں ملکوں میں تصادم ہوگیا اور صدام حسین نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اسے عرب اور عجم کی لڑائی کا رنگ دے دیا اور اس طرح گویا عرب نیشنلزم اور ایرانی نیشنلزم مدمقابل آگئے۔ بہرحال کسی بھی انقلاب کا صحیح لٹمس ٹیسٹ یہ ہے کہ وہ علاقائی حدود سے باہر نکلتا ہے یا نہیں۔ انقلابِ فرانس صرف فرانس تک ہی محدود نہیں رہا‘ بلکہ پوری دنیا میں پھیلا اور پوری دنیا میں جمہوریت کا دور آیا۔ انقلابِ روس لاطینی امریکہ اور کیوبا تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد عربی ﷺ کے انقلاب کا بین الاقوامی اور عالمی مرحلہ بھی فوراً شروع ہوگیا‘ جس کا آغاز حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ چنانچہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب تک انقلاب کی تکمیل آپ ؐ نے بنفس نفیس خود فرمائی‘ بلکہ اگلے مرحلے میں انقلابِ محمدی کی توسیع وتصدیر کے بین الاقوامی اور عالمی مرحلے کا آغاز بھی آپ ؐ نے فرما دیا۔

اس ضمن میں تین باتیں نوٹ کیجیے کہ جب تک صلح حدیبیہ نہیں ہوگئی‘ جسے قرآن نے

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ①﴾ (الفتح) قرار دیا' حضور ﷺ نے بیرونِ عرب نہ کوئی داعی اور مبلغ بھیجا اور نہ ہی کوئی نامہ مبارک روانہ فرمایا' بلکہ پوری توجہ عرب کے اندر ہی مرکوز رکھی تا کہ یہاں انقلاب آ جائے۔ دس برس تک آپؐ نے مکہ سے باہر قدم نہیں نکالا' سوائے اس کے کہ عُکاظ کا جو میلہ لگتا تھا جس میں آس پاس کے قبائل چلے آتے تھے' کبھی کبھار آپؐ وہاں تشریف لے جاتے۔ آپؐ نے پورے دس برس صرف مکہ میں اپنی دعوت پیش کی۔ اس کے بعد مزید آٹھ برس تک صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے صرف نامہ ہائے مبارک بھیجنے شروع کیے۔ آپؐ نے ہرقل شاہِ روم' خسرو پرویز شہنشاہ ایران' مقوقس شاہِ مصر اور نجاشی شاہِ حبشہ کو نامہ ہائے مبارک بھیجے۔ وہ نجاشی اب فوت ہو چکے تھے جو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے' کیونکہ ان کی ملاقات حضور ﷺ سے نہیں ہو سکی۔ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے ان کی صحبت نجاشی رحمہ اللہ کو حاصل ہوئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے نامہ ہائے مبارک لے کر جانے والے ایلچیوں میں سے ایک ایلچی کو سلطنت روما کے باج گزاروں نے قتل کر دیا' لہٰذا روما سے ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ چنانچہ پہلے غزوۂ موتہ اور پھر غزوۂ تبوک ہوا۔ آپؐ تیس ہزار کی نفری لے کر تبوک میں بیس دن تک مقیم رہے۔ شہنشاہِ روم ہرقل چونکہ یہ پہچانتا تھا کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں اس لیے وہ مقابلے میں نہیں آیا' حالانکہ وہ لاکھوں کی فوج کے ساتھ شام میں پڑاؤ کیے ہوئے تھا۔ بہرحال آپ ﷺ نے عرب کے باہر انقلاب کی توسیع کا آغاز اپنی حیاتِ طیبہ میں فرما دیا تھا۔

پھر خلفاء راشدین کے دور میں اسلامی افواج نے تین اطراف میں پیش قدمی کی ہے۔ ایک لشکر سیدھا شمال کی سمت بڑھتا ہوا ایشیائے کوچک کی طرف گیا۔ دوسرا لشکر مشرق کی سمت بڑھا اور عراق سے ہوتے ہوئے ایران' ترکستان جو کہ اس زمانے میں بہت بڑا ملک تھا' اور خراسان کی طرف پیش قدمی کرتا گیا۔ جبکہ تیسرا لشکر ذرا سا مغرب کی طرف مڑتے ہوئے شام اور فلسطین سے ہوتا ہوا صحرائے سینا سے گزر کر مصر اور پھر لیبیا

وغیرہ کو اسلام کا سایۂ رحمت عطا کرتا ہوا بحر اوقیانوس تک پہنچا۔ اس طرح پہلے تین خلفائے راشدین کے دور میں صرف ربع صدی کے دوران دریائے جیحوں سے بحر اوقیانوس تک (From Oxus to Atlantic) اور ادھر شمال میں کوہِ قاف تک' اس پورے علاقے میں انقلابِ محمدیؐ برپا ہو گیا اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہو گیا۔ یہ ہے عظمت مصطفیٰ ﷺ کے سفر کی داستان جس کے چند خدوخال میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔

عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا ظہورِ کامل ____ کب اور کیسے؟

اب آخری نکتہ جو مجھے عرض کرنا ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ کی اس عظمت کا آخری اور کامل ظہور ابھی باقی ہے۔ قرآن مجید میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تا کہ غالب کرے اس (دین حق) کو پورے کے پورے نظام زندگی پر۔''

اس موضوع پر میری کتاب ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' میں اس آیتِ مبارکہ پر ۲۴ صفحات پر مشتمل مقالہ شامل ہے۔ مذکورہ بالا آیت کی رو سے بعثتِ محمدیؐ کا مقصد غلبہ دین ہے' جبکہ بعثتِ محمدیؐ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف الفاظ میں پانچ مرتبہ آیا ہے' لیکن اس ضمن میں اہم ترین آیت یہ ہے کہ:

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا......﴾ (سبا:۲۸)

''اور ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو (اے محمد ﷺ) مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر......''

اس صُغریٰ کُبریٰ کو جوڑ لیجیے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مقصد بتمام و کمال صرف اس وقت پورا ہو گا جب کہ کُل روئے ارضی پر اور پورے عالمِ

انسانیت پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔ ورنہ ۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

احادیثِ نبویؐ میں قیامت سے قبل عالمی غلبۂ اسلام کی صریح پیشین گوئی موجود ہے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ قیامت سے قبل کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ دور لازماً آئے گا اور اُس وقت اصل میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد بتمام وکمال پورا ہوگا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی افواج نے جس طرح تین اطراف میں پیش قدمی کی تھی اس وقت اسلام کا عالمی غلبہ زیادہ دور نظر نہیں آ رہا تھا۔ شمال کی طرف جانے والی افواج نے ایشیائے کوچک میں جا کر دم لیا تھا اور مشرق ومغرب میں اس تیزی سے فتوحات ہو رہی تھیں کہ ؏ ''رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!'' کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو اس سیلِ رواں کو روک سکے' لیکن اُس وقت اسلامی انقلاب کو اندرونی طور پر سبوتاژ کیا گیا۔ عبداللہ بن سباء نامی ایک یہودی نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور اندرونی طور پر انتشار و خلفشار پیدا کر کے مسلمان کو مسلمان سے لڑا دیا۔ اسی خلفشار کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا اور اس کے بعد چار برس تک مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی جس میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور نیزوں سے قتل ہو گئے۔ اسلامی فتوحات کا سلسلہ نہ صرف رک گیا بلکہ رجعت قہقری کا شکار ہو گیا۔ لیکن اسلام کے عالمی غلبے کا یہ کام ہونا ہے جس کی خبر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی تھی۔ اور قرائن بتا رہے ہیں کہ وہ وقت اب دُور نہیں ہے۔ ہمارے شاعرِ مشرق حکیم الامت علامہ اقبال جو بڑے دور اندیش (visionary) تھے' جن کا اپنا دعویٰ ہے کہ ؏ ''گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود'' انہوں نے دلِ وجود کو چیر کر دیکھ لینے والی نگاہ سے مستقبل کے پردوں کو چیر کر دیکھا ہے کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ کیا کیف ہوگا جبکہ جامع مسجد قرطبہ کے باہر بہنے والے دریا کے کنارے علامہ نے اپنا یہ وجدان پیش کیا۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

علامہ اقبال مزید فرماتے ہیں ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

پس یہ دور تو آ کر رہے گا' لیکن یاد رکھیے کہ یہ اب بھی اسی طرح آئے گا جیسے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ﴾ کی محنت اور قربانیوں سے آیا تھا۔ وہ لوگ سراسر محروم رہ گئے جو اُس دور میں موجود تھے اور پھر بھی انہوں نے اس جدوجہد میں حصہ نہ لیا۔ وہ کفر کے دامن سے وابستہ رہے یا انہوں نے نفاق کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ لوگ انتہائی بدبخت اور محروم تھے جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کا دورِ سعادت پایا لیکن آپؐ کے دست و بازو نہ بنے۔ ان کے لیے روحانی ترفع' مقاماتِ بلند اور جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے کس قدر مواقع تھے' لیکن وہ لوگ محروم رہ گئے۔ اور جنہوں نے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۲۹) والی روش اختیار

کی وہ کامیاب ہو گئے۔ (ترجمہ آیت: ''اللہ کے رسول محمد ﷺ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں کفار پر بہت سخت اور آپس میں رحیم ہیں''۔ اور جنہوں نے کامیاب تجارت کا راستہ اختیار کیا وہ سرخرو ہو گئے' جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ (الصف: ۱۰)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میں تمہاری راہنمائی کروں ایسی تجارت کی طرف جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔''

یہ سورۂ مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو!''

اس کے بعد الفاظ آتے ہیں:

﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۴)

''کون ہیں میرے مددگار اللہ کے راستے میں؟''

تو جان لیجیے کہ اسلام کا عالمی انقلاب پکار رہا ہے اور ''مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ'' کی آواز ہم اپنے روحانی کانوں سے سن سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے حق و باطل کی آویزش کے بارے میں کہا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

حق و باطل کی جنگ ختم نہیں ہوئی' بلکہ ایک نئی شان اور ایک نئی ہیبت کے ساتھ آنے والی ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا!

اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

قرآن کے الفاظ میں ''بَاْسٌ شَدِیْدٌ'' اور حدیث نبویؐ کے الفاظ میں ''اَلْمَلْحَمَةُ الْعُظْمٰی'' عنقریب آنے والی ہے' یہ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس معرکۂ حق و باطل کے لیے ''کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہِ'' کی پکار سنائی دے رہی ہے۔ غزوۂ حنین میں رسول اللہ ﷺ نے پکارا تھا:

((اِلَیَّ یَا عِبادَ اللّٰہِ! اِلَیَّ یَا اَصْحَابَ البدر! اِلَیَّ یا اصحابَ الشَّجرۃ))(۱۰)

''میری طرف آؤ اے اللہ کے بندو! کہاں جانے والے ہو؟ اے بدر میں ساتھ دینے والو اور حدیبیہ میں بیعت علی الموت کرنے والو! میری طرف آؤ!!''

آج بھی یہ پکار بالفعل موجود ہے۔ کون ہے جو اس پکار پر لبیک کہے؟ جو اپنا تن من دھن اس کے لیے وقف کرنے کو تیار ہو؟ یہ ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارا عملی تعلق۔ یہ حُبِ رسولؐ کا تقاضا ہے۔ عید میلاد کی محفلیں اور جلوس نکالنا حُبِ رسولؐ کا تقاضا نہیں ہے۔ حُبِ رسولؐ کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے تَن مَن دَھن ایک کر دیا جائے۔ حُبِ رسولؐ کے تقاضے کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سمجھا تھا جنہوں نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔ ایک وقت میں گھر میں جھاڑو پھیر کر سارا مال حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا' اور جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا تھا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام چھوڑ آیا ہوں! اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے والے تو وہ تھے۔ محفلیں منعقد کر لینا' کھڑے ہو کر سلام پڑھ لینا یا جلوس نکال لینا حُبِ رسول نہیں ہے! حُبِ رسول تو یہ ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی جِدوجُہد میں جان' مال اور وقت کھپا دیا جائے۔ اس ضمن میں آپ میرے دو کتابچے ''حُبِ رسولؐ اور اس کے تقاضے'' اور ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کا مطالعہ کیجیے' ان میں ایک پورا پیغامِ عمل اور دعوتِ عمل موجود ہے۔

اسلام کا عالمی غلبہ اور نظامِ خلافت کا قیام ایک شدنی امر اور ایک اٹل حقیقت ہے'

---

۱۰) مسند احمد' ح ۱۳۵۶۳ (الفاظ مختلف ہیں)۔

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ہاں فرق صرف اس میں واقع ہوگا کہ کون درجاتِ عالیہ کے حصول کے سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کون اپنے آپ کو محرومین کی فہرست میں رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق دے کہ ہم اس کشاکش خیروشر اور روح وبدن کے درمیان جو معرکہ درپیش ہے' اس کا پھر ایک climax جو آنے والا ہے' اس میں حق کے سپاہی اور اللہ کے دین کے خادم بن کر قرآن حکیم کے ان الفاظ کی عملی تصویر بن جائیں:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)

''بے شک میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

اس کے لیے عزمِ مصمم اور فیصلہ کریں کہ ہمیں اسی جدوجہد میں اپنے آپ کو ہمہ تن جھونک دینا ہے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

رسولِ کاملِ صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب

۱) نبوّت ورسالت اور اس کا مقصد 63

۲) تاریخِ نبوّت 70

۳) ختمِ نبوّت اور اس کے لوازم 76

۴) حیاتِ نبویؐ قبل از آغازِ وحی 84

۵) مکّی دور — دعوت' تربیت اور تنظیم 91

۶) مکّی دور' ابتلاء کی انتہا — اور ہجرتِ مدینہ 98

۷) اندرونِ عرب انقلابِ نبویؐ کی تکمیل 105

۸) انقلابِ نبویؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز 111

۹) انقلاب دشمن طاقتوں کا خاتمہ — خلافتِ صدیقیؓ 118

۱۰) انقلابِ نبویؐ کی توسیع — خلافتِ فاروقیؓ و عثمانیؓ 125

۱۱) اُمتِ محمد ﷺ کی تاریخ کے اہم خدوخال 132

۱۲) نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں — اور
نبوی مشن کی تکمیل اور ہمارا فرض 139

پاکستان ٹیلی ویژن کے بارہ روزہ پروگرام (یکم تا بارہ ربیع الاوّل ۱۴۰۱ء)
بعنوان ''رسولِ کامل ﷺ'' میں پیش کی گئی بارہ مختصر تقاریر

(۱)

نبوّت و رسالت اور اس کا مقصد

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... اما بعد!

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿﴾ (النساء)

ناظرین کرام! آپ کو معلوم ہے کہ پندرہویں صدی ہجری کا پہلا ربیع الاوّل شروع ہو چکا ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا مہینہ ہے۔ اسی مناسبت سے آپ ﷺ کے ذکر جمیل پر مشتمل گفتگوؤں کا یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں اس سے پہلے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ کے مختلف گوشوں کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں‘ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ سمجھیں کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت کیا تھا! ہمارا ایمان ہے کہ سیّدِ وُلدِ آدم حضرت محمد ﷺ صرف ایک نبی ہی نہیں بلکہ ''خاتم النبیین'' ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں بلکہ ''آخر المرسلین'' ہیں‘ لہٰذا آپؐ کا مقصدِ بعثت یقیناً وہ بھی ہے جو تمام انبیاء و رسل کا بنیادی اور اساسی مقصدِ بعثت ہے۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ صرف ختم ہی نہیں ہوا بلکہ مکمل ہوا ہے‘ لہٰذا آپؐ کے مقصدِ بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی رنگ ہونا ضروری ہے‘ جو آپؐ کے لیے مابہ الامتیاز ہو اور تمام انبیاء اور رسولوں کی مقدس

جماعت میں آپؐ کا منفرد مقام وامتیازی مرتبہ واضح ہوجائے۔

اسلام کا پورا قصر ایمان کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور ایمان چند ایسے ماورائی حقائق کو ماننے کا نام ہے جن تک رسائی حواسِ ظاہری کے ذریعے ممکن نہیں' بلکہ ان تک رسائی کسی درجے میں صرف عقل اور وجدان کی قوتوں کو بروئے کار لاکر ہوسکتی ہے۔ اگر ان امور کو تین بڑے بڑے حصوں میں جمع کیا جائے تو وہ ایمانیاتِ ثلاثہ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یعنی ایمان باللہ یا توحید' ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد اور ایمان بالرسالت اور نبوت۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان تینوں کے مابین بڑا گہرا منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ تفصیلات کو چھوڑ کر اور فلسفیانہ اور متکلمانہ موشگافیوں سے قطع نظر اگر سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ ایمان کیا ہے! تو سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ پوری کائنات' یہ پورا سلسلہ کون و مکاں جو تاحدِ نگاہ ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے' جس کی وسعتوں کا تاحال انسان کو کوئی اندازہ نہیں' یہ نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا۔ اصطلاحاً ہم یوں کہیں گے کہ یہ حادث ہے اور فانی ہے۔ البتہ ایک ہستی ہے' ایک ذات ہے' جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ ہستی بالکل تنہا ہے' اکیلی ہے' لاشریک اور یکتا ہے۔ اس کی ذات' اس کی صفات' اس کے حقوق و اختیارات سب حد درجہ لاثانی (unique) ہیں' جن میں کوئی کسی اعتبار سے نہ ساجھی ہے نہ شریک ہے۔ اس ہستی میں تمام محاسن و کمالات بتمام و کمال موجود ہیں۔ یہ ہستی ہے جسے ہم اللہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ہے اجمالاً ایمان باللہ یا توحید۔

اس ہستی نے اس کائنات کو پیدا فرمایا۔ اس کی یہ تخلیق بے مقصد نہیں ہے' بے کار و عبث نہیں ہے' بلکہ بالحق (purposeful) ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (آل عمران:۱۹۱)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے

آنے میں ان ہوش مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے......''

یہ تخلیق بالحق ہے اور اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی 'یعنی ایک وقتِ معیّن تک کے لیے ہے۔ اسی خالق کائنات نے انسان کو تخلیق فرمایا اور انسان اس سلسلہ تخلیق کا نقطۂ عروج ہے۔ یہی انسان اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک بنا۔

اس انسان کی ایک زندگی تو وہ ہے جو وہ اس دنیا میں بسر کرتا ہے' اس دنیا میں پیدائش سے لے کر موت تک کا وقفہ' لیکن یہی اُس کی کل زندگی نہیں ہے' بلکہ انسانی زندگی ایک نہایت طویل عمل ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

یہ دنیا کی زندگی تو درحقیقت اس کی کتابِ زندگی کے صرف دیباچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس کی اصل کتابِ زندگی موت کے بعد کھلے گی۔ اس کی اُخروی زندگی ہی اصل زندگی ہے جو ابدی ہے' جو ہمیشہ کی زندگی ہے' جس میں دوام ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾﴾ (العنکبوت)

''اور اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔''

انسانی زندگی کے اس طویل سفر میں موت صرف ایک وقفہ ہے۔ بقولِ شاعر ؎

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!

اس طرح زندگی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ چنانچہ اس سے جو دُنیوی زندگی کا حصہ جداگانہ متشکّل ہوا اس کا مقصد ہے ابتلاء اور امتحان۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲)

''اس نے موت اور حیات کا یہ سلسلہ اس لیے بنایا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون ہے اچھے عمل کرنے والا۔''

اس حقیقت کو بھی علامہ اقبال نے نہایت سادہ الفاظ میں ادا فرمایا: ؎

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس زندگی کے بعد ایک موت آنے والی ہے۔ اُس موت کے بعد حشر و نشر ہے۔ جزا و سزا کے فیصلوں کا ایک دن ہے' جسے قرآن مجید ''یوم الدین'' سے تعبیر فرماتا ہے۔ اُس دن طے ہوگا کہ انسان اپنی حیاتِ دنیوی میں اپنی سعی و جہد کے اعتبار سے ناکام رہا یا کامیاب قرار پایا اور اس کے بعد وہ اپنی ابدی زندگی جنت میں بسر کرے گا یا جہنم کے شعلوں میں گزارے گا' جیسا کہ ایک خطبہ نبویؐ میں الفاظ وارد ہوئے:

((وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

''اور وہ (ابدی زندگی) جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

پھر اُس ابدی زندگی میں یا رَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ وَّجَنَّۃُ نَعِیْمٍ کے مزے ہیں یا اللہ تعالیٰ کا شدید عذاب اور اس کی سخت سزا ہے۔ ان تمام امور کو ماننے کا نام ایمان بالآخرۃ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد' ان دونوں کے ربط سے اسلام کے تصورِ زندگی کا ایک خاکہ مکمل ہوتا ہے۔ یہ گویا کہ مبدأ و معاد کا آئین ہے۔ اس کے بغیر انسان کا حال بے لنگر کے جہاز جیسا ہے جس کی کوئی سمتِ سفر متعین نہ ہو اور وہ موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ گویا ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

لیکن اللہ اور آخرت کا یہ علم انسان کی زندگی کی ابتدا اور انتہا کا تعین کرتا ہے۔ انہی دونوں (ابتدا اور انتہا) کو قرآن مجید کے ان حد درجہ جامع الفاظ میں سمو دیا گیا ہے:

﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾﴾ (البقرۃ)

''ہم اللہ ہی کے ہیں (اُسی کے پاس سے آئے ہیں) اور اُسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔''

اب یہاں ایک سوال فطری طور پر سامنے آتا ہے کہ امتحان لیا جاتا ہے کچھ سکھا کر' جانچا اور پرکھا جاتا ہے کچھ دے کر۔ تو یہ جو امتحان ہے جس سے انسان اس حیاتِ دنیوی میں دوچار ہے' آخر اس کی بنیاد اور اس کی اساس کیا ہے؟ اس کی جانچ اور پرکھ کس اصول پر ہوگی؟ اس سوال کا ایک جواب جو بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں اس ابتلاء و آزمائش کے لیے بھیجا ہے تو غیر مسلّح نہیں بھیجا' بہت سی صلاحیتوں اور استعدادات سے مسلّح کر کے بھیجا ہے۔ بڑی پیاری آیت ہے سورۃ الدھر کی:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿٢﴾﴾

''ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں (اسے جانچیں' اسے پرکھیں)' چنانچہ اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے۔''

اسے سماعت اور بصارت کی استعدادات دے کر دنیا میں بھیجا۔ مزید برآں اُس میں تعقّل و تفکّر کی صلاحیتیں رکھیں۔ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز ودیعت کی۔ جیسے کہ فرمایا گیا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ﴿٧﴾ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴿٨﴾﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفس انسانی کی' اور جو اسے بنایا اور سنوارا (اور اس کی نوک پلک درست کی)' اور اس میں نیکی اور بدی (خیر اور شر) کا علم الہامی طور پر ودیعت کر دیا۔''

اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قلبِ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی ایک دھیمی سی آنچ رکھ دی ہے۔ ان تمام چیزوں سے مسلّح ہو کر انسان اس دنیا میں آیا ہے۔ لہٰذا اُس کی اُخروی باز پرس اور آخرت میں اس کے حساب کتاب کی بنیادی اساس تو یہی ہے۔ چنانچہ ہر انسان اللہ کے سامنے مسئول' ذمہ دار (responsible) اور جواب دہ (accountable) ہے' خواہ کوئی نبی آئے ہوتے یا نہ آئے ہوتے' خواہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہوتی یا نازل نہ ہوئی ہوتی۔ ان فطری

استعدادات کی بنیاد پر جو انسان کے اندر ودیعت شدہ ہیں' ہر انسان مکلّف ہے' مسئول ہے' ذمہ دار ہے' جواب دہ ہے۔ لیکن اس پر رحمت خداوندی کا ایک تقاضا اور ہوا۔ انسان کے اس امتحان میں مزید آسانی پیدا کرنے کے لیے اللہ نے انزالِ وحی' انزالِ کتب' بعثت انبیاء اور ارسالِ رُسل کا سلسلہ جاری فرمایا جو انسان کی اپنی بنیادی استعدادات کے لیے وہ سامان لے کر آئے جن سے ان کو جلا ہو' ذہول و غفلت کے پردے اٹھ جائیں' اگر آئینۂ قلب پر کوئی زنگ آ گیا ہے تو دور ہو جائے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی مزید رحمت ہے' مزید فضل ہے۔ چنانچہ نبوت اس پہلو سے رحمت ہے۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جو سمجھ لینا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں یہ رحمت بے پناہ وسعت پذیر ہو گئی ہے اور اس نے تمام جہانوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ نبوت اصلاً رحمت ہے' لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے۔ آپؐ کی رحمت تمام جہانوں پر محیط ہو گئی۔

لیکن اسی کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے رہے' وہ یہ کہ نبیوں کی آمد' رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کے بعد اب محاسبۂ اُخروی کے لیے انسان پر اتمامِ حجت ہو گیا۔ انسان کے پاس اب کوئی عذر نہ رہا' وہ کوئی بہانہ پیش نہ کر سکے گا کہ پروردگار! ہمیں معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے' ہم نہیں جانتے تھے کہ تیری رضا کس میں ہے' ہمیں علم نہیں تھا کہ تو کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے! یہ عذر اگر کسی درجے میں قابل پذیرائی ہو سکتا تھا تو نبوت و رسالت کے بعد اب اس کا امکان قطعاً ختم ہو گیا۔ اس کو آپ قطعِ عذر سے تعبیر کریں یا اتمامِ حجت کا نام دیں۔ بعثت انبیاء اور ارسالِ رُسل سے ایمان بالآخرت کے ضمن میں انسان کی ذمہ داری اور اُس کی مسئولیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ یہی ہے وہ بات جو اس آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوئی ہے جسے آغازِ کلام میں تلاوت کیا گیا تھا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾﴾ (النساء)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا بشارت دینے والے بنا کر اور خبردار کرنے والے

بنا کر۔ اہلِ حق کے لیے‘ طالبینِ ہدایت کے لیے‘ صحیح راہ پر چلنے والوں کے لیے وہ مبشّر ہیں‘ بشارت دینے والے ہیں کہ ان کے لیے جنت نعیم میں نہایت روشن مستقبل منتظر ہے۔ اور اہلِ زیغ کے لیے‘ کجروی اختیار کرنے والوں کے لیے‘ گمراہی کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے وہ خبردار (warn) کر دینے والے ہیں‘ تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابل‘ اللہ کے ہاں کوئی حجت باقی نہ رہ جائے‘ رسولوں کے بعد وہ کوئی عذر پیش نہ کر سکیں‘ محاسبۂ اُخروی کے وقت کوئی بہانے نہ بنا سکیں۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۝﴾۔ اللہ زبردست ہے۔ وہ جس طرح چاہے حساب لے‘ اس کا اختیار مطلق ہے‘ کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔ لیکن وہ حکیم بھی ہے‘ اس نے اپنی اس بازپُرس کے لیے ایک نہایت حکمت بھرا نظام تجویز فرمایا ہے۔ اور یہی ہے وہ نظام جس کی اہم ترین کڑی ہے سلسلۂ نبوت و رسالت۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝

(۲)

تاریخِ نبوّت

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ (المؤمن:۷۸)

ازروئے قرآن حکیم صفحۂ ارضی پر قافلۂ انسانیت اور قافلۂ نبوت و رسالت نے ایک ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ یعنی پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پہلے نبی بھی تھے' اور آدمِ ثانی حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول تھے۔ اس کے بعد قافلۂ آدمیت اور قافلۂ نبوت و رسالت ساتھ ساتھ سفر جاری رکھتے رہے۔ ایک طرف مادّی ارتقاء کا عمل جاری رہا' وسائل و ذرائع میں ترقی ہوتی چلی گئی' انسان کے مادی علوم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تو ساتھ ساتھ ہدایتِ آسمانی' ہدایتِ ربانی بھی ارتقائی مراحل طے کرتی چلی گئی' تا آنکہ نبوت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ میں اور بالآخر اختتام کو پہنچ گئی محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مقدس میں' اور رسالت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں اور پھر آپؐ ہی کی شخصیت میں وہ قیامت تک کے لیے قائم و دائم ہوگئی۔

اگرچہ ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں جان سکتے کہ اس دنیا میں کل کتنے رسول آئے' لیکن بطورِ اصول یہ بات قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ واضح کر دی گئی کہ انبیاء و رسل صرف وہی نہیں ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہے۔ چنانچہ آغاز میں سورۃ المؤمن کی جس آیت مبارکہ کے ابتدائی حصے کی تلاوت کی گئی تھی' اس کا ترجمہ یہ ہے:

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں' جن میں سے وہ بھی ہیں جن کے حالات ہم نے آپ کو بتا دیے اور ایسے بھی بہت سے رسول ہیں کہ جن کے حالات ہم نے آپ کو نہیں بتائے۔"

یہی مضمون سورۃ النساء میں بھی بیان ہوا ہے۔ بعض روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے

کہ انبیاء کی تعداد سوا لاکھ ہے اور اُن میں سے جو رسول بھی تھے اُن کی تعداد ۳۱۳ ہے۔

نبوت و رسالت میں کیا فرق ہے اور اُن کے مابہ الامتیاز امور کون کون سے ہیں! ان میں محققین کے نزدیک کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے‘ لیکن ایک بات پر اجماع ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص‘ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہے‘ لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ خالص فنی اصطلاحات اور اُن کے مباحث سے ہٹ کر سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ایک ذاتی مرتبہ ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں ایک cadre ہے سی ایس پی‘ لیکن پھر کسی سی ایس پی کی تقرری (appointment) ہے۔ وہ کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا کسی وزارت میں سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوتا ہے۔ یہ اُس کا منصب ہے۔ اسی طرح نبوت ایک ذاتی مرتبہ و مقام ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ چنانچہ کسی رسول کو فائز کیا جاتا ہے متعین طور پر کسی شہر‘ یا ملک یا قوم کی طرف مبعوث فرما کر۔

قرآن مجید میں بہت سے انبیاء کا بھی ذکر ہے اور بہت سے رسولوں کا بھی۔ ان میں سے چھ رسولوں کا ذکر قرآن مجید بار بار کرتا ہے‘ اس اعتبار سے کہ جن قوموں کی طرف وہ بھیجے گئے انہوں نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور اس کی پاداش میں اُن پر دنیا ہی میں عذابِ استیصال یعنی جڑ کاٹ دینے والا عذاب نازل کیا گیا اور ان کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ بمصداق آیت قرآنی: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۭ﴾ (الانعام: ۴۵) ”پس جڑ کاٹ دی گئی اُس قوم کی جس نے ظلم کیا“۔ یعنی رسول کا انکار کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی‘ اس کو نسیاً منسیاً کر دیا گیا‘ جیسے کہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہو کہ اس کو آگ لگا کر ختم کر دیا جائے۔

یہ رسول جن کا ذکر سورۃ الاعراف‘ سورۂ ہود‘ سورۃ الشعراء‘ سورۃ المؤمنون اور دیگر متعدد سورتوں میں بار بار آیا ہے‘ یہ ہیں حضرت نوح‘ حضرت ہود‘ حضرت صالح‘ حضرت لوط‘ حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ان میں بڑی عجیب تقسیم یہ نظر آتی ہے کہ تین رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ ماقبل سے تعلق رکھتے ہیں اور تین

کو زمانہ مابعد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ حضرت لوط علیہ السلام‘ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر ہیں‘ لیکن چونکہ ان کے بھتیجے ہیں‘ اُن سے چھوٹے ہیں‘ لہٰذا اس تقسیم میں انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے بعد شمار کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ انبیاء اور رسل کی تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ایک مرکزی شخصیت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ اُن کی تین نسبتیں ہیں اور تینوں نہایت بلند ہیں۔ ایک جانب وہ خلیل اللہ ہیں‘ دوسری طرف وہ ابوالانبیاء ہیں‘ اُن کی نسل سے سینکڑوں انبیاء اور رسول اٹھے یہاں تک کہ ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی کی نسل سے ہیں‘ پھر قرآن مجید امامۃ الناس کا منصب بھی اُن کے لیے قرار دیتا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۲٤) ۔

”اور جس وقت آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں (آزمائشوں) کے ساتھ‘ پس اس نے ان سب کو پورا کیا۔ (اللہ نے) فرمایا (اے ابراہیمؑ) تحقیق میں تم کو سب لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔“

لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں‘ ابوالانبیاء ہیں اور امام الناس ہیں۔ یہ تینوں نسبتیں نہایت عظیم ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مرتبۂ نبوت کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بلند مقام پر فائز ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تشریف لانے والے جن تین رسولوں کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے ان کے حالات کو اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے ضمن میں صرف ایک ہی جرم کا ذکر ملتا ہے‘ ان کی قوموں کی ایک ہی گمراہی ہے جس پر انہوں نے نکیر کی‘ جس پر انہوں نے روک ٹوک کی‘ جس سے باز آنے کی انہوں نے دعوت دی اور وہ شرک کا جرم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور تمدنی‘ سماجی یا کسی اور طرح کی بے راہ روی کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح‘ قومِ ہود اور قومِ صالح کے زمانے تک ابھی انسانی تمدن اپنے ابتدائی مراحل (stages) میں تھا‘ جس میں گمراہی بس ایک

شرک ہی کی صورت میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی اور اس کے متعلقات اور دوسرے پہلو ابھی کسی نہ کسی حد تک فطرت کے قریب تر واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح' حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کی دعوت میں ایک ہی نکتہ نظر آتا ہے:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ (هود: ٨٤)

''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو (اس کی بندگی اور پرستش میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ' اس لیے کہ حقیقتاً) اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔''

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جن تین رسولوں کا ذکر آتا ہے ان کی قوموں میں ہمیں نظر آتا ہے کہ تہذیب وتمدن اور انسان کی حیاتِ اجتماعی کے مختلف گوشوں میں گمراہی کی وہ صورتیں ظاہر ہوئیں جو اگرچہ اُسی شجرۂ خبیثہ کے برگ وبار ہیں' یعنی شرک ہی کے یہ نتائج اور لوازم ہیں' لیکن یہ کہ بالفعل ان کا ظہور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بعد ہو رہا ہے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں ہمیں جنسی بے راہ روی (sexual perversion) نظر آتی ہے جو سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے والی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسان کی معاشرت اور اُس کا معاشرتی نظام درحقیقت عورت اور مرد کے تعلقات کے صحیح بنیادوں پر استوار ہونے سے ہی برقرار رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں قرآن جو ذکر کرتا ہے تو اُس میں اُن کے ہاں معاشی بے راہ روی نظر آتی ہے۔ اس قوم میں ناپ تول میں کمی ہونے لگی' دھوکہ فریب شروع ہو گیا' لوگوں کے مال ناجائز طور پر ہڑپ کیے جانے لگے' راہ زنی ہونے لگی۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت قرآن مجید میں بیان ہوتی ہے تو اُس میں نہایت نمایاں پہلو یہ ہے کہ لوگو! ایک اللہ کی بندگی اور اُس کی پرستش کرو اور لوگوں کے اموال پر ڈاکہ زنی نہ کرو' اُن کے حقوق نہ مارو' ناپنے اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

﴿وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ......﴾ (هود: ٨٥)

''اور میری قوم کے لوگو! پورا کرو ماپ کو اور تول کو انصاف کے ساتھ' اور کمی نہ کرو لوگوں کی چیزوں میں......''

اس سے آگے بڑھ کر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جا رہا ہے آلِ فرعون کی طرف۔ اور یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی جبر و استبداد کی ایک بہت نمایاں مثال سامنے آتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر اس طرح مسلط ہو گئی ہے کہ اُس نے اس کو بالفعل اپنا غلام بنا کر رکھ لیا ہے۔ اُن سے بالجبر کام لیا جا رہا ہے' اُن پر اس درجہ ظلم روا رکھا جا رہا ہے کہ اُن کی اولادِ نرینہ ہلاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سامنے آتے ہیں اور اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں: ﴿اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ﴾ ''بنی اسرائیل کو (جسے تم نے جبر اور ظلم کے شکنجے میں کسا ہوا ہے) ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دو۔''

یہ تین رسول جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دنیا میں' خاص طور پر دنیا کے اس خطے میں آئے جو کہ عرب کے آس پاس تھا' جس کی تاریخ سے اہل عرب واقف تھے جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو رہی ہے' اُن کے حالات میں گویا انسانی اجتماعیت جس جس پہلو سے فساد کا شکار ہو سکتی ہے ان کی نشاندہی کر دی گئی۔ اس کے بعد ایک اُمت کی تاریخ شروع ہوتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے۔ بنی اسرائیل کی حیثیت ایک اُمتِ مُسلمہ کی ہے جو کتابِ الٰہی کی حامل اور شریعت خداوندی کی امین تھی' جس نے اللہ کے ساتھ ایک عہد و میثاق کیا تھا۔ اُس کی تاریخ قرآن مجید بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں پے بہ پے انبیاء آتے رہے اور ایک مصلح کی حیثیت سے اُن میں ایک تجدیدی کارنامہ سرانجام دیتے رہے۔ جب کبھی اُن کے اندر ایمانی جذبات سرد پڑنے شروع ہوئے یا اُن کے اعمال و اخلاق کے اندر کجی راہ پانے لگی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت و رسالت نے انہیں سہارا دیا۔ اس سلسلۂ انبیاءِ بنی اسرائیل کے خاتم ہیں حضرت مسیح علیہ السلام' اس سلسلے کے آخری رسول' جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر سامنے آئے۔ اور اُن کے بعد چھ سو برس کا عرصہ فترتِ اولیٰ کا زمانہ کہلاتا ہے جو تمہید ہے دراصل ختمِ نبوت اور اتمامِ رسالت کی۔ یہ چھ سو سال تاریخِ انسانی میں اس اعتبار سے پہلی مرتبہ ایک وقفہ ہے کہ جس کے دوران پورے کرۂ ارضی پر کوئی رسول اور نبی نہیں تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اب نبوتِ محمدی ﷺ کا خورشید ہدایت طلوع ہوا' جن پر نبوت ختم اور رسالت کی تکمیل ہوئی۔ اس فترتِ اولیٰ کا عرصہ لگ بھگ ۵۷۱ برس ہے' اس لیے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت سن عیسوی کے حساب سے ۵۷۱ء میں ہوئی اور آپؐ پر آغازِ وحی ۶۱۰ء میں ہوا۔ اس طرح یہ چھ سو سال ہیں جن کے دوران یہ فترتِ اولیٰ ہمیں نظر آتی ہے' جو تمہید ہے مستقل فترت کی جس میں نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ آنحضور ﷺ پر نبوت صرف ختم ہی نہیں ہوئی بلکہ مکمل بھی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ختم نبوت پر تو ہمارے ہاں کافی زور ہے' اپنی جگہ یہ ایک واقعہ ہے' حقیقت ہے اور اس کی ایک قانونی اہمیت بھی ہے' جس کی وجہ سے یہ مسئلہ زیادہ نمایاں ہوا ہے' لیکن اگر غور کیا جائے تو آنحضور ﷺ کی فضیلت کی بنیاد ختمِ نبوت نہیں' بلکہ تکمیلِ نبوت و رسالت ہے۔ ذرا وہ آیۂ مبارکہ ملاحظہ کیجیے جو سورۃ المائدۃ میں وارد ہوئی ہے:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (آیت ۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے' اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے' اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔''

اس پر یہودیوں نے بجا طور پر بصد حسرت مسلمانوں سے کہا تھا کہ اے مسلمانو! یہ عظیم آیت جو تمہیں عطا ہوئی ہے اگر کہیں ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنی سالانہ عید بنا لیتے۔

یہ ہے وہ مقام کہ جہاں نبی اکرم ﷺ رسولِ کامل کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں' جن پر رسالت صرف ختم ہی نہیں ہوئی بلکہ مکمل ہو گئی ہے' جن پر نبوت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اِتمام ہوا ہے۔ اس اِتمامِ نبوت اور اکمالِ رسالت کے مظہر کیا ہیں! ان پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہو گی۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ○

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○○

(۳)

ختمِ نبوّت اور اس کے لوازم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۲۸﴾ (الفتح)

یہ آیۂ مبارکہ سورۃ الفتح میں وارد ہوئی ہے۔ اس کا جزوِ اعظم دو اور سورتوں یعنی سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصف میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ؕ﴾

قرآن حکیم میں تین مقامات پر ایک مضمون کا دہرایا جانا یقیناً ان الفاظ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ہے' یعنی یہ وہ مرکزی خیال ہے جس کے گرد قرآن حکیم کے تمام مضامین گھومتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ذرا غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں تو یقیناً یہ الفاظِ مبارکہ ''کلید'' کا درجہ رکھتے ہیں' کیونکہ انہی کے فہم پر دار و مدار ہے اس کا کہ ہم اس بات کو سمجھ سکیں کہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی مقدس جماعت میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا امتیازی مقام کیا ہے! اس لیے کہ یہ الفاظ آنحضور ﷺ کے لیے تو قرآن کریم میں تین بار آئے ہیں' لیکن کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے نہ صرف یہ الفاظ بلکہ اس کے قریب المفہوم الفاظ بھی پورے قرآن حکیم میں کہیں وارد نہیں ہوئے۔ ذرا ان الفاظ پر توجہ کو مرتکز کیجیے' ان کا ترجمہ یہ ہے:

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ کے ساتھ اور دین حق دے کر' تاکہ غالب کر دے اس کو پورے کے پورے دین پر' اور کافی ہے اللہ بطور گواہ۔''

ان الفاظِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان سامنے آتی ہے۔ اس آیت کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے! اس آیت میں آنحضور ﷺ کے لیے لفظ ''رَسُوْلَهٗ'' وارد ہوا ہے۔ اس سے اشارہ ہوتا ہے اس بات کی طرف کہ بقیہ انبیاء و رسل ؑ کی نسبتیں اور اُن کی امتیازی حیثیتیں کچھ دوسری ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام صَفِیّ اللہ ہیں' حضرت نوح علیہ السلام نجیّ اللہ ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں' حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ ہیں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ ہیں' لیکن حضرت محمد ﷺ رسول اللہ ہیں۔ گویا منصبِ رسالت جس مقدس ہستی پر اپنے نقطہ عروج اور نقطہ کمال کو پہنچا ہے وہ ہے ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ سے پہلے تمام انبیاء و رسل ؑ کی بعثت صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف ہوئی۔ سب کی دعوت قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے' لیکن اُن کا خطاب ہمیشہ ایک ہی رہا:

﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ﴾ (هود:٨٤)

''اے میری قوم کے لوگو! بندگی اور پرستش اختیار کرو اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔''

پس معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ سے قبل تمام انبیاء و رسل ؑ کی بعثت ان کی اپنی اپنی قوموں کی طرف ہوئی تھی۔ اس مقدس جماعت میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ وہ پہلے اور آخری نبی اور رسول ہیں جن کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے' بحیثیت نوعِ انسانی۔ چنانچہ قرآن مجید میں آنحضور ﷺ کی دعوت کے ضمن میں بار بار الفاظ آئیں گے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ ''اے لوگو!''

قرآن مجید میں جب آپ ﷺ کی دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو آفاقی انداز سے ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ......﴾

''اے بنی نوعِ انسان! اپنے ربّ کی بندگی اور پرستش کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے......''

((اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً))

''(اے قریش!) میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم۔''

یہ الفاظ آپ ﷺ کے ایک خطبے میں وارد ہوئے ہیں جس کو نھج البلاغۃ کے مؤلف نے نقل کیا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا......﴾ (سبا:۲۸)

''(اے محمد ﷺ) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر و نذیر بنا کر......''

اور یہی مفہوم ہے اس آیت مبارکہ کا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء)

''اور (اے محمد ﷺ!) نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر جہانوں کے لیے رحمت بنا کر۔''

پس جان لیجیے کہ یہ خصوصیت صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی جانب ہے۔ اور یہ اصل میں اس لیے ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے واقعتاً دنیا میں ذرائع رسل و رسائل (means of communication) ایسے نہ تھے کہ کسی ایک نبی یا رسول کی دعوت پر پوری نوعِ انسانی کو جمع کیا جا سکتا۔ اس میدان میں مادی وسائل و ذرائع کے سلسلے میں جو ارتقاء ہوا ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اب اُس رسالت کاملہ کا ظہور ہو جس کی دعوت پوری نوعِ انسانی کے لیے بیک وقت ہو اور جو مبعوث ہو اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ' تمام انسانوں کی جانب' خواہ وہ افریقہ کے سیاہ فام لوگ ہوں' خواہ یورپ کے سرخ رو لوگ ہوں' یا مشرق کے زرد رو لوگ ہوں۔ آیت زیر مطالعہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ہُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْہُدٰی ......﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ کے ساتھ......''

''اَلْہُدٰی'' سے یہاں مراد قرآن حکیم ہے۔ یہ پہلی چیز ہے جو حضور ﷺ لے کر مبعوث ہوئے جو ہدایتِ کاملہ و تامہ ہے' جو ھُدًی لِّلنَّاسِ ہے' ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے' شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔

اس ضمن میں بھی ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ تورات بھی اللہ کی کتاب تھی‘ انجیل بھی اللہ کی کتاب تھی‘ حضرت داؤدؑ کو زبور بھی اللہ ہی نے عطا فرمائی تھی‘ بلکہ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی صحیفے عطا فرمائے گئے تھے‘ دیگر انبیاء ورسل کو بھی صحیفے دیے گئے ہوں گے‘ لیکن ان میں سے کسی کی حفاظت کا ذِمّہ اللہ نے نہیں لیا تھا۔ ان میں سے بعض کتابیں تو دنیا سے ناپید ہو گئیں۔ صحفِ ابراہیمؑ کا کہیں کوئی وجود نہیں‘ اور بعض کتابیں جو موجود ہیں ان کے بارے میں اُن کے ماننے والے بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی اصل صورت میں موجود ہیں‘ نہ ہی وہ اس زبان میں ہیں جن میں وہ اصلاً نازل ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کو ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں محرف ہیں —— لیکن قرآن مجید کی حفاظت کا اللہ نے خود ذمہ لیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کو بصراحت بیان کر دیا گیا:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ⑨﴾ (الحجر)

’’ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

تمام ائمہ اُمت اور تمام جمہور مسلمین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیت مبارکہ میں ’’ذکر‘‘ سے مراد ’قرآن حکیم‘ ہے۔ خود قرآن ہی میں اس کا ایک نام ’’ذکریٰ‘‘ بھی بیان ہوا ہے۔ اس کی وجہ بھی سمجھ لیجیے۔ سابقہ کتابیں درحقیقت اسی کتاب ہدایت کے ابتدائی ایڈیشن تھے جس کتاب ہدایت کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن حکیم ہے۔ جس طرح انسان کے مادی ذرائع و وسائل نے ارتقائی مراحل طے کیے اسی طرح انسان کے ذہن اور شعور کا معاملہ بھی ارتقاء پذیر رہا۔ انسان جب اپنے عقلی بلوغ کو پہنچا‘ اپنی عقلی‘ ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے پختہ (mature) ہوا تو یہ وہ وقت تھا کہ اب اسے ہدایت کاملہ و تامہ یعنی ابدی ہدایت مکمل طور پر دے دی جائے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کی کتابیں ابدی نہ تھیں‘ وہ ہمیشہ کے لیے نازل ہی نہیں ہوئی تھیں‘ اس لیے ان کی حفاظت مشیتِ الٰہی میں تھی ہی نہیں۔ اگر ہوتی تو نہ یہ گم

ہوتیں اور نہ ہی ان میں تحریف ہو سکتی۔ ہمیشہ کے لیے ہدایت' آخری ہدایتِ کاملہ وتامہ وہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ اس ہدایت نامے کو تا قیامِ قیامت نافذ العمل رہنا تھا' لہٰذا اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا۔

دوسری چیز جو حضور ﷺ لے کر آئے یا دے کر بھیجے گئے وہ دین حق ہے' وہ ایک نظامِ اجتماعی ہے۔ ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی' جس میں سب کے حقوق و فرائض کا ایک نہایت معتدل اور متوازن نظام موجود ہے' جس میں کوئی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرسکتا۔ یہ وہ میزان ہے جس میں سب کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا گیا ہے۔ اس میزان سے تول کر ملے گا جس کو جو کچھ ملے گا۔ قسط' عدل اور انصاف سے ہر فرد کو' ہر شخص کو اس کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی ملیں گی۔

غور کیجیے کہ ایک نظامِ اجتماعی اس دور کے انسان کی اصل ضرورت ہے۔ ایک نظامِ عدل کی پوری نوعِ انسانی احتیاج رکھتی ہے۔ جہاں تک انفرادی اخلاقیات کا تعلق ہے سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام بھی اس لحاظ سے بہت بلندیوں تک پہنچ چکے تھے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ذاتی اور نجی اخلاق کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام بھی بہت بلند مقام پر پہنچ چکے تھے' لیکن جس دور کے فاتح ہیں حضرت محمد ﷺ اس دور میں انسانی اجتماعیت بھی ارتقائی مراحل طے کر کے اس مقام تک آ چکی ہے کہ اجتماعیت کا پلہ انفرادیت پر کافی بھاری ہو چکا ہے۔ انفرادیت اجتماعیت کے شکنجے میں کسی جا چکی ہے اور اب اجتماعیت کی گرفت انتہائی مضبوط ہے۔ اب ایک ایسے نظامِ اجتماعی کی ضرورت ہے جس میں انفرادی سیرت و اخلاق کے ساتھ ساتھ ایک صالح معاشرہ بھی موجود ہو' یعنی پوری اجتماعیت بھی صالح ہو۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ ابتداءً قبائلی نظام کے تحت قبیلہ ہی ایک مکمل اجتماعی یونٹ بن گیا تھا۔ سیاسی اعتبار سے بھی' سماجی اعتبار سے بھی' اور معاشی اعتبار سے بھی۔ پھر ذرا انسان نے ترقی کی' تمدن نے ارتقاء کا مرحلہ طے کیا تو شہری ریاستیں قائم ہوئیں۔ اس کے بعد انسان نے اور قدم آگے بڑھایا تو بڑی بڑی بادشاہتیں (Empires)' بڑی بڑی مملکتیں قائم ہوئیں اور بڑی بڑی سلطنتوں کا دور آیا — یہ وہ

دور ہے جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو رہی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ وہ نظام لے کر آئے جو انسانوں کے مابین عدل اور قسط کی ضمانت دے‘ جس میں کوئی طبقہ دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کر رہا ہو‘ جس میں نہ فرد جماعت کے بوجھ تلے سسک رہا ہو‘ نہ جماعت اور اُس کے تقاضے انفرادیت پسندی کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں۔ ایسا نظام عدل و قسط صرف دین حق ہے‘ جو خالق کائنات کی جانب سے بواسطہ اپنے آخری رسولؐ نوعِ انسانی کو دیا گیا۔ اسی کو قرآن ’’دین الحق‘‘ کہتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ ایک بہتر نظام‘ نہایت عادلانہ نظام‘ نہایت منصفانہ نظام اگر صرف کسی کتاب کی زینت ہو‘ کسی کتاب کے اوراق میں لکھا ہوا موجود ہو تو وہ نوعِ انسانی کے لیے حجت اور دلیل نہیں بن سکتا۔ کوئی بھی نظام لوگوں کے لیے حجت‘ دلیل اور قاطع عذر حقیقی معنوں میں اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کو قائم کر کے اور چلا کر دکھا نہ دیا جائے‘ اور اس کی برکات وحسنات کا انسان عملی طور پر تجربہ نہ کر لے۔

آپ کے علم میں ہے کہ افلاطون نے بھی ایک بہت اعلیٰ کتاب Republic لکھی جس میں اُس نے نظری اعتبار سے بہت عمدہ نظام تجویز کیا‘ لیکن یہ پوری دنیا کو معلوم ہے کہ وہ نظام کبھی ایک دن کے لیے بھی‘ دنیا میں کسی ایک مقام پر بھی قائم نہیں ہوا۔ چنانچہ اس کی حیثیت ایک خیالی جنت (Utopia) کی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو ناممکن العمل ہے۔ اس کے برعکس محمدؐ رسول اللہ ﷺ جو نظام لے کر آئے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے‘ وہ ایک طرف اخلاقی تعلیم کا حسین ترین مرقع ہے تو دوسری طرف اجتماعی زندگی سے متعلق نہایت اعلیٰ و ارفع‘ معتدل و متوازن اور منصفانہ نظام کا حامل ہے۔

سورۃ الشوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا:

﴿قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۵)

’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے‘ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین نظامِ عدل قائم کروں۔‘‘

اس آیت کی رو سے نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت یہ قرار پایا کہ آپ ﷺ اس نظامِ عدل و قسط کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کریں‘ قائم کریں‘ نافذ کریں جو اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا۔ چنانچہ دین حق کے غلبے کے لیے ہمیں سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ایک عظیم انقلابی جدوجہد نظر آتی ہے۔ ایک مکمل انقلاب بلکہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو محمد عربی ﷺ نے برپا کیا‘ اور ایک مکمل انقلابی جدوجہد کا خاکہ ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تیئیس (۲۳) برس میں نظر آتا ہے — بلکہ شمسی ماہ و سال کے لحاظ سے یہ عرصہ ساڑھے اکیس برس بنتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس مختصر عرصے میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا‘ اور اُس دین حق کو عملاً دنیا میں نافذ کر کے اُس کا ایک نمونہ نوعِ انسانی کے لیے پیش کر دیا۔

چوتھی چیز جو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے‘ وہ یہ کہ آپ ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں قدم قدم پر مشکلات و مصائب اور موانع ہیں۔ یہ جدوجہد نبی اکرم ﷺ نے خالص انسانی سطح پر کر کے دکھائی ہے۔ آپ ﷺ نے وہ ساری تکلیفیں جھیلی ہیں جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں کسی بھی داعیٔ انقلاب کو اور انقلابی کارکنوں کو جھیلنی پڑتی ہیں۔ وہ تمام شدائد‘ وہ تمام موانع‘ وہ تمام مشکلات‘ وہ تمام آزمائشیں‘ وہ تمام مصائب اور تکالیف جو کسی بھی انقلاب کے عَلَم برداروں اور کسی بھی انقلاب کے کارکنوں کو جھیلنی پڑتی ہیں وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس جھیلی ہیں۔ اس کا بھی ایک سبب ہے جو پیش نظر رہنا چاہیے۔ یہ انقلاب صرف عرب کے لیے نہیں تھا بلکہ پوری نوعِ انسانی اور پورے عالمِ ارضی کے لیے تھا۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اُس کی تکمیل فرما دی اور اُس کے بعد عالمی سطح پر اس کی تکمیل کا فریضہ اُمت کے حوالے کر کے آپ ﷺ نے اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی کہتے ہوئے رفیق اعلیٰ جل شانہ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔

ظاہر ہے کہ بعد میں اس انقلاب کی تکمیل جن لوگوں کو کرنی تھی انہیں خالص انسانی اور بشری سطح پر اس فرضِ منصبی کو ادا کرنا تھا۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ محبوبِ ربّ العالمین ہیں‘ اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ

قَدِیْرٌ ہے وہ چاہتا تو اپنے محبوب کے پاؤں میں کانٹا تک نہ چبھنے دیتا اور آپؐ کا فرضِ منصبی بھی مکمل ہو جاتا — لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوا۔ آنحضور ﷺ نے ساری مصیبتیں جھیل کر، ساری تکلیفیں برداشت کر کے دین کو بالفعل قائم و نافذ فرما کر اُمت پر ہمیشہ کے لیے ایک حجت قائم کر دی ہے کہ اللہ کے اس دینِ حق کو اب اُمت نے غالب اور نافذ کرنا ہے، اور اس راہ کی تمام مصیبتیں جھیل کر، تمام قربانیاں دے کر، تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہو کر اب یہی کام اُمت نے کرنا ہے۔ اب یہ فرض مسلمانوں نے انجام دینا ہے۔ جب محبوب ربّ العالمین، سرورِ دو عالم ﷺ نے مصیبتیں اٹھا کر خالص انسانی سطح پر یہ کام انجام دیا ہے، تو مسلمانوں کو بھی اس کے لیے تیار رہنا ضروری ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے جو اپنی جگہ صد فیصد درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں تمام انبیاء و رسل کے اوصاف اور محاسن جمع ہیں۔ بقول شاعر ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

لیکن ساتھ ہی وہ بات بھی پیشِ نظر رہے جو آنحضور ﷺ نے فرمائی کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے جتنی تکلیفیں برداشت کیں میں نے تنہا وہ سب کی سب برداشت کی ہیں۔

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی وَّاٰلِہٖ وَاَصحَابِہٖ وَسَلِّمْ تَسلِیمًا کَثِیْرًا ۝

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝۝

(۴)

حیاتِ نبویؐ قبل از آغازِ وحی

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸ (الضحیٰ)

انبیاء و رسل کے عمومی مقصدِ بعثت' تاریخ نبوت و رسالت اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان کے بارے میں اجمالی گفتگو کے بعد اب آیئے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا وہ دور جو پیدائش سے لے کر آغازِ وحی تک ہے اُس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس مستند اور مصدقہ معلومات بہت کم ہیں۔ البتہ اس ضمن میں اگر قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے اور سورۃ الضحیٰ کی متذکرہ بالا تین آیات کو اپنے ذہن میں عنوانات کے طور پر تجویز کر لیا جائے تو حیاتِ طیبہ قبل از آغاز وحی کے بارے میں جو بھی باتیں مصدقہ معلومات کی بنیاد پر ہمارے پاس ہیں وہ تمام باتیں اور معلومات ان تین آیات کے ذیل میں بڑی خوبی کے ساتھ انہی کی شرح و تفسیر کی حیثیت سے تین عنوانات کے طور پر شامل ہو جائیں گی۔

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کی تاریخ کا تعلق ہے محتاط ترین اندازوں کے مطابق آپؐ ۹ ربیع الاول عام الفیل کو پیدا ہوئے جو انگریزی تقویم کے مطابق اغلباً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء بنتی ہے۔ یہاں سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ابتدائی دور شروع ہوتا ہے جو دراصل ﴿اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸﴾ کی مکمل تفسیر ہے۔

آپ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو اس حال میں کہ والد ماجد عبداللہ کا انتقال آپ کی ولادتِ باسعادت سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ چھ سال تک والدہ ماجدہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کا سایہ بھی آپؐ سے اٹھا لیا۔ نتیجتاً آپ ﷺ اپنے دادا عبدالمطلب کے زیرِ کفالت اور زیرِ تربیت آئے' لیکن دو ہی سال بعد یتیمی کا ایک اور داغ آپؐ کو دیکھنا پڑا اور انتہائی محبت اور شفقت کرنے والے دادا کی شفقت و محبت کا سایہ بھی آپؐ سے اٹھا لیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپؐ اپنے بڑے تایا زبیر بن عبدالمطلب کے زیرِ کفالت رہے۔ اور پھر اپنے دوسرے چچا ابوطالب کے زیرِ سرپرستی آپؐ نے اس حیاتِ دنیوی کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ آپؐ نے ابتدائی دور میں شبانی (گلہ بانی) کا وہ فریضہ بھی سرانجام دیا ہے جو غالباً تمام انبیاء ورسل کا ایک مشترک وصف رہا ہے' جس کے بارے میں علامہ اقبال نے نہایت خوبصورتی سے کہا ہے۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!

آپ ﷺ نے گلہ بانی کی۔ اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ عرب کے لق ودق صحرا میں' ایک ایسی فضا میں جہاں دور دور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا ہو' اوپر آسمان کا سایہ' نیچے پھیلی ہوئی زمین' اِدھر اُدھر پہاڑ۔ یہ درحقیقت فطرت سے قریب ترین ہونے کی ایک کیفیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا ابتدائی دور اس کیفیت میں بسر کیا ہے' گویا کتابِ فطرت کا مطالعہ دل کھول کر کیا۔ جس کی طرف ایک اشارہ ہے قرآن مجید کے آخری پارے کی سورۂ مبارکہ میں:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾
وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾﴾ (الغاشیة)

''کیا یہ دیکھتے نہیں اُونٹ کی تخلیق کو کہ اس میں کیسی کیسی نشانیاں مضمر ہیں اللہ کی حکمت اور قدرت کی! انہیں اندازہ نہیں کہ آسمان کی رفعت کیا اشارے کر رہی

ہے! کیا پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جما دیے گئے ہیں! کیا یہ غور نہیں کرتے کہ زمین کی وسعت کس بات کی گواہی دے رہی ہے!'' (مفہوم)

یہ ہے وہ کتابِ فطرت جس کے مطالعے سے انسان اپنے فاطر کے قریب ترین آتا ہے۔ اور اُس کے بھرپور مواقع محمد رسول اللہ ﷺ کو بالکل ابتدائی زندگی میں میسر آئے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے کاروبار شروع فرمایا۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی خانقاہ میں تربیت حاصل نہیں کی' کسی گوشے میں بیٹھ کر کوئی نفسیاتی ریاضتیں کر کے تزکیۂ نفس نہیں کیا۔ آپؐ زندگی کے عین منجدھار میں رہے' آپؐ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ آپؐ نے اپنے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار کیا اور اس کاروبار میں لوگوں نے آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی سیرت و کردار کا لوہا تسلیم کیا۔ آپؐ کے حسنِ معاملہ اور دیانت و امانت کی وجہ سے آپؐ کو ''الصادق'' اور ''الامین'' کا خطاب آپؐ کے معاشرے نے دیا۔ تو یہ خطابات ایسے ہی نہیں مل گئے' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپؐ کے کردار کا لوہا لوگوں نے اگر واقعتاً مانا ہے تو اپنے تجربات کی بنیاد پر مانا ہے۔ سنن ابی داؤد میں ایک صحابی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ آغازِ وحی سے قبل کسی کاروباری معاملہ میں میری اور محمد ﷺ کی کچھ گفتگو ہو رہی تھی' اچانک مجھے کوئی کام یاد آیا اور میں حضور ﷺ سے اجازت لے کر چلا گیا کہ ذرا آپ انتظار فرمائیں' میں ابھی آیا۔ حضور ﷺ نے وعدہ فرما لیا کہ اچھا میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں کہیں گیا اور جا کر کچھ ایسا مصروفیات میں گم ہوا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہی نہ رہا۔ تین دن بعد اچانک یہ خیال آیا کہ میں نے تو محمد ﷺ سے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ میں گھبرایا ہوا اُس جگہ پر پہنچا تو میں نے یہ دیکھا کہ محمدؐ وہیں مقیم تھے۔ آپؐ نے مجھے کوئی ملامت نہ کی' فرمایا تو صرف اس قدر کہ بہرحال میں اپنے وعدے کی بنیاد پر پابند ہو گیا تھا کہ یہیں تمہارا انتظار کرتا — یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہلِ مکہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا کس قسم کا تجربہ ہوا تھا۔ یہ آپؐ کا اخلاق و کردار تھا' جس کی وجہ سے آپؐ ان کی آنکھوں کا تارا بنے اور آپؐ کو انہوں نے ''الصادق'' اور ''الامین'' کا خطاب دیا۔

آپؐ کی جوانی کے دور کے چند اور واقعات میں سے ایک جنگ فجار میں آپؐ کی شمولیت ہے۔ آپؐ کے تایا زبیر بن عبدالمطلب بنی ہاشم کے عَلَم بردار تھے اور آپؐ بھی اُن کے پہلو بہ پہلو اس جنگ میں شریک ہوئے' اس لیے کہ قریش اس جنگ میں حق پر تھے۔ اگرچہ اس کی صراحت ملتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے کسی کا خون نہیں بہایا۔ اس لیے کہ صرف قومی یا خاندانی معاملات کے لیے کسی انسانی جان کا لینا' یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس جنگ کے بعد قریش کے کچھ نوجوانوں نے ایک عہد کیا جسے ''حلف الفضول'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کی مخالفت کریں گے' مظلوم کی حمایت کریں گے' حق اور صداقت کے راستے کی تلقین کریں گے۔ آنحضور ﷺ بھی اس حلف میں شریک ہوئے اور آپؐ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی اگر اُس قسم کے کسی معاہدے کی طرف مجھے دعوت دی جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر بھی آپ ﷺ کے تدبر اور فراست کا ایک بہت ہی نادر نمونہ سامنے آیا۔ الغرض آپؐ کی زندگی کا یہ جو دور ہے اس میں ہمیں وہ مظہر نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارہ ملتا ہے قرآن مجید کی سورۂ 'نون' میں جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝۴﴾

''اور (اے محمد ﷺ!) بلاشبہ آپؐ اخلاق حسنہ کی بلندیوں پر فائز ہیں۔''

کاروبار ہی کے ضمن میں آنحضور ﷺ کا تعلق یا آپؐ کا معاملہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔ ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ایک طرف یہ عرب کی متمول ترین خاتون تھیں۔ چنانچہ روایات میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ جب قریش کے قافلے سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے تو تنہا انؓ کا سامانِ تجارت باقی تمام لوگوں کے مجموعی سامان سے زیادہ ہوتا تھا۔ پھر دوسری طرف اُنؓ کی عفت و عصمت اور پاکدامنی کا عالم یہ تھا کہ عرب کے اس معاشرے میں اُنؓ کو ''الطاہرہ'' کا خطاب دیا گیا۔ یہ گویا بالکل ایک فطری اور قرین عقل اور قرین قیاس بات ہے کہ یہ قِرَانُ السَّعْدَین ہوتا اور ''الصادق'' اور ''الامین'' کا نکاح ''الطاہرہ'' سے ہوتا۔ مشیتِ الٰہی میں یہی طے تھا۔ بہرحال حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

سے نکاح کی صورت میں وہ بات سامنے آتی ہے جو سورۃ الضحیٰ میں بایں الفاظ وارد ہوئی:

﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝۸﴾

"(اے محمد ﷺ) اور پایا آپ کو تنگ دست' پس (آپ کو) غنی کر دیا۔"

جہاں تک قلبِ محمدیؐ کا تعلق ہے وہ تو ہمیشہ غنی تھا' لیکن ظاہری اور دنیوی اعتبار سے جسے ہم تنگ دستی کہتے ہیں اُس کی اگر کوئی کیفیت نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اب تک رہی بھی تھی تو اب جبکہ مکہ کی متمول ترین خاتونؓ آپؐ کے حبالۂ عقد میں تھیں' جو انتہائی جاں نثار اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والی بیوی تھیں' اس کے بعد اس دنیوی احتیاج یا کمزوری کا بھی کوئی معاملہ باقی نہ رہا۔

حضور ﷺ کی زندگی کا یہ دور ایک بھرپور انسانی زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک محبت کرنے والی جاں نثار اور وفادار بیوی رفیقۂ حیات ہیں ــــ اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان زوجہ محترمہ سے اولاد بھی عطا فرمائی۔ ایک انتہائی باعزت اور بافراغت زندگی آپؐ بسر فرما رہے تھے۔ لیکن اب آپؐ کے اندر ایک داعیہ ابھرا اور توجہ کائنات' خالقِ کائنات اور عالَمِ بالا کی طرف مبذول و منعطف ہوئی۔ اب غور و فکر کا مادہ کسی اور رخ پر پروان چڑھنا شروع ہوا۔ چنانچہ ہمیں وہ روایت ملتی ہے جس کی راویہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں اور بخاری شریف میں یہ روایت پہلے ہی باب میں موجود ہے کہ جب آپؐ کی عمر شریف چالیس برس کے لگ بھگ ہوئی تو آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی اور آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار فرماتے تھے: حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاء

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غار حرا میں آپ ﷺ عبادت کرتے تھے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کس قسم کی تھی! آپؐ کسی سابقہ اُمت میں نہ تھے' کسی نبی کے پیرو نہ تھے' کوئی عبادت کا طریقہ ایسا نہیں تھا کہ جو آپؐ کو کسی اور نبی کی پیروی یا کسی اور اُمت میں ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا' اور حضرت جبرئیل سے ابھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ تو یہ عبادت کیسی تھی! اس کا جواب شارحین حدیث نے یہ دیا ہے کہ: كَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِهٖ فِيْ غَارِ حِرَاءِ التَّفَكُّرُ وَالْاِعْتِبَارُ یعنی غارِ حرا میں آپؐ کی عبادت غور و فکر

اور عبرت پذیری پر مشتمل تھی۔ سوچ بچار' کتابِ فطرت کا مطالعہ' خود اپنی فطرت کی گہرائیوں میں غواصی اور نگاہِ عبرت سے ماحول کا جائزہ و تجزیہ' یہ تھی آپؐ کی غارِ حرا میں عبادت۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؏

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

یہ غور وفکر کہ نوعِ انسانی کس حالت میں مبتلا ہے' خاص طور پر خود آپؐ کی قوم اخلاق کے اعتبار سے کتنی پستی میں مبتلا ہو چکی ہے' کس طرح کے شرک کا دور دورہ ہے' معبودِ حقیقی سے لوگ کس طرح اپنا رخ موڑ چکے ہیں۔ یہ سارا غور وفکر نوعِ انسانی کی ضلالت اور گمراہی پر وہ بھاری رنج وغم تھا جس کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار گواہی ملتی ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ③﴾ (الشعراء)

''آپؐ تو شاید اپنے آپ کو اس رنج اور صدمے کی وجہ سے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے!''

یہ وہ کیفیات تھیں جن کے ساتھ محمدؐ رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں اعتکاف فرما رہے تھے۔ اسی عالم میں پردے اٹھتے ہیں' اور صرف پردے ہی نہیں اٹھتے بلکہ آپؐ پوری نوعِ انسانی کی ہدایت پر مامور کیے جاتے ہیں اور آپؐ کا دورِ دعوت تا قیامِ قیامت مقرر کیا جاتا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر' کرتے ہیں خطاب آخر!

یہ ہے تفسیر سورۃ الضحیٰ کے ان الفاظ کی:

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى⑦﴾

''اور (اللہ نے) پایا آپؐ کو (حقیقت کی تلاش میں) سرگرداں تو آپؐ پر راہِ ہدایت منکشف کر دی۔''

گویا غارِ حرا کی خلوتوں میں آپؐ حقیقت کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ پس دروازے کھول دیے گئے' پردے اٹھا دیے گئے' حضرت جبرائیل امینؑ سے ملاقات ہوئی' وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی ملاقات

جس میں نزولِ وحی کا آغاز ہوا' بیداری اور نیند کے بین بین کی سی کیفیت' یعنی نیم بیداری کے عالم میں ہوئی۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کے پاس کوئی لکھی ہوئی تختی تھی جس پر یہ آیات مرقوم تھیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ⑤﴾ (العلق)

تین مرتبہ حضورﷺ نے فرمایا:

((مَا اَنَا بِقَارِئٍ)) "میں پڑھ نہیں سکتا۔"

حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کے بعد اس وحی کا آپؐ کے قلبِ مبارک میں نقش قائم ہو گیا۔ یہاں سے گویا محمدؐ رسول اللہﷺ کا آفتابِ رسالت طلوع ہو گیا۔ اس کے بعد نزولِ وحی میں کچھ وقفہ رہا ہے' پھر جو آیات نازل ہوئیں وہ سورۃ المدثر کی یہ ابتدائی آیات تھیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③﴾

یعنی اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جایئے' کمر کس لیجیے! فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف ہو جایئے اور اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کیجیے اور اس کی کبریائی کو فی الواقع دنیا میں قائم کیجیے۔ یہ ترجمانی ہے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات کی۔ بہت سے محققین کی یہ رائے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے محمدؐ رسول اللہﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا اور سورۃ المدثر کی ان ابتدائی آیات سے آپؐ کی رسالت کا آغاز ہوا۔ واللہ اعلم!

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ○

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○○

(۵)

مکّی دور: دعوت‘ تربیت اور تنظیم

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ (المدثر)

اس سے قبل یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان غلبۂ دینِ حق ہے‘ یعنی اُس دینِ حق کو بالفعل قائم‘ غالب اور نافذ کرنا جو آپؐ دے کر بھیجے گئے ہیں ۔اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے ایک مکمل انقلابی جِدّوجُہد درکار ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں ہمیں وہ تمام مراحل نظر آتے ہیں جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آنے لازمی ہیں۔ یہی بات ہے جو سورۃ المدثر میں نہایت سادہ الفاظ میں فرمائی گئی ہے: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ”اور (اے محمد ﷺ!) اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کرو (اور اسے بالفعل قائم اور نافذ کرو)۔“

اس انقلابی جدوجہد کا پہلا مرحلہ جو ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مکی دور میں نظر آتا ہے وہ دعوت و تبلیغ‘ تزکیہ اور تنظیم پر مشتمل ہے — جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے اس کی بنیاد تھی لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان اور آپؐ کی بے چون و چرا اطاعت اور آپ ﷺ سے بہ دل و جان محبت ۔ یہی وہ چیز ہے جس نے آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو ایک بنیانِ مرصوص بنا دیا۔ ایک ایسی طاقت اور ایک ایسی قوت کہ جو حضور ﷺ کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی۔ آپؐ کے چشم و اَبرو کے اشارے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے ہر دم آمادہ رہتے تھے۔

جہاں تک دعوت یا تبلیغ کا تعلق ہے اُس کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کا مرکز و محور‘ اس کا منبع اور اس کا مدار قرآن حکیم ہے۔ دعوت ہو یا تبلیغ‘ انذار ہو یا تبشیر‘ نصیحت ہو یا موعظت‘ یہاں تک کہ تربیت ہو یا تزکیہ‘ ان سب کی

اساس اور بنیاد قرآن مجید پر ہے۔ یہ بات قرآن حکیم میں چار مقامات پر آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جو منہج عمل اور طریق کار ہے اس کی بنیاد ان عناصر چہارگانہ پر ہے:

﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾

(آل عمران:١٦٤)

''(یہ رسول ﷺ) اُن پر اُس (یعنی اللہ) کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب یعنی احکامِ الٰہی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اسی حقیقت کو مولانا حالی نے نہایت سادہ الفاظ میں یوں ادا فرمایا: ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

پس یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ اگرچہ اس دعوت کا ہدف اور مقصود تکبیرِ ربّ یا اعلائے کلمۃ اللہ یا اظہارِ دین حق ہے' از روئے نصِ قرآنی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ﴾ (الفتح:٢٨)

''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنا رسول' الہدیٰ اور دین حق دے کر تا کہ وہ (رسول) اس کو کُل جنسِ دین پر پورے کا پورا غالب کر دے۔''

لیکن اس کا نقطۂ آغاز ہے ''اِنذار'' یعنی خبردار کرنا' آگاہ کرنا۔ وقوعِ قیامت سے خبردار کرنا' جزاء و سزائے اُخروی سے خبردار کرنا۔ یہ خبردار (warn) کرنا' یعنی 'انذار' دعوتِ نبوی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر اگر کبھی کوئی دعوت اٹھانی اور برپا کرنی مقصود ہو تو اُس کا نقطۂ آغاز بھی 'انذار' ہی ہوگا۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس دعوت کے ضمن میں ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں ایک نہایت فطری اور حکیمانہ تدریج نظر آتی ہے۔ یہ دعوت ''الأقرب فالأقرب'' کے اصول پر آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز خود آپ ﷺ کے گھر سے ہوا۔ آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ ہیں۔ اُن کے بعد آپؐ کے چچا زاد بھائی ہیں جو آپؐ کے زیر کفالت

بھی ہیں اور زیر تربیت بھی' یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ پھر آپؐ کے انتہائی گہرے دوست ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر آپؐ کے وہ غلام ہیں کہ جنہیں آپ نے آزاد کر کے اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا' یعنی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ یہاں سے دعوت آگے بڑھی کنبے اور قبیلے کی طرف۔ پھر جب تک کہ آپؐ اہلِ مکہ سے مایوس نہیں ہو گئے آپؐ نے اپنی پوری دعوتی سرگرمی مکہ تک ہی محدود رکھی۔ مکہ والوں سے مایوس ہو کر ۱۰ نبوی میں آپؐ نے طائف کا سفر کیا' لیکن اہلِ طائف بھی اسلام کی دعوت سے محروم رہے۔

پھر جب مکہ والوں کی مخالفت کی بنا پر آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی تب بھی چھ سال کے عرصہ تک' جب تک کہ اہلِ عرب نے صلح حدیبیہ کی شکل میں آپؐ کی حیثیت کو تسلیم نہ کرلیا' آپ نے اپنی تمام تر توجہات اندرونِ ملک عرب ہی مرتکز رکھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیرونِ ملک دعوت کا آغاز فرمایا۔ یہ ہے تدریج جو بالکل فطری اور نہایت حکیمانہ ہے۔

آخری بات اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام وسائل اختیار فرمائے جو اُس وقت موجود تھے۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ:

﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۝۲۱۴﴾ (الشعراء)

''اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) خبردار کیجیے اپنے قبیلے اور قرابت داروں کو۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ دعوتِ طعام کا اہتمام فرمایا' اور وہاں اپنی دعوت پیش کی' اگرچہ بظاہر احوال اور ہمارے دنیوی معیارات کے اعتبار سے یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں۔

بعد میں جب بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا:

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ......﴾ (الحجر: ۹۴)

''پس (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ علی الاعلان دعوت دیجیے اس بات کی جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے......''

یعنی اب ڈنکے کی چوٹ وہ بات کہیے جس کے لیے آپؐ مامور ہوئے ہیں' تو آپؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر وہی نعرہ بلند کیا جس کا عرب میں رواج تھا: واصباحا!'' ہائے وہ صبح جو

آنے والی ہے''۔ جس پر لوگ جمع ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے جب انہیں عذابِ آخرت سے خبردار کیا تو آپؐ کا سگا چچا ابولہب مجمع میں سے بول اٹھا: تَبًّا لَكَ ، اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ معاذ اللہ، نقل کفر کفر نباشد۔ ''(اے محمدؐ!) تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں، کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا تھا؟'' اس پر سورۃ اللھب نازل ہوئی جس کی پہلی آیت ہے:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ①﴾

''(اصل میں تو) ہاتھ ٹوٹ گئے ابولہب کے اور ہلاک و برباد ہو گیا وہ خود۔''

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دعوت و تبلیغ کے میدان میں ابتدا تو اگرچہ آنحضور ﷺ نے خود فرمائی، لیکن جو لوگ آپؐ پر ایمان لائے اُن میں سے ہر شخص اپنی جگہ پر ایک داعیِ حق بن گیا۔ ان میں نمایاں ترین مقام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد وہ خود مجسم داعی بن گئے، خود مبلغ بن گئے۔ چنانچہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو چوٹی کے دس صحابہؓ ہیں، جنہیں ہم عشرۂ مبشرہ کے نام سے جانتے ہیں، اُن میں سے چھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں ایمان لائے۔ اُن میں حضرت عثمان بھی ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی ہیں، حضرت طلحہ بھی ہیں، حضرت زبیر بھی ہیں اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی ہیں، رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم۔ دعوت کے اس عمل پر جو ردِعمل کفار کی طرف سے اور سردارانِ قریش کی جانب سے ظاہر ہوا، اُس میں بھی ہمیں ایک عجیب ترتیب نظر آتی ہے، وہی ترتیب جو ہمیشہ کسی انقلابی دعوت کے خلاف ردِعمل میں ظاہر ہونی ضروری ہے۔ چنانچہ فوری ردِعمل جو ابتدا میں ظاہر ہوا وہ استہزا اور تمسخر کا تھا۔ گویا کہ چٹکیوں میں بات اڑانے کی کوشش کی گئی۔ حضور ﷺ کو مجنون قرار دیا گیا، آپؐ پر، معاذ اللہ، پاگل پن کی پھبتی کسی گئی۔ کہا گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خللِ دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے، یا شاید کسی آسیب کا اثر ہو گیا ہے، یہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں، اچھے بھلے آدمی تھے نہ معلوم کیا ہوا۔ (نقل کفر کفر نباشد) نبی اکرم ﷺ جب یہ باتیں سنتے تھے اور آپؐ کے قلبِ مبارک پر رنج و اندوہ کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو تسلی و تشفی و دلجوئی کے لیے وحیِ الٰہی نازل ہوتی تھی:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ② وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ③ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④﴾

''ن ۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (اے نبی ﷺ) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں' اور یقیناً آپ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک آپ اعلیٰ اخلاق کے مرتبے پر فائز ہیں۔''

اس کے بعد جب بات آگے بڑھی' قریش نے یہ دیکھا کہ جسے ہم ایک مشتِ غبار سمجھے تھے وہ تو ایک بہت بڑی آندھی کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ ہمارے اقتدار' ہماری سیادت' ہماری دیرینہ روایات' ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے عقائد و مذہب کے خلاف ایک بہت بڑی انقلابی جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے' گویا انہوں نے دیکھا کہ ؎

''نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!!''

تو اب پھر وہی ردعمل ظاہر ہوا جو ہمیشہ ظاہر ہوتا ہے' یعنی بہیمانہ تشدد۔ شدید اذیت (persecution) —— اور ظاہر بات ہے کہ اس کا سب سے بڑا حصہ انہی صحابہ رضی اللہ عنہم کے حصے میں آیا جو کہ غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا کوئی حمایتی نہیں تھا' جن کی طرف سے کوئی بولنے والا نہیں تھا' جیسے حضرت بلال' حضرت خباب بن الارت' حضرت سُمیّہ اور آلِ یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ان سب پر جو کچھ بیتی وہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے بڑے اَنمٹ نقوش ہیں' اور انہوں نے جس طرح صبر و استقامت اور جس پامردی کے ساتھ ان تمام مصائب کو جھیلا ہے اور ایمان پر ثابت قدم رہے ہیں وہ تاریخ دعوت و عزیمت کے نہایت اہم نشاناتِ راہ ہیں۔

جب یہ محسوس کر لیا گیا کہ ہمارے یہ تمام حربے ناکام ہو چکے' کسی ایک شخص کو بھی ہم ایمان سے کفر میں نہیں لا سکے' ہمارا یہ سارا تشدد ناکام ہو چکا' تو پھر تیسرا ردعمل سامنے آیا۔ چنانچہ تیسرا حربہ آزمایا گیا۔ یہ حربہ ہے مصالحانہ پیشکشوں کا' یہ جال ہے لالچ کا۔ چنانچہ ابن ربیعہ قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آتا ہے اور

یہ کہتا ہے کہ اے محمد (ﷺ!) اگر تم بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہو تو اگرچہ ہم اُس مزاج کے نہیں ہیں کہ کسی کو بادشاہ مان سکیں، لیکن تمہیں ہم اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے۔ اگر تمہیں دولت چاہیے تو ذرا اشارہ کرو، قدموں میں دولت کے انبار لگا دیے جائیں گے۔ کہیں شادی کرنے کی خواہش ہو تو صرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہو گی، جس گھرانے میں کہو تمہاری شادی کرا دی جائے گی، لیکن بہرحال تم اس کام سے باز آ جاؤ جس نے قریش کے اندر تفرقہ برپا کر دیا ہے۔ اس کا جو جواب دیا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے وہ تاریخِ عزیمت میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، فرمایا:

''اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور ایک ہاتھ میں چاند رکھ دو تب بھی میں اُس کام سے باز نہیں آ سکتا جس پر میں اپنے ربّ کی جانب سے مامور ہوا ہوں۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ وہ وقت بھی آیا کہ آخری الٹی میٹم دیا گیا۔ ایک وفد ابو طالب کے پاس آتا ہے جو حضور ﷺ کی پشت پناہی کیے چلے جا رہے ہیں اور انہی کی وساطت سے بنو ہاشم کا پورا خاندان گویا نبی اکرم ﷺ کی پشت پر تھا۔ قریش کی طرف سے انہیں الٹی میٹم ملتا ہے کہ اے ابو طالب! ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، اب دو ہی راستے ہیں، یا محمد (ﷺ) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ اور یا پھر میدان میں آؤ اور مقابلہ کرو۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ ابو طالب کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ انہوں نے حضور ﷺ کو بلایا اور یہ کہا کہ بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ اور یہی وہ واحد موقع نظر آتا ہے جب حضور ﷺ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ تاہم آپؐ نے بات وہی کہی جو عزیمت کا تقاضا تھا، فرمایا:

''چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہو کر رہے گا جو میرے ربّ کی طرف سے میرے حوالے کیا گیا ہے، اور یا میں اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا۔''

نبی اکرم ﷺ پر ذاتی اعتبار سے بھی ایذاء و آزمائش کے بہت سے مراحل آئے۔ آپؐ پر دست درازی بھی ہوئی، کاشانۂ مبارک میں راکھ اور غلاظت بھی پھینکی گئی، آپؐ کے راستے میں کانٹے بھی بچھائے گئے، آپؐ کی گردن میں ایک چادر پھندے کی صورت میں

ڈال کر اُس کو بل دے کر اُس کے دونوں سروں کو کھینچا گیا کہ آپؐ کی آنکھیں اُبل آئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ آپؐ اپنے خالق کے سامنے عین کعبے کی دیوار کے سائے میں سربسجود تھے اور وہاں عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کی شہ پر ایک اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی لا کر حضور ﷺ کے شانۂ مبارک پر رکھ دی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب یہ تعدی' یہ تشدد' یہ ظلم وستم انتہائی شدت کی صورت اختیار کرتا ہے اور پورے خاندان بنی ہاشم کو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تین سال تک ایک گھاٹی میں محصور ہو کر گویا ایک طرح کی نظر بندی کی صورت میں بسر کرنے پڑتے ہیں' جس کے دوران شدید ترین مقاطعہ ہے اور کھانے پینے کی کوئی چیز گھاٹی میں داخل نہیں ہونے دی جارہی۔ اس دوران وہ وقت بھی آیا کہ بنی ہاشم کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے حلق میں ڈالنے کے لیے اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کہ چمڑے کے سوکھے جوتوں کو ابال کر اُن کا پانی ٹپکا دیا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے ذاتی ابتلا کا ابھی نقطہ عروج باقی تھا جو ۱۰ نبوی میں سامنے آگیا۔ اس سال اگرچہ شعب بنی ہاشم کی اس نظر بندی سے تو رہائی مل گئی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان و ابتلاء اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے کہ ایک ہی سال میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا اور ابوطالب کا بھی۔ گھر میں ایک دلجوئی کرنے والی رفیقۂ حیات تھی وہ بھی نہ رہی' اور خاندان کی پشت پناہی کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ابوطالب تھے وہ بھی اٹھ گئے۔ یہ وہ سال ہے جسے نبی اکرم ﷺ "عامُ الحُزن" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یہ رنج وغم اور اندوہ کا سال ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدُ للّٰہ ربّ العالمین ○○

(۶)

مکّی دور' ابتلاء کی انتہا — اور ہجرتِ مدینہ

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ (بنی اسرائیل)

''اور (اے نبی ﷺ!) دعا کرو کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال' اور اپنی طرف سے مجھے غلبہ عطا فرما اور اس کو میرا مددگار بنا دے۔''

نبوت کے دسویں سال حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ اور ابوطالب کے انتقال کے بعد سردارانِ قریش کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور دار الندوہ میں نبی اکرم ﷺ کے قتل کے مشورے شروع ہو گئے ۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے فطری طور پر ادھر ادھر دیکھا کہ مکہ کے سوا کوئی اور جگہ کون سی ہو سکتی ہے جسے آپؐ اپنی دعوت کے لیے مرکز اور base کی حیثیت سے استعمال کر سکیں ۔ مکہ سے قریب ترین طائف ہے ۔ چنانچہ ایک اُمید لے کر نبی اکرم ﷺ نے طائف کا سفر اختیار کیا ۔ یہ سفر انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہوا ہے ۔ اس میں حضور ﷺ کے ساتھ وہ بھی موجود نہیں جو پوری زندگی سائے کی طرح ساتھ رہے' یعنی ابوبکر صدیق ؓ ۔ آپ ﷺ کی رفاقت میں صرف آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ ؓ ہیں ۔ پھر عام راستہ چھوڑ کر انتہائی دشوار گزار راستہ اختیار کیا گیا' اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں مشرکینِ مکہ سے مڈھ بھیڑ نہ ہو ۔

آپ ﷺ طائف پہنچے اور وہاں کے تین سرداروں سے ملاقات کی' اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ اگر ان میں سے کسی کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما دے تو کیا عجب کہ طائف کا یہ شہر اس انقلابی دعوت کا مرکز اور base بن جائے ۔ لیکن جو صورتِ حال

سامنے آتی ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بیان کرتے ہوئے بھی دل شق ہوتا ہے اور سننے کے لیے بھی بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ تینوں نے اس قدر تمسخر آمیز اور تحقیر آمیز انداز اختیار کیا کہ پچھلے پورے دس سال کے دوران محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ نقل کفر کفر نہ باشد' کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ اگر اللہ نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ گویا خود کعبے کے پردے چاک کر رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ میں تم سے بات بھی کرنے کے لیے تیار نہیں' اس لیے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور میں عذابِ خداوندی کا نوالہ بن جاؤں' اور اگر تم جھوٹے ہو تو جھوٹے اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں مُنہ لگایا جائے۔ کسی نے بڑے ہی تمسخر اور تحقیر کے ساتھ کہا کہ کیا اللہ کو تمہارے سوا کوئی اور شخص نبوت و رسالت کے لیے نہیں ملتا تھا؟ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں' جب حضور ﷺ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو انہوں نے کچھ ''غنڈوں'' کو اشارہ کر دیا۔ چنانچہ اوباش لڑکے حضور ﷺ کے گرد ہو گئے۔ پھر وہ نقشہ جما ہے اس کرۂ ارضی پر کہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں' محبوبِ رب العالمین' سید الاولین والآخرین' اور آپ کے گرد کچھ اوباش لوگ ہیں جو پتھراؤ کر رہے ہیں۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے' تالیاں پیٹی جا رہی ہیں' حضور ﷺ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا ہے' نعلین مبارک خون سے بھر گئی ہیں۔ ایک موقع پر حضور ﷺ ضعف کی وجہ سے ذرا بیٹھ گئے تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں' ایک ایک بغل میں ہاتھ ڈالتا ہے' دوسرا دوسری میں اور اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلا اور امتحان کا نقطہ عروج (climax) ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ جب واپس آئے تو وہ دعا آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہے جس کو پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ))

''اے اللہ! (کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں؟ تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں۔) تجھی سے شکوہ کرتا ہوں اپنی قوت کی کمزوری کا' اپنے ذرائع و وسائل

کی کمی کا اور لوگوں میں جو یہ رسوائی ہو رہی ہے اس کا۔‘‘

((اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟))

’’اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟‘‘

لیکن اس کے ساتھ ہی بارگاہِ خداوندی میں وہ عبدِ کامل عرض کرتا ہے:

((اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ))

’’(پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے) اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں۔‘‘

ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

((اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ))

’’پروردگار! میں تو تیرے ہی روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں۔‘‘

یہ ہے وہ دعا جس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ع

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید!

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال حاضر ہوتا ہے‘ وہ فرشتہ کہ جو پہاڑوں پر مامور ہے‘ اور عرض کرتا ہے کہ حضورؐ! اللہ نے مجھے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپؐ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں یہ طائف کا شہر واقع ہے تاکہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں۔ اس پر رحمۃٌ للعالمین ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ’’میں لوگوں کے عذاب کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لا رہے‘ لیکن کیا عجب کہ ان کی آئندہ نسلوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرمائے‘‘۔ اور ہمارے لیے یہ بات بڑی قابل توجہ ہے کہ سرزمین پاک و ہند پر اسلام کی ہدایت کا سورج جو پہلی مرتبہ طلوع ہوا تو اس کے لانے والے محمد بن قاسم رحمہ اللہ علیہ تھے جو ثقفی تھے‘ بنو ثقیف کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے‘ جو طائف ہی کا ایک قبیلہ تھا۔

بہرحال نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں یومِ طائف ایک turning point ہے‘ ایک اعتبار سے شدید ترین دن ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ

حضورﷺ سے سوال کیا کہ کیا آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ سخت دن بھی کوئی گزرا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' طائف کا دن مجھ پر اس سے کہیں زیادہ سخت تھا''۔ لیکن جیسے کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بہت ہی عمدہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ دن turning point ہے حضورﷺ کی زندگی میں۔ آج کے دن تک گویا اللہ نے نبی اکرمﷺ کو دشمنوں کے حوالے کیا ہوا تھا کہ جس طرح چاہو آپؐ کے صبر کا امتحان لے لو' جس طرح چاہو آپؐ کی استقامت کو جانچ لو' ہمارے اس نبیؐ کی سیرت و کردار کا لوہا خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لو کہ اس میں کہیں کھوٹ تو نہیں' تمہیں پوری چھوٹ ہے۔

لیکن اس دن کے بعد اب نصرتِ خداوندی کا ظہور شروع ہوتا ہے۔ فوری طور پر تو ملک الجبال کی حاضری ہے' لیکن اصل ظہور مکہ واپسی کے بعد ہوتا ہے۔ اب ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں اور ایک راستہ خود بخود رحمت خداوندی سے کھلتا ہے۔ ۱۰ نبوی ہی کے ماہِ رجب میں نبی اکرمﷺ کی ملاقات چھ افراد سے ہوتی ہے جو مدینہ سے آئے ہوئے تھے اور یہ چھ اشخاص حضورﷺ پر ایمان لے آتے ہیں۔ منیٰ کی وادیوں میں سے ایک وادی میں یہ ملاقات ہوئی۔ اگلے سال ۱۱ نبوی میں یہ لوگ پھر آتے ہیں اور بارہ افراد حضورﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ یہ بیعتِ عُقبہ اولیٰ کہلاتی ہے۔ اور پھر وہ درخواست کرتے ہیں کہ حضورؐ! ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص بھیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔ اس لیے کہ آپﷺ کی دعوت اور آپؐ کی تربیت و تزکیہ کا مرکز و محور قرآن حکیم ہی تھا۔ چنانچہ: ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند!

قرعہ فال نکلا حضرت مصعب بن عمیرؓ کے نام۔ حضورﷺ انہیں مدینہ منورہ بھیجتے ہیں۔ وہ حضرت سعد بن زرارہؓ کے گھر پر جا کر قیام کرتے ہیں اور مدینہ منورہ میں شب و روز دعوتِ قرآنی کو پھیلا رہے ہیں۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ اپنی ایک سال کی محنت کا حاصل ۱۲ نبوی میں ۷۵ افراد کو لا کر محمد رسول اللہﷺ کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں' جن میں ۷۲ مرد ہیں اور تین عورتیں۔

بیعتِ عَقبہ ثانیہ ہوتی ہے‘ جو تمہید ہے ہجرت کی ۔ اس موقع پر کچھ تقاریر بھی ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے‘ انہوں نے انصارِ مدینہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ لوگو! اس بات کو جان لو کہ محمد (ﷺ) ہمیں بہت عزیز ہیں‘ ہمارے لیے انتہائی محترم ہیں‘ ہماری آنکھوں کا تارا ہیں‘ اب تک ہم نے ان کی پوری حفاظت کی ہے۔ (چونکہ بنی ہاشم نے نبی اکرم ﷺ کی حمایت جاری رکھی تھی۔) اب اگر تم انہیں اپنے ہاں لے کر جانا چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہیں ان کی حفاظت اپنے اہل وعیال سے بڑھ کر کرنی ہوگی۔ اور اگر اس کی ہمت نہیں پاتے تو ابھی جواب دے دو۔ لیکن انصارِ مدینہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا تَن مَن دھن نچھاور کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگر حضور ﷺ ہمارے ساتھ مدینہ تشریف لے جائیں تو ہم اُن کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے کہ اپنے اہل وعیال کی کیا کرتے ہیں۔ اس وقت وہی حضرت سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بھی انصارِ مدینہ کو متنبہ کرتے ہیں کہ لوگو! اچھی طرح سمجھ لو‘ ایک بہت بڑی ذمہ داری قبول کر رہے ہو۔ محمد (ﷺ) کو دعوت دینا اور ساتھ لے کر جانا سرخ وسیاہ آندھیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ ہوا وہ اندھیرے میں نہیں ہوا‘ پوری طرح سمجھ کر ہوا‘ پوری حقیقت کو جاننے کے ساتھ ہوا‘ جو ذمہ داری انصارِ مدینہ نے سنبھالی اور اٹھائی اس کو پورے طور پر سمجھ کر‘ اُس کے نتائج وعواقب پر نگاہ رکھ کر اٹھائی۔ بہرحال ۱۲ نبوی میں جو بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی یہ ہجرت کی تمہید بن گئی۔

نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو عام اجازت دے دی کہ مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں چنانچہ بہت سے لوگ ہجرت کر گئے۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ رسول اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا‘ وہ اپنے مستقر کو نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ اللہ کی طرف سے واضح اجازت نہ آ جائے۔ بالآخر وہ وقت آیا کہ اجازت آ گئی اور نبی اکرم ﷺ اپنے اُسی انتہائی گہرے دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو یارِ غار اور رفیق راہ ہیں‘ کی معیت میں مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ زبانِ مبارک پر وہ دعا تھی جو سورۂ بنی اسرائیل

میں گویا اسی ہجرت کی تمہید کے طور پر آپ ﷺ کو تلقین فرما دی گئی تھی:

﴿رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ﴿۸۰﴾﴾

''پروردگار! تُو مجھے جہاں داخل فرما رہا ہے وہ صدق وصداقت اور راستی کا داخلہ ہو اور جہاں سے تُو مجھے نکال رہا ہے وہاں سے میرا یہ نکلنا بھی راست بازی اور صدق پر مبنی ہو۔ اور اے ربّ! مجھے اپنے خاص خزانہ فضل سے وہ غلبہ اور قوت واقتدار عطا فرما جو اس مشن میں میرا مددومعاون ہو جو تو نے میرے حوالے کیا ہے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آنحضور ﷺ تین روز تک غارِ ثور میں چھپے رہے۔ اس دوران وہ مرحلہ بھی آیا کہ کھوجی بالکل غار کے دہانے تک پہنچ گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے لیے نہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اندیشہ ناک ہو کر گھبرائے ہوئے یہ عرض کرتے ہیں کہ حضور! اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف بھی نگاہ ڈال لی تو ہم دیکھ لیے جائیں گے' ہم پکڑے جائیں گے' لیکن وہ کوہِ صبر و ثبات واستقامت (ﷺ) جس کو اللہ کی ذات پر یقین کامل حاصل تھا' معیت خداوندی جس کی قوت کا اصل راز تھی' وہ فرماتا ہے:

﴿لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ (التوبۃ: ۴۰)

''گھبراؤ نہیں (کسی رنج وغم کا کوئی موقع نہیں ہے) اللہ ہمارے ساتھ ہے (وہ ہمارا رفیق اور ہمارا مددگار ہے)۔''

بہرحال یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے نتیجے میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد ایک بالکل نئے دور میں داخل ہو گئی۔ اگر جدید انقلابی اصطلاحات کو استعمال کیا جائے تو passive resistance کا دور ختم ہوا' اب ایک active resistance کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اب تک حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھو' ماریں کھاؤ' لیکن جھیلو' صبر کرو اور برداشت کرو' reteliate کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا: ﴿کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ﴾ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے تو پھر بھی تمہیں اجازت نہیں کہ مدافعت میں بھی اپنے ہاتھ اٹھا سکو۔ خواہ تمہیں ہلاک کر دیا جائے'

شہید کر دیا جائے، تمہیں اجازت نہیں کہ اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھا سکو۔ لیکن اب وہ ہاتھ کھول دیے گئے۔ سورۃ الحج کی یہ آیت مبارکہ اس مرحلہ پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ۙ۳۹﴾

''اجازت دے دی گئی اُن کو جن پر جنگ ٹھونس دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ (ان کے لیے آج سے اجازت ہے کہ وہ بھی اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا وعدہ ہے) اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔''

﴿الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ﴾

''وہ لوگ جو اپنے گھروں سے ناجائز نکالے گئے صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے خدائے واحد پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ آج اُن کو اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ بھی نہ صرف مدافعت میں ہاتھ اٹھائیں بلکہ کفر کے استیصال کے لیے اقدام کریں۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِیْ وَلَكُمْ فِی الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ

فَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝۝

(۷)

اندرونِ عرب انقلابِ نبویؐ کی تکمیل

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال:۳۹)

''اور ان (کافروں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

دار الہجرت یعنی مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کے ورودِ مسعود کی تاریخ ۸ ربیع الاول سن ۱۳ نبوی ہے' جو سن عیسوی کے مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء قرار پاتی ہے۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ ہجرت کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی گوشۂ عافیت میسر آ گیا تھا۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ہجرت کے بعد سے نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد شدید تر مراحل میں داخل ہوئی۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے (ہجرت کے بعد کے) دس سال میں ایک بھرپور' ہمہ جہتی اور مکمل انقلابی جدوجہد اپنے تمام اطراف و جوانب اور تقاضوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ کی جدوجہد کے تین اہم گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ آپ ﷺ کا مثبت کام جو قرآن حکیم کی اس آیت میں واضح کیا گیا کہ: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ اس کے حدود وسیع تر ہو گئے۔ چنانچہ ایک جانب ایک آزاد مسلمان معاشرہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرما دیا اس کی تطہیر افکار اور تعمیر کردار کا فریضۂ منصبی ہے جو بجائے خود ایک سخت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ دوسری طرف آپؐ کی دعوت و تبلیغ کی حدود کی توسیع ہے جس کے نتیجے میں ایک نئی ضرورت سامنے آئی کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو نبی اکرم ﷺ کی صحبت سے اس درجے فیض یافتہ ہوں اور تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے اس درجہ حصہ پا چکے ہوں کہ پھر انہیں عرب کے اطراف و جوانب میں پیغامِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ

والسلام کی نشر و اشاعت کے لیے بھیجا جا سکے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کاموں کے لیے حضور ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی سب سے پہلے قبا میں مسجد تعمیر فرمائی اور پھر مدینہ کے مرکز میں مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر کا آغاز فرمایا۔ یہ گویا عملی تفسیر ہے اس آیۂ مبارکہ کی جو سورۃ الحج میں اذنِ قتال والی آیت کے فوراً بعد آتی ہے کہ:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (الحج:۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔''

گویا یہ وہ فرضِ منصبی ہے کہ جس کی جانب محمدٌ رسول اللہ ﷺ ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

دوسری جانب مدینہ منوّرہ میں جو ایک آزاد مسلمان حکومت قائم ہوئی جو ابتداءً تو ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھی' لیکن جسے حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی کے دوران عرب کے اطراف و جوانب تک وسیع ہونا تھا اور جسے آئندہ ایک اسلامی ریاست کے لیے پیش خیمہ اور نمونہ بننا تھا' اس کے ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے تدبّر اور حسنِ تدبیر' معاملہ فہمی' پیش بینی اور آپؐ کے حسنِ انتظام کے جو مظاہر سامنے آتے ہیں' آنجناب ﷺ کے تمام سیرت نگار خواہ وہ آپؐ کے ماننے والے ہوں یا آپؐ کی رسالت کے منکر ہوں اور یہ انکار دشمنی کی حدود تک پہنچ گیا ہو' سب نے اس کا اعتراف کیا ہے اور کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ منٹگمری واٹ نبی اکرم ﷺ کے حسنِ تدبیر کو جن شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرتا ہے شاید ہی نسل آدم کے کسی اور شخص کے لیے ان الفاظ کو استعمال کیا گیا ہو۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے کمال حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے یہود کے تینوں قبیلوں سے معاہدے کر لیے اور انہیں اس قول و قرار میں جکڑ لیا جس کی بنا پر وہ کبھی بھی نبی اکرم ﷺ کی مخالفت سامنے آ کر نہ کر سکے۔

ایک دوسرا عنصر جو مدینہ منورہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست اور چھوٹے سے اسلامی معاشرے میں یہود کے زیر اثر پروان چڑھ رہا تھا' وہ منافقین کا گروہ تھا' جو ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتا۔ یہ مارِ آستین تھے جو اندر سے حملے کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ ایک

طرف اپنے مثبت کام میں مصروف ہیں جو دعوت اور تعلیم و تزکیہ کا کام ہے' دوسری طرف مدینہ ہی کے اندر یہود اور منافقین کی سازشوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں' اور تیسری طرف ہے آپ کا اصل محاذ جس کی جانب ارشاد ہوا سورۃ الانفال کی اس آیۂ مبارکہ میں:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۳۹)

جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کے دین کو عملاً نافذ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اب آنحضرت ﷺ کی جانب سے بھی اقدام ہو۔ قتال کا مرحلہ شروع ہو رہا ہے' اس سلسلے میں سب سے پہلے قریش حملہ آور ہوتے ہیں اور ۲ھ میں ایک ہزار کا لشکر جرار آتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ مجلس مشاورت منعقد فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو شام سے قافلہ آ رہا ہے جو مالِ تجارت سے لدا پھندا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے صرف ڈیڑھ سو اشخاص ہیں' دوسری طرف ایک لشکر ہے جو مکہ سے چلا آ رہا ہے' اب لوگو مشورہ دو ہمیں کدھر کا قصد کرنا چاہیے! یہ اصل میں آپؐ نے ایک انتہائی ماہر سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں کے حوصلے (morale) کا اندازہ کرنے کی تدبیر فرمائی تھی۔

بعض حضرات نے بربنائے طبع بشری اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمیں پہلے قافلے کا رخ اختیار کرنا چاہیے' لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے وہ لوگ جو نبی اکرم ﷺ کے مزاج شناس تھے انہوں نے یہ بھانپ لیا کہ حضور ﷺ کا قصد کدھر ہے۔ چنانچہ جان نثاروں کی تقریریں ہوئیں۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! ہمیں آپ اصحابِ موسٰیؑ پر قیاس نہ فرمائیں جنہوں نے حضرت موسٰی علیہ السلام کو کورا جواب دے دیا تھا کہ:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (المائدۃ)

''پس آپ اور آپ کا رب جا کر جنگ کریں' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔''

آپؐ اللہ کا نام لے کر جدھر بھی آپؐ کا قصد ہو ارشاد فرمائیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعے سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ حضور ﷺ کو خاص طور پر انصار کی طرف سے رائے کا انتظار تھا۔ چنانچہ اس کو بھانپ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ رئیس خزرج کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے' اب ہمارے لیے کون سا اختیار رہ

گیا ہے! آپ ﷺ کا جدھر کا بھی ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے' اگر آپ برک الغماد تک جانے کا حکم دیں تو ہم جائیں گے اور ان شاء اللہ اس سے گریز نہ کریں گے۔ آپ ہمیں سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے فرمائیں تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ یہ تھے جاں نثارانِ محمد ﷺ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

بدر کے میدان میں جنگ ہوئی۔ ایک جانب ۳۱۳ افراد پر مشتمل بے سروسامان اسلامی لشکر تھا جس کے ساتھ صرف دو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا اور دوسری جانب ایک ہزار کا غرق آہن لشکر جرار تھا۔ لیکن اللہ نے لشکر اسلام کو فتح عطا فرمائی اور اس دن کو ''یوم الفرقان'' بنا دیا۔ یعنی یہ فیصلے کا دن ہے! آج معلوم ہو گیا کہ صداقت کس کے ساتھ ہے' اللہ کی حمایت کسے حاصل ہے! لیکن یہ فتح جو بدر میں اللہ نے عطا فرمائی اگلے ہی سال ایک دوسرے امتحان کی تمہید بن گئی۔ ۳ھ میں قریش نے پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ تین ہزار کا لشکر جرار آیا اور اس بار مسلمانوں کو اپنی جماعت کے متعلق پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس میں سب ہی مؤمنین صادقین نہیں ہیں' بلکہ مارِ آستین بھی اب ایک اچھی خاصی تعداد میں شامل ہو چکے ہیں جنہیں منافقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' جنہوں نے بروقت دغا دی اور عبداللہ بن اُبی کل ایک ہزار کے لشکر میں سے ۳۰۰ اشخاص کو لے کر واپس مدینے لوٹ گیا۔ یہ جنگ جو دامنِ اُحد میں لڑی گئی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہل ایمان کے لیے ابتلاء و آزمائش اور اُن کی تربیت اور تزکیہ کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنا دیا۔ اس میں مسلمانوں کو اپنی ایک غلطی کی وجہ سے ابتداءً کسی قدر شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالِ فضل سے بالآخر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

دو سال بعد غزوۂ احزاب ہوتا ہے' جو غزوۂ خندق بھی کہلاتا ہے۔ اب بارہ ہزار کا لشکر جرار مدینہ منورہ پر حملہ آور ہے۔ بعض روایات میں تعداد اس سے بھی زائد آئی ہے۔ محاصرہ ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے حضور ﷺ نے محصور ہو کر اور خندق کھود کر دفاع کرنے کی تجویز پر عمل کیا۔ یہ غزوہ اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑا امتحان ثابت ہوا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کفار کے لشکر کی صورت میں جو آندھیاں

آئی تھیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی آندھیوں سے ختم بھی ہو گئیں‘ لیکن اس کے دوران اہل ایمان کا پورا امتحان ہو گیا اور اہل نفاق کا نفاق بھی پورے طور پر عیاں اور ظاہر ہو گیا۔ غزوۂ خندق میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی تو حضور ﷺ نے جن کا دست راست حالات کی نبض پر تھا‘ مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ یہ آخری بار ہے کہ قریش تم پر چڑھ آئے تھے۔ فرمایا: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) ”اس سال کے بعد قریش تم پر ہرگز حملہ آور نہیں ہوں گے‘ بلکہ تم ان پر حملہ آور ہو گے۔“ اب اقدام (initiative) تمہارے ہاتھوں ہوگا‘ اب پیش قدمی تم کرو گے۔ چنانچہ ۶ ھ میں اپنے ایک خواب سے بشارت پا کر‘ اور یہ معلوم رہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے‘ نبی اکرم ﷺ نے عمرے کی نیت سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ منعقد ہوئی۔ اگرچہ اُس سال حضور ﷺ عمرہ نہ کر سکے‘ وہ دوسرے سال ہوا‘ لیکن اس صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ①﴾ (الفتح)

حدیبیہ میں بظاہر احوال آنحضور ﷺ نے کچھ دب کر صلح کی تھی‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کے تدبر کا شاہکار ہے جس کی توثیق وحی آسمانی نے کی کہ یہ فتح مبین ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد حضور ﷺ کو دو سال کا عرصہ ایسا ملا کہ جس میں گویا قریش کے ہاتھ بندھ گئے تھے۔ اب میدان میں کوئی مزاحمت نہ تھی۔ ایک طرف تو اس صلح نے پورے عرب کے سامنے یہ بات روشن کر دی کہ قریش نے محمد ﷺ اور اُن کے ساتھیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ ایک طرح کی recognition تھی۔ گویا مان لیا گیا تھا کہ اب آنحضور ﷺ اور مسلمان ایک طاقت ہیں (They are a power to reckon with) اب اُن کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ چنانچہ پورے عرب میں آنحضور ﷺ کی دھاک بیٹھ گئی۔ دوسرے قریش کے ہاتھ بندھ گئے اور حضور ﷺ کے ہاتھ پوری طرح کھل گئے۔ آپؐ کا دعوتی اور تبلیغی سلسلہ پورے دو سال کے دوران اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اصحابِ صفہ کی وہ جماعت جو تعلیم وتربیتِ نبویؐ سے تیار ہو رہی تھی اُس کو بکثرت وفود کی شکل میں تبلیغ کے لیے عرب کے کونے کونے میں بھیجا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دعوتِ محمدیؐ جنگل کی آگ کی طرح پورے عرب میں پھیل گئی۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر اور کچھ قریش نے خود اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے ایک عاجلانہ اقدام کے ذریعے صلح کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد اُن کے مدبر رہنما ابوسفیان جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' انہوں نے حالات کے رخ کو پہچان کر پوری کوشش کی کہ اس صلح کی تجدید ہو جائے' لیکن نبی اکرم ﷺ کا دستِ مبارک جس طرح حالات کی نبض کو ٹٹول رہا تھا' اُس سے یہ بات آپؐ کے سامنے بالکل عیاں تھی کہ اب کسی صلح کا دوبارہ کرنا گویا کفر اور شرک کو ایک تازہ مہلتِ زندگی (fresh lease of existence) دینا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے صلح کی اس کوشش کو قبول نہیں فرمایا اور آپؐ نے ۸ ھ میں دس ہزار جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں مکہ کی طرف پیش قدمی کی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو ایک فاتح کی حیثیت سے اُس شہر میں کل آٹھ سال کے اندر اندر داخل کر دیا جہاں سے آٹھ سال قبل آنحضور ﷺ اپنی جان بمشکل بچا کر نکل سکے تھے۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾

فتح مکہ کے فوراً بعد طائف کے قبائل کی طرف سے ایک آخری کوشش ہوئی۔ اس کو یہ سمجھا جانا چاہیے کہ عرب میں کفر اور شرک کی طرف سے یہ آخری ہچکی تھی۔ غزوۂ حنین کی شکل میں یہ مقابلہ ہوا۔ ابتداءً وہاں مسلمانوں کو اپنی کثرتِ تعداد کے پیش نظر جو کچھ زعم ہو گیا تھا اُس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ سبق پڑھانے کے لیے شکست سے دوچار کیا' لیکن بالآخر نبی اکرم ﷺ کی شجاعت نے رخ پھیر دیا جو اُس وقت انتہائی شان کے ساتھ اس طرح ظاہر ہوئی کہ آپؐ اپنی سواری سے اترے' آپؐ نے عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ رجز پڑھا:

اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

اللہ تعالیٰ نے پھر فتح عطا فرمائی۔ یہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر نبی اکرم ﷺ کی فیصلہ کن فتح تھی۔ چنانچہ یہی ہے وہ عمل کہ جس کے نتیجے میں اظہارِ دینِ حق جزیرہ نمائے عرب کی حد تک پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ملک عرب کی حد تک مکمل ہو گیا۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عليه وعلى آله وصحبه وسلم تسليمًا كثيرًا oo

(۸)

انقلابِ نبویؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ...... (سبا:۲۸)

خاتم النبیین اور آخر المرسلین ہونے کی حیثیت سے آنحضورﷺ پر نبوت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔ نبی اکرمﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ ایک بعثت خصوصی اہلِ عرب کی جانب اور ایک بعثتِ عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بھی ممکن تھا کہ آنحضورﷺ اپنی ان دونوں بعثتوں کے ضمن میں اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کا آغاز بیک وقت فرما دیتے‘ یعنی جیسے ہی آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں اپنی رسالت کا دعویٰ ظاہر فرمایا اُسی وقت آپؐ امراء و سلاطین کے نام بھی خطوط ارسال فرما دیتے‘ لیکن آپؐ نے اپنی دعوت و تبلیغ میں جس حکمت اور جس تدریج کو پیشِ نظر رکھا اُس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ۶ ھ تک جبکہ صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور گویا اہلِ عرب نے نبی اکرمﷺ کی قوت کو تسلیم کر لیا‘ آنحضورﷺ نے اپنی تمام تر توجہات اندرونِ ملک عرب مرتکز رکھیں اور بیرونِ ملکِ عرب اپنی کسی دعوتی کوشش کا آغاز نہیں فرمایا۔ البتہ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے قیصرِ روم کے نام بھی‘ کسریٰ فارس کے نام بھی اور آس پاس کی دوسری چھوٹی حکومتوں جیسے مقوقس شاہِ مصر‘ نجاشی شاہِ حبشہ‘ رؤسائے یمامہ اور رؤسائے شام کے نام بھی۔

یہ بات واضح رہے کہ روم اور فارس کو اُس وقت کی دو سپر پاورز کی حیثیت حاصل تھی — آنحضورﷺ کی اصل اہم سفارتیں انہی دو سلطنتوں کی طرف ارسال ہوئیں۔ حضرت دحیہ کلبی ؓ قیصرِ روم کے دربار میں اور حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی ؓ کسریٰ

کے دربار میں بھیجے گئے۔ قیصر اور کسریٰ کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد سامنے آیا۔ قیصر عیسائی تھا' صاحبِ علم تھا' وہ جانتا تھا کہ نبی آخر الزماں کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ اُس نے نامۂ مبارک کی بھی قدر کی اور آپ ﷺ کے سفیر کی بھی عزت افزائی کی۔ بلکہ ہمیں تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک بھرپور کوشش کی کہ کسی طرح پوری سلطنت اُسی طرح اسلام کو قبول کر لے جیسے ماضی میں پوری سلطنت روما نے عیسائیت کو اختیار کیا تھا' تاکہ اُس کی بادشاہت اور حکومت کو کوئی گزند نہ پہنچے' لیکن افسوس وہ اس میں ناکام رہا اور یہی بادشاہت' سیادت اور دنیوی اقتدار اُس کے پاؤں کی بیڑی ثابت ہوا اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہ گیا۔ اس کے برعکس رویہ سامنے آیا کسریٰ کا' اُس نے نامۂ مبارک چاک کر دیا اور نہایت غیظ و غضب کے عالم میں اپنے یمن کے گورنر بازان کو یہ حکم بھیجا کہ محمد (ﷺ) کو گرفتار کر کے ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔ حضور ﷺ نے اس پر تبصرہ فرمایا کہ: ''کسریٰ نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرزے کر دیے ہیں''۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے دور میں یہ پیشین گوئی فی الواقع پوری ہوئی۔ اسی طرح مقوقس شاہِ مصر کی طرف سے بھی ہرقل قیصر روم ہی کا سا طرزِ عمل سامنے آیا' بلکہ اُس نے حضور ﷺ کے نامۂ مبارک کی تکریم بھی کی اور حضور ﷺ کی خدمت میں ہدایا بھی ارسال کیے۔ نجاشی والئ حبشہ پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ الغرض اس طرح نبی اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ ملک سے نکل کر اطراف و جوانب کی طرف وسعت اختیار کر گیا۔

اسی ضمن میں یہ واقعہ پیش آ گیا کہ رؤسائے شام میں سے ایک شخص شرحبیل بن عمرو غسانی نے نبی اکرم ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کے نتیجے میں قصاص کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک جیش روانہ فرمایا اور یہی بات تمہید ہو گئی سلطنت روما کے ساتھ ایک مسلح تصادم کی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے تین ہزار کا ایک لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اس قتل کے قصاص کے لیے روانہ کیا' ادھر سے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر چلا۔ جب حضرت زید بن

حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ تین ہزار اور ایک لاکھ کے مابین ظاہر ہے کہ کسی مقابلے کا کوئی سوال نہیں تھا! لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کو سامنے رکھا کہ ہم تو اصل میں شہادت کے طلب گار ہیں' ہمارے لیے فتح یا شکست بے معنی ہے' ہمیں تو جامِ شہادت نوش کرنا ہے۔ چنانچہ مُوتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اُن کے بعد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے عَلَم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہوئے اور اُن کے جسم پر زخموں کو گنا گیا تو ۹۰ زخم تھے۔ اُن کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے عَلَم سنبھالا' وہ بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معرکے میں صحابہؓ کو کامیابی سے دشمن کے نرغے سے بچا لانے پر سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اگرچہ مقابلہ تو بہرحال نہیں ہو سکتا تھا اور عام معنی میں فتح حاصل ہونی عقلاً محال تھی' لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمالِ تدبیر کے ساتھ اپنے لشکر کو غنیم کے نرغے سے نکال لیا اور واپس تشریف لے آئے۔ جنگِ مُوتہ جو جمادی الاولیٰ ۸ ھ میں ہوئی' یہ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ اسلامی ریاست کا وقت کی ایک عظیم مملکت 'سلطنتِ روما' کے ساتھ پہلا مسلح تصادم تھا۔

اس کے بعد کچھ خبریں ملنی شروع ہوئیں کہ رومی فوجیں جمع کر رہے ہیں اور حملے کا ارادہ رکھتے ہیں' غسان کے تمام قبائل مجتمع ہو کر مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کے نقشے بنا رہے ہیں' تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی طرف سے اقدام فرمانے کے لیے تمام مسلمانوں میں ایک نفیر عام کا اعلان کروا دیا۔ یہ وقت بڑا ہی نازک تھا۔ سلطنت روما کے ساتھ ٹکراؤ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ سلطنت کہ جس کے پاس لاکھوں کی standing armies موجود تھیں' جن کی فوجیں پوری طرح تربیت یافتہ اور قواعد حرب سے پورے طور پر آگاہ اور ہر طرح کے اسلحہ سے پورے طور پر مسلح تھیں' اُن کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ درپیش تھا۔ چنانچہ نفیرِ عام ہوئی کہ ہر صاحب ایمان کو اس معرکے میں شرکت کے لیے نکلنا ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں صرف اسی ایک موقع پر نفیرِ عام ہوئی ہے جسے

غزوۂ تبوک یا سفرِ تبوک کا نام دیا گیا ہے جو ۹ھ میں پیش آیا۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ شدید گرمی کا موسم تھا' ایک طویل مسافت طے کرنی تھی' سلطنت روما سے ٹکراؤ تھا' قحط کی کیفیت تھی' اجناس کی کمی تھی' رسد ساتھ لے جانے کے لیے موجود نہ تھی۔ اُس وقت اہلِ نفاق کا نفاق پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ التوبۃ میں جہاں اس وقت کے حالات پر بڑا بھرپور تبصرہ ہے' منافقین کی طرف سے اس ضمن میں جو جو کچھ کہا گیا اس کا پورا ذکر موجود ہے۔

الغرض اہلِ ایمان نے پورے صبر اور ثبات کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ تیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر نبی اکرم ﷺ نے تبوک کی طرف کوچ کیا جس میں دس ہزار کا رسالہ بھی شامل تھا۔ حضور ﷺ سرحد شام پر پہنچ کر تبوک کے مقام پر قیام پذیر ہوئے اور بیس دن تک وہاں قیام فرما رہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل قیصرِ روم نے مقابلے سے پہلوتہی اختیار کی' اور اُس کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ علم تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لیوا' آسمانی کتابوں کو جاننے والا تھا۔ وہ پہچان چکا تھا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ چنانچہ یہ بات اس کے سامنے بالکل واضح تھی کہ اللہ و رسول (ﷺ) سے مقابلے کرنے کے معنی یقینی شکست کے ہیں' لہٰذا وہ پہلوتہی کرتا رہا' طرح دیتا رہا' مقابلے میں نہ آیا' حالانکہ اُس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں مسلح فوج موجود تھی۔

تبوک میں بیس دن قیام کے دوران آس پاس کے قبائل کے سردار اور رئیس آ کر حضور ﷺ کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کرتے رہے۔ اس طرح عرب کی جو ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی اسے جزیرہ نمائے عرب میں پورا استحکام حاصل ہو گیا' اس کا رعب پورے عرب پر چھا گیا اور اس کی دھاک اطراف و جوانب پر بیٹھ گئی اور نبی اکرم ﷺ بغیر کسی مسلح تصادم کے مدینہ تشریف لے آئے۔

اس کے بعد اپنے مرضِ وفات میں نبی اکرم ﷺ نے پھر ایک جیش تیار کر رکھا تھا جس کی سرکردگی حضرت زید رضی اللہ عنہ بن حارثہ کے فرزند حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو دی گئی تھی۔

یہ ہے درحقیقت تمہید اُس تصادم کی جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے آخری دور میں وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں کے ساتھ ہو گیا تھا اور یہی بعد میں خلافت راشدہ کے دوران اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۹ ھ میں نبی اکرم ﷺ نے حج کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج کی حیثیت سے متعین فرما کر روانہ کیا۔ لیکن جبکہ حضرت ابوبکرؓ روانہ ہو چکے تھے' سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور حضور ﷺ کو حکم دے دیا گیا کہ اعلانِ عام کر دیا جائے اس حج کے موقع پر تمام مشرکین کے لیے کہ عرب کے تمام وہ لوگ جو شرک پر کاربند رہنا چاہیں' وہ کان کھول کر سن لیں کہ اب ان کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی معاہدہ نہیں ہے اور ان سے کامل براءت ہے:

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ① فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ② وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ﴾ (التوبۃ)

''اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو' اور یہ کہ اللہ منکرینِ حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حجِ اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔''

اب اُن کو آخری الٹی میٹم دیا جا رہا ہے کہ چار مہینوں کی مدت کے ختم ہونے کے فوراً بعد اُن کے خلاف عام اقدام شروع کر دیا جائے گا۔ اب یا وہ اسلام قبول کر لیں اور اگر کفر اور شرک پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیرہ نمائے عرب کو خیر باد کہہ کر جہاں سینگ سمائیں چلے جائیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ اعلانِ عام کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور ۹ ھ کے حج کے موقع پر یہ اعلانِ عام ان قبائل کے وفود کے سامنے کر دیا گیا جو حج کے لیے

آئے ہوئے تھے۔

۱۰ھ میں اب محمد رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے لیے بنفسِ نفیس تشریف لے جاتے ہیں۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حج کے موقع پر عرب کے کونے کونے سے سوا لاکھ کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہوئے۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ کی تئیس برس کی محنت شاقہ کا حاصل میدانِ عرفات میں جمع ہو گیا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے عرفات میں بھی خطبہ دیا اور منیٰ میں بھی خطبے ارشاد فرمائے۔ اور ان ہی خطبات کو یکجا کر کے خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک جانب تو حضور ﷺ نے ابتدا ہی میں اپنے وصال کی خبر دے دی کہ:

''لوگو! شاید کہ دوبارہ اس مقام پر ملنا نصیب نہ ہو!''

اُس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کو finishing touches دیے اور اہم چیزوں کا دوبارہ اعادہ کیا۔ اسی کے ضمن میں آپؐ نے فرمایا:

''پوری نوعِ انسانی سماجی اعتبار سے بالکل برابر ہے۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر' کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔''

یہ ہے وہ چیز جس کا بالخصوص ذکر کرتا ہے ایچ جی ویلز اور اعتراف کرتا ہے کہ یہ اصول جو محمدِ عربی (ﷺ) نے بیان فرمایا' یہ محض ایک وعظ نہیں تھا' واقعتاً محمد (ﷺ) نے ان ہی اصولوں پر ایک معاشرہ بالفعل قائم کر دیا۔

خطبے کے آخر میں اب حضور ﷺ نے لوگوں سے ایک سوال کیا:

((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟))

''لوگو! میں نے پہنچا دیا یا نہیں؟''

اور مجمع عام نے بیک زبان یہ جواب دیا:

اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ

''ہاں حضورؐ! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا' حقِ نصیحت ادا کر دیا۔''

حضور ﷺ نے تین مرتبہ سوال کیا اور تین ہی مرتبہ پورے مجمع نے یہی جواب دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے تین مرتبہ انگشتِ شہادت سے پہلے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ، اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ، اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ))

''اے اللہ تو بھی گواہ رہ' اے اللہ تو بھی گواہ رہ' اے اللہ تو بھی گواہ رہ!''

یہ گویا عملی تفسیر ہے سورۃ الفتح کی اس آیت کے آخری حصہ کی کہ:

﴿هُوَ الَّذِىْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾﴾

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے' تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے آخری بات فرمائی کہ مسلمانو! میرا کام ابھی مکمل نہیں ہوا— بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پورے عالم انسانیت تک اس پیغام کو پہنچانا اب تمہارے ذمے ہے:

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))

''اب چاہیے کہ پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔''

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ○○

(۹)

انقلاب دشمن طاقتوں کا خاتمہ

خلافتِ صدّیقی

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾
فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ (النصر)

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری چار سال کے دوران یعنی صلح حدیبیہ کے بعد آنحضور ﷺ کی جدوجہد نے واضح طور پر دو رخ اختیار کر لیے — یعنی ایک طرف آپ ﷺ کی بعثتِ خصوصی ''اِلٰی اَھۡلِ الۡعَرَبِ'' کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا بالفعل قیام اور نفاذ — اور دوسری طرف آپ ﷺ کی بعثتِ عمومی ''اِلٰی کَآفَّۃِ النَّاسِ'' کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پیغامِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تمام اقوام و مللِ عالم کو تبلیغ اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے کے لیے سعی و جُہد کا آغاز۔

حجۃ الوداع کو اس ضمن میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موقع پر ایک طرف یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ اب پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کا دین فیصلہ کن طور پر غالب ہو چکا ہے اور دوسری جانب نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعثتِ عامہ کے فرائض کی تکمیل کے لیے ساری ذمہ داری اُمت کے حوالے فرما دی یہ حکم دے کر کہ:

((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ)

''اب پہنچائیں اس پیغام کو وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں اُن سب لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔''

حجۃ الوداع سے واپسی کے فوراً بعد ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک اس عالمِ ناسوت میں مزید قیام کے لیے بالکل تیار نہ ہو اور اُس پر رفیق اعلیٰ کی جانب مراجعت کا جذبہ شدت سے غالب آ چکا ہو۔ چنانچہ حج کے بعد آپ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے کل اسّی (۸۰) یا نوّے (۹۰) دن ہیں۔ اس لیے کہ مختلف روایات کی رو سے ۱۸ یا ۱۹ یا ۲۸ یا ۲۹ صفر المظفر ۱۳ھ کو نبی اکرم ﷺ کے مرضِ وفات کا آغاز ہو گیا اور ۲ یا ۳' یا ۱۲ یا ۱۳ ربیع الاول کو نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک نے آپؐ کے جسدِ عنصری سے پرواز کر لی۔ آخری ایام میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ پر اب اس دنیا میں جو بھی لمحہ گزر رہا ہے' بڑا شاق گزر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے مرضِ وفات کے دوران آپ ﷺ نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔ جب ذرا افاقہ ہوا اور آپؐ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کے حکم کے مطابق امامت فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُن کی امامت میں نماز ادا فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ تشریف لائے' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا' لیکن حضور ﷺ نے اشارے سے انہیں حکم دیا کہ نماز جاری رکھیں' اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

> ''اللہ نے اپنے ایک بندے کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کی نعمتیں قبول کر لے اور چاہے تو جو کچھ اُس کے پاس ہے' یعنی عالمِ اُخروی کی نعمتیں' انہیں اختیار کر لے' تو بندے نے جو کچھ رب کے پاس ہے' اسے قبول کر لیا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے۔ اس لیے کہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت نبی اکرم ﷺ یہ خود اپنی بات فرما رہے ہیں اور آپؐ نے ہم سے جدائی اور رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا وصال یقیناً اُمتِ مُسلمہ کے لیے اور بالخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے لیے ایک انتہائی رنج و غم' اندوہ اور صدمے کی بات تھی' لیکن ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ جو مشن اُمت کے حوالے کر کے گئے تھے اس کی تکمیل نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے جو نظمِ جماعت قائم فرمایا تھا' اب اس کا

ظہور ہوتا ہے۔ وہ کتنا پختہ نظم جماعت تھا کہ فوراً ہی مشوروں سے تمام مراحل طے پا گئے اور نبی اکرم ﷺ نے جنہیں نماز کی امامت کے لیے آگے بڑھایا تھا اور جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات کے دوران امام بن کر مسلمانوں کو ۱۷ نمازیں پڑھائی تھیں انہی کی خلافت پر اُمت کا اجماع ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ بلاشبہ صِدّیق اکبر ہیں رضی اللہ عنہ۔ اور یہ جان لینا چاہیے کہ مقامِ صدیقیت' مقامِ نبوت سے بہت قرب رکھتا ہے' بلکہ شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا قول تو یہ ہے کہ ''حقیقتِ صدیقی ظلِّ حقیقتِ محمدی است''۔ یعنی مقامِ صدیقی درحقیقت مقامِ نبوت کا ظل اور سایہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں جس انقلاب کی تکمیل فرما گئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کُل اڑھائی سالہ خلافت کے دوران اس کے ازسرِنو استحکام کا عمل بتمام وکمال پورا ہوا۔

تاریخِ عالم میں جتنے انقلابات آئے ہیں ان سب میں آپ کو ایک بات قدرِ مشترک کے طور پر ملے گی کہ انقلاب جب اپنے آخری مراحل میں ہوتا ہے تو اُس وقت انقلاب دشمن طاقتیں کونوں اور کھدروں میں دبک جایا کرتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ پھر جب بھی موقع ہو' وہ سر اٹھائیں اور انقلاب پر حملہ آور ہوں اور اسے ناکام کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہی عمل ہے جو نبی اکرم ﷺ کے وصال کے فوراً بعد ہمیں جزیرہ نمائے عرب میں ہر چہار طرف نظر آتا ہے۔ ایک سماں یہ تھا کہ فرمایا گیا: ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾ (النصر) ''(اے نبی ﷺ!) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج''۔ لیکن حضور ﷺ کے انتقال کے بعد عارضی طور پر منظر یہ سامنے آیا کہ: ''یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا'' کا سا معاملہ ہو گیا۔ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین سے نکلنے لگے۔ ایک جانب نبوتِ کاذبہ کے دعوے دار' جھوٹے مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے اور اُن کی دعوت پر بھی لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے لبیک کہا۔ دوسری طرف ایک کثیر تعداد میں لوگ زکوٰۃ سے انکار کر کے کھڑے ہو گئے کہ ہم توحید کی گواہی دیں گے' ہم رسالت کی گواہی دیں گے' نماز بھی

قائم کریں گے‘ لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بظاہر بہت ہی رقیق القلب انسان تھے۔ آپؓ کا جسم بھی بہت ہی نحیف و نزار تھا‘ لیکن اس موقع پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس بظاہر کمزور شخصیت کے اندر ہمت‘ صبر و استقامت اور ثبات کا ایک کوہ ہمالیہ مضمر ہے۔ چنانچہ آپؓ نے بیک وقت ان تمام فتنوں سے مقابلہ فرمایا۔ حالانکہ بہت سے حضرات نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ کم سے کم مانعین زکوٰۃ کے معاملے میں حکمت عملی کو مدنظر رکھتے ہوئے فی الوقت کسی قدر نرمی سے کام لیا جائے۔ لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اللہ کے رسولؐ کا جانشین ہوں۔ اَنَا خَلِیْفَةُ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جو دین دے کر گئے ہیں اس میں اگر سرِ مُو بھی فرق کرنے کی کوشش کی گئی تو اور کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تن تنہا سب کا مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ آپؓ نے فرمایا کہ ”یہ تو زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں‘ اگر ایسا بھی ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ اُن کی رسیاں بھی آتی ہوں اور اب لوگ اونٹ دینا چاہیں لیکن رسیاں نہ دینا چاہیں تو بھی میں اُن سے قتال کروں گا۔“

یہ ہے وہ عزیمت اور صبر و ثبات کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ابھی اس عالمِ ناسوت میں کچھ عرصہ مزید رہتا تو بہت اچھا ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے انقلاب کے خلاف اٹھنے والی ان تمام مخالفانہ قوتوں (reactionary forces) کا بھی بنفسِ نفیس خود اپنے دست مبارک سے استیصال فرماتے اور انقلاب کو از خود استحکام بخش کر پھر رفیق اعلیٰ کی جانب مراجعت فرماتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکمت خداوندی میں کچھ اور ہی پیش نظر تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس مقام و مرتبہ کا اظہار ہرگز نہ ہو پاتا اگر یہ پوری صورت حال اس طرح پیش نہ آتی جیسی کہ فی الواقع پیش آئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان تمام فتنوں کا استیصال فرماتے اور ان تمام انقلاب دشمنوں کا سر کچل کر انقلابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو از سرِ نو مستحکم فرماتے۔ کل اڑھائی برس میں آپؓ نے اپنے رفیقِ

غارﷺ کے انقلاب کو مستحکم کیا اور پھر اللہ کی طرف مراجعت اور اپنے رفیقِ غار' اپنے محبوب' اپنے رسول ﷺ کے پہلو میں تا قیامِ قیامت استراحت فرمائی۔

دوسری جانب چونکہ خلافتِ راشدہ درحقیقت نبوی مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے' یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا شروع کیا کہ آپ خلیفۃ اللہ ہیں یا خلیفۃ المسلمین ہیں' تو انہوں نے فرمایا: نہیں! مَیں تو خَلِیفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ہوں۔ خلافتِ راشدہ کو اسی وجہ سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے' نبوت کے نقش قدم پر خلافت۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت عامہ یعنی آپ کی رسالت کے مقاصد میں سے جس مقصد کا تعلق پورے عالمِ ارضی سے تھا اس کی تکمیل کے لیے جس عمل کا آغاز نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس فرمایا تھا اس کو بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھایا۔

جیشِ اسامہؓ کا معاملہ اس حوالے سے بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اُن کے بارے میں بھی بہت سے حضرات نے پُرخلوص مشورہ دیا کہ فی الوقت اندرونِ ملک عرب اتنے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپؓ صرف ان سے نبرد آزما ہو جائیں تو بہت کافی ہے' سردست اس لشکر کی روانگی ملتوی فرما دیجیے۔ لیکن یہاں بھی وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اُسی عزیمت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ جس لشکر کی روانگی کا فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اُس کی روانگی کو مؤخر کرنے والا میں کون ہوں؟ یہ تو پھر خلافت کا تقاضا نہ ہوا' یہ تو حضور ﷺ کے کیے ہوئے فیصلوں کا ایک reversal ہے' ان میں ترمیم ہو جائے گی۔ چنانچہ جیشِ اُسامہؓ کو روانہ کیا گیا۔ اور اس فیصلہ کو بھی قائم رکھا گیا کہ اس کی امارت حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ہی کو دی گئی' حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ اس پر بھی جب یہ کہا گیا کہ ذرا اس فیصلے میں ترمیم کر لیجیے تو پھر اس جانشینِ رسولؐ کا وہی قول سامنے آیا کہ جس کو عَلَم سنبھلوایا ہو محمد رسول اللہ ﷺ نے' میں اُس کے ہاتھ سے عَلَم لینے والا کون ہوتا ہوں؟

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جب لشکر لے کر چلے تو اُن کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت پیدل چلے اور جب حضرت اسامہؓ احتراماً سواری سے اترنے لگے تو منع فرما دیا۔ یہ ہے شان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور یہ ہے درحقیقت مقام اور مرتبہ خلافتِ صدّیقی کا!

ایک اور بہت بڑا احسان جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُمتِ مُسلمہ پر فرمایا' وہ ہے قرآن مجید کا جمع کرنا ——— جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک معروف معنی میں ایک کتاب کی شکل میں جمع نہ تھا' یعنی ''مَابَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ'' جیسے ایک کتاب ہوتی ہے' جلد کے دو گتوں کے مابین' صفحات میں مرتب صورت میں لکھی ہوئی' ایسے نہ تھا۔ اگرچہ ترتیب کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دیا تھا۔ ترتیب آپؐ نے قائم بھی فرما دی تھی۔ آیات کو جمع کر کے سورتوں کی شکل دینا اور سورتوں کا باہمی نظم اور ربط' یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر دیا تھا۔ لیکن ابھی کسی کے پاس لکھی ہوئی کچھ سورتیں تھیں' کسی کے پاس کچھ اور دوسری سورتیں تھیں' کہیں کپڑے پر لکھی ہوئی' کہیں ہڈیوں پر لکھی ہوئی' کہیں کاغذوں پر لکھی ہوئی' اور سب سے بڑھ کر لوگوں کے سینوں میں قرآن مجید محفوظ تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ان میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش فرمایا' خصوصاً جنگِ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے' تب یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن ایک مصحف کی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ اس خیال کو سب سے پہلے ظاہر کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں کہ قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر لیا جائے' ایسا نہ ہو کہ حُفّاظ کی کثیر تعداد شہید ہو جائے اور کہیں قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اس ارادہ خداوندی کی تعمیل ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کاتب وحی رہے تھے' حکم دیا کہ وہ قرآن مجید کو جمع کریں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اگر کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہوتی تو وہ بھی مجھ پر اتنی بھاری نہ ہوتی جتنا بوجھ میں نے اس ذمہ داری کا محسوس کیا۔

بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع میں تو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ:

غارﷺ کے انقلاب کو مستحکم کیا اور پھر اللہ کی طرف مراجعت اور اپنے رفیقِ غار' اپنے محبوب' اپنے رسول ﷺ کے پہلو میں تا قیامِ قیامت استراحت فرمائی۔

دوسری جانب چونکہ خلافتِ راشدہ درحقیقت نبوی مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے' یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا شروع کیا کہ آپ خلیفۃ اللہ ہیں یا خلیفۃ المسلمین ہیں' تو انہوں نے فرمایا: نہیں! مَیں تو خَلِیفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ہوں۔ خلافتِ راشدہ کو اسی وجہ سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے' نبوت کے نقش قدم پر خلافت۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت عامہ یعنی آپؐ کی رسالت کے مقاصد میں سے جس مقصد کا تعلق پورے عالمِ ارضی سے تھا اس کی تکمیل کے لیے جس عمل کا آغاز نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس فرمایا تھا اس کو بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھایا۔

جیشِ اسامہؓ کا معاملہ اس حوالے سے بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اُن کے بارے میں بھی بہت سے حضرات نے پُرخلوص مشورہ دیا کہ فی الوقت اندرونِ ملک عرب اتنے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپؓ صرف ان سے نبرد آزما ہو جائیں تو بہت کافی ہے' سردست اس لشکر کی روانگی ملتوی فرما دیجیے۔ لیکن یہاں بھی وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اُسی عزیمت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ جس لشکر کی روانگی کا فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اُس کی روانگی کو مؤخر کرنے والا میں کون ہوں؟ یہ تو پھر خلافت کا تقاضا نہ ہوا' یہ تو حضور ﷺ کے کیے ہوئے فیصلوں کا ایک reversal ہے' ان میں ترمیم ہو جائے گی۔ چنانچہ جیشِ اُسامہؓ کو روانہ کیا گیا۔ اور اس فیصلہ کو بھی قائم رکھا گیا کہ اس کی امارت حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ہی کو دی گئی' حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ اس پر بھی جب یہ کہا گیا کہ ذرا اس فیصلے میں ترمیم کر لیجیے تو پھر اس جانشینِ رسولؐ کا وہی قول سامنے آیا کہ جس کو عَلَم سنبھلوایا ہو محمد رسول اللہ ﷺ نے' میں اُس کے ہاتھ سے عَلَم لینے والا کون ہوتا ہوں؟

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جب لشکر لے کر چلے تو اُن کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت پیدل چلے اور جب حضرت اسامہؓ احتراماً سواری سے اترنے لگے تو منع فرما دیا۔ یہ ہے شان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور یہ ہے درحقیقت مقام اور مرتبہ خلافتِ صدیقی کا!

ایک اور بہت بڑا احسان جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُمتِ مُسلمہ پر فرمایا' وہ ہے قرآن مجید کا جمع کرنا ـــــ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک معروف معنی میں ایک کتاب کی شکل میں جمع نہ تھا' یعنی ''مَابَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ'' جیسے ایک کتاب ہوتی ہے' جلد کے دو گتوں کے مابین' صفحات میں مرتب صورت میں لکھی ہوئی' ایسے نہ تھا۔ اگرچہ ترتیب کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دیا تھا۔ ترتیب آپؐ نے قائم بھی فرما دی تھی۔ آیات کو جمع کر کے سورتوں کی شکل دینا اور سورتوں کا باہمی نظم اور ربط' یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر دیا تھا۔ لیکن ابھی کسی کے پاس لکھی ہوئی کچھ سورتیں تھیں' کسی کے پاس کچھ اور دوسری سورتیں تھیں' کہیں کپڑے پر لکھی ہوئی' کہیں ہڈیوں پر لکھی ہوئی' کہیں کاغذوں پر لکھی ہوئی' اور سب سے بڑھ کر لوگوں کے سینوں میں قرآن مجید محفوظ تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ان میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش فرمایا' خصوصاً جنگِ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے' تب یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن ایک مصحف کی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ اس خیال کو سب سے پہلے ظاہر کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں کہ قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر لیا جائے' ایسا نہ ہو کہ حُفّاظ کی کثیر تعداد شہید ہو جائے اور کہیں قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اس ارادۂ خداوندی کی تعمیل ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کاتب وحی رہے تھے' حکم دیا کہ وہ قرآن مجید کو جمع کریں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اگر کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہوتی تو وہ بھی مجھ پر اتنی بھاری نہ ہوتی جتنا بوجھ میں نے اس ذمہ داری کا محسوس کیا۔

بہر حال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع میں تو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ: كِتَابُ اللّٰهِ))

(صحیح مسلم' کتاب الحج)

''اور یقیناً میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سرشتہ اگر مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے' اور وہ چیز ہے کتاب اللہ!''

یعنی اے میری اُمت! میں جا رہا ہوں' لیکن تمہیں بے سہارا اور بے یارومددگار نہیں چھوڑ کر جا رہا' بلکہ تمہارے مابین وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ جسے اگر مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔ تو یہ بھی مقامِ صدیقیت اور مقامِ نبوت کے باہمی اتصال کا ایک مظہر ہے کہ اس کتاب کو بین الدفّتین کی شکل دی حضرت ابوبکر صدیق نے' رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتابِ الٰہی سے صحیح تمتع کی توفیق عطا فرمائے۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدِ نِ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ٥

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥٥

(۱۰)

انقلابِ نبویؐ کی توسیع

خلافتِ فاروقی وعثمانی رضی اللہ عنہما

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ ...... (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے' اور ان کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے......''

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بجا طور پر اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ خلافت راشدہ درحقیقت نبوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تتمہ ہے' اور یہ بات اس لیے بالکل قرین قیاس ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بعثتِ عامہ ہے' یعنی آپؐ کی بعثت پوری دنیا کی طرف' تمام عالمِ انسانی کی طرف' اُس کے فرائض کی تکمیل خلافتِ راشدہ کے ذریعے ہوئی۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عمل کا آغاز بنفسِ نفیس فرمادیا تھا' اسے خلفائے راشدینؓ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے' پھر غزوۂ موتہ' پھر سفرِ تبوک کے مراحل درپیش ہوئے' اور پھر جیشِ اُسامہ کی تیاری اور اس کی روانگی کے انتظام سے جس عمل کا آغاز ہوا اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں آگے بڑھایا۔ چنانچہ ملک شام میں مسلمانوں کی پیش قدمی آپؓ کے دورانِ خلافت بھی کافی حد تک ہو چکی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی

فتوحات کا سیلاب۔ جس کو بجا طور پر تعبیر کیا علامہ اقبال نے اس طرح کہ: ع

رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!

یہ نقشہ عہدِ خلافتِ فاروقی اور عہدِ خلافتِ عثمانی میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کی مدت کُل دس سال ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارہ سال میں پہلے دس سال کی شان بالکل وہی ہے جو خلافت فاروقی کی تھی۔ وہی اتحاد‘ وہی یک جہتی‘ وہی ذوقِ جہاد‘ وہی جوشِ عمل‘ وہی شوقِ شہادت جو ہمیں دورِ نبویؐ میں اور عہدِ صدیقیؓ میں نظر آتا ہے‘ ان بیس سالوں کے دوران یعنی خلافت فاروقی و عثمانی میں بھی بتمام وکمال نظر آ رہا ہے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخری دو سال میں افتراق و انتشار بھی ہوا اور فتنہ و فساد کی شکل بھی سامنے آئی‘ جس کے اسباب پر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں۔

بہرحال یہ عمل جو تقریباً ایک رُبع صدی تک نہایت آب و تاب کے ساتھ جاری رہا ہے‘ اس کے بارے میں ایک بات تو یہ جان لینی چاہیے کہ اس کی اصل غرض و غایت کشور کشائی نہ تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن

نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یہ عام دُنیوی فتوحات‘ یا دوسرے فاتحین کی دنیا میں پیش قدمی سے بالکل ایک مختلف معاملہ ہے۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے‘ جو فاتح ایران ہیں‘ ایرانیوں کی جانب سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ ہم پر کیوں چڑھ آئے ہیں؟ یہ جنگ کس لیے ہے؟ ہمارے مابین تو کوئی تنازعات بھی نہ تھے۔ تو حضرت سعدؓ نے وہ جواب دیا جو تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور جو تا قیامِ قیامت روشن و تاباں رہے گا۔ آپؓ نے ایرانیوں کے سوال کے جواب میں کہا: **اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ اِلٰی نُوْرِ الْاِیْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ** کہ ہم بھیجے گئے ہیں‘ ہم خود نہیں آئے‘ ہم ایک مشن پر ہیں اور وہ مشن یہ ہے کہ ہم نوعِ انسانی کو

جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم وستم سے نجات دلا کر اسلام کے عدل سے روشناس کریں۔ چنانچہ یہ وہی بات ہے کہ اصل مقصد شہادتِ حق تھا۔ شہادت کے ایک معنی اللہ کی راہ میں گردن کٹوا دینے کے بھی ہیں' اور اس طرح گویا یہ ہر مجاہد فی سبیل اللہ کا ایک انفرادی نصب العین ہے۔ یہ وہ تمنا ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان پر آ رہی ہے۔ چنانچہ احادیث میں یہ دعائیں منقول ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ (۱)

''اے اللہ! میں تجھ سے تیرے راستہ میں شہادت کا طلب گار ہوں۔''

اور

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ (۲)

''اے اللہ! مجھے اپنے راستہ میں شہادت عطا فرما۔''

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آرزو تو متعدد احادیث میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ وارد ہوئی ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ، لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ)) (صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میری آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں (جہاد کروں اور) قتل کر دیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر (اللہ کی راہ میں) قتل ہونے کی سعادت سے شاد کام ہوں۔ اور پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں!''

---

(۱) دستیاب کتب حدیث میں یہ دعائیہ الفاظ رسول اللہ ﷺ سے کسی مرفوع روایت میں نہیں مل سکے۔ تاہم موطا امام مالک میں یہ الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا کے ضمن میں روایت ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو موطا امام مالك' کتاب الجھاد' باب ما تکون فیه الشھادة' ح ۱۰۰۶۔ (مرتب)

(۲) یہ بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دعا کے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو صحیح البخاری' کتاب الحج' باب کراھیة النبی ﷺ ان تعری المدینة' ح ۱۷۹۱۔ (مرتب)

یہ بات دوسری ہے کہ اپنے رسولوں کے بارے میں اللہ کی یہ سنت ہے' اس کا یہ اٹل قانون ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ط﴾ (المجادلة: ۲۱) ''اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔'' اور جو مغلوب نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ وہ مقتول کیسے ہو سکتا ہے! چونکہ قتل مغلوبیت کی علامت ہے لہٰذا حضور ﷺ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ لیکن لفظ شہید کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں جس کی رو سے ہر رسول شہید ہے اور اس شہید کے معنی ہیں گواہ۔ اسی بات کو سورۃ النساء کی آیت ۴۱ میں واضح کیا گیا کہ عدالتِ اُخروی میں تمام رسول شہید یعنی گواہ بنا کر پیش کیے جائیں گے۔ فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾

''پس سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر (اے محمد ﷺ!) آپ کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔''

یہ شہادت علی الناس کا فریضہ اپنے قول اور اپنے عمل سے دنیا میں حق کی گواہی دینا ہے۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اُمت کے حوالے فرما کر اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ یہ بات سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ وارد ہوئی:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (آیت ۱۴۳)

''(اے مسلمانو!) ہم نے اسی طرح تمہیں ایک بہترین اُمت بنایا ہے' تاکہ تم گواہی دو پوری نوعِ انسانی پر اور اللہ کے رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔''

یہ بات سورۃ الحج (آیت ۷۸) میں بھی آتی ہے۔ وہاں مسلمانوں کو للکارا جا رہا ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ:

﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰىكُمْ......﴾

''اور اللہ کی راہ میں محنت اور جدوجہد کرو جیسا کہ اُس کے لیے محنت اور سعی و کوشش کرنے کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں چن لیا ہے......''

یہ چناؤ' یہ انتخاب اور یہ ''اجتباء'' کس مقصد اور کس غایت کے لیے کیا گیا ہے!

اس کو اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

﴿لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾

''تا کہ رسول گواہی دے تم پر اور تم گواہی دو پوری نوعِ انسانی پر۔''

چنانچہ خلافتِ راشدہ کے دوران ہمیں وہ نظامِ دینِ حق' وہ نظامِ عدلِ اجتماعی انصاف و قسط کے اصول پر بالفعل قائم و نافذ نظر آتا ہے جس کی آج کے انسان کو اصل ضرورت ہے۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ جہاں تک انفرادی اخلاقیات کا تعلق ہے سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے ہاں بھی وہ اپنے پورے نقطہ عروج پر ہیں' اگرچہ اس اعتبار سے بھی ایک امتیازی شان ہے سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی کہ ہم اُس میں تمام اخلاقی اقدار کو ایک بڑے توازن اور جامعیت کے ساتھ سمویا ہوا پاتے ہیں' لیکن نبی اکرم ﷺ کا اصل احسان' آپؐ کی اصل contribution وہ نظامِ اجتماعی ہے جس میں عدل و قسط ہے' انصاف ہے۔ ظلم سے پاک معاشرہ اور وہ نظام جو حضور ﷺ نے دیا' ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی پوری exfoliation' اس کی برکات کا بتمام و کمال ظہور' گویا lily in bloom نظر آتا ہے دورانِ خلافتِ راشدہ میں' اس لیے کہ حضور ﷺ کے عہد میں تو ابھی انقلاب کا عمل جاری تھا' ابھی انقلاب تکمیل کو پہنچا ہی تھا کہ حضور ﷺ نے ''رفیقِ اعلیٰ'' کی طرف مراجعت فرمائی۔

اس نظام کی برکات ظاہر ہوئیں بالخصوص دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف حریت ہے تو اس کا عالم یہ ہے کہ ایک خاتون بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے فرماں روا کو ٹوک سکتی ہے۔ اور ایک خاتون کی تنقید پر حضرت عمرؓ اپنا ایک آرڈیننس واپس لے لیتے ہیں' جاری شدہ حکم منسوخ فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک گدڑی پوش' ایک درویشِ بے نوا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ برسرِ عام عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوک دیتا ہے اور دورانِ خطبہ کہتا ہے: لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ یعنی نہ سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دریافت کرتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خالص نجی تنقید ہے کہ یہ کُرتا جو آپؓ نے پہنا ہوا ہے' ان چادروں سے بنا ہے جو مالِ غنیمت میں

آئی تھیں اور ہر مسلمان کو جتنا حصہ ملا تھا اُس سے کرتا نہیں بنتا۔ اور آپؓ تو ہم میں سے ہیں بھی طویل القامت انسان‘ تو یہ کرتا کیسے بن گیا؟ وقت کے عظیم ترین فرماں روا پر عین مجمع عام میں یہ بالکل ذاتی تنقید ہو رہی ہے۔ آزادی اور حریت کا یہ عالم ہے‘ اظہارِ رائے کی یہ کیفیت ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وضاحت کے لیے اپنے بیٹے کو حکم دیتے ہیں کہ عبداللہ! لوگوں کو اصل صورت حال بتلاؤ۔ اور جب وہ صراحت فرما دیتے ہیں کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا بھی ابا جان کو دے دیا تھا تا کہ ان کی قمیص مکمل ہو جائے تو اب وہی درویشِ بے نوا علی الاعلان کہتا ہے: اَلْآنَ نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ ’’ہاں اب ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے!‘‘

مساوات اگر کوئی قدر ہے‘ اور یقیناً ایک اعلیٰ قدر ہے‘ تو اس کا بھی ہمیں یہ منظر نظر آتا ہے کہ وقت کی عظیم ترین مملکت کا فرماں روا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہے‘ وہ بیت المقدس کا سفر کر رہا ہے اور کس شان سے! یہ ذاتی سفر نہیں ہے‘ سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لیے جا رہے ہیں‘ لیکن ایک اونٹ اور ایک خادم کے ساتھ۔ اور حال یہ ہے کہ ایک منزل خلیفۃ المسلمین اونٹ کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور غلام یا خادم نکیل تھامے آگے چل رہا ہے‘ اور اگلی منزل میں معاملہ بالکل برعکس ہے کہ خادم اونٹ کی سواری کر رہا ہے اور خلیفۃ المسلمین نکیل تھامے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے ہیں —— اسی طرح عدل اگر حقیقتاً کسی شے کا نام ہے تو یہ بتمام وکمال نظر آئے گا اسی عہد خلافت راشدہ میں کہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیٹا مصر میں ایک قبطی کو ناحق مارتا ہے‘ اور وہ قبطی حج کے موقع پر فریاد لے کر آتا ہے تو حضرت عمرؓ اس قبطی کے ہاتھ سے گورنر کے بیٹے کو قصاص میں کوڑے لگواتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ذرا ایک دو ضربیں اس کے والد کو بھی لگاؤ‘ اس لیے کہ درحقیقت اس نے اپنے باپ کی گورنری کے زعم ہی میں تم پر یہ ظلم کیا تھا۔ اور وہ شخص پکار اٹھتا ہے کہ نہیں‘ مجھے میرا بدلہ مل گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں

اور اُن کا دعویٰ صرف اس لیے خارج ہو جاتا ہے کہ ان کے پاس گواہیاں صرف دو تھیں' ایک اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اور ایک غلام کی' اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ کسی شخص کے حق میں اُس کے بیٹے اور اُس کے ذاتی غلام کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی' لہٰذا آپ کا دعویٰ خارج ہے۔

حریت ہو' مساوات ہو' عدل و انصاف ہو' یہ تمام اقدار کہ جن کی یوں سمجھئے کہ نوعِ انسانی کو شدید ضرورت ہے' ان سب کو ایک معتدل نظام کے اندر سمو کر اس عدلِ اجتماعی کو بالفعل خلافت راشدہ نے قائم کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا' جس کے لیے آج نوعِ انسانی تڑپ رہی ہے۔ یہ ہے وہ حجت جو خلافت راشدہ کے ذریعے تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی کے لیے قائم ہو چکی ہے۔

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ o

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ oo

(۱۱)

اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کے اہم خدوخال

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ فِى ٱلْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى ٱلْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿٤﴾ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُو۟لِى بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا۟ خِلَٰلَ ٱلدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ﴿٥﴾ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ ٱلْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَٰكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ﴿٦﴾ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ ٱلْءَاخِرَةِ لِيَسُـۥٓـُٔوا۟ وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا۟ ٱلْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا۟ مَا عَلَوْا۟ تَتْبِيرًا ﴿٧﴾ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَٰفِرِينَ حَصِيرًا ﴿٨﴾ (بنی اسراء یل)

"اور ہم نے (اُن کی) کتاب (تورات و دیگر صحف) میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان دو میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو (اے بنی اسرائیل!) ہم نے تمہارے مقابلے میں اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اس طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر

ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے۔ اور کفرانِ نعمت کرنے والے لوگوں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔''

قرآن حکیم کے بالکل وسط میں سورۂ بنی اسرائیل واقع ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے چار ادوار کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کا، جس کا اعلان ان کی کتاب (تورات و دیگر صحف) میں کر دیا گیا تھا، اظہار فرمایا ہے کہ ان پر اپنی تاریخ کے دوران دو مرتبہ عذابِ الٰہی کے کوڑے برسے ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث میں آنحضور ﷺ کا یہ فرمان نقل ہوا ہے:

((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

''میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے تھے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔''

اس حدیث کی روشنی میں اگر ہم دیکھیں تو اُمت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ بھی چار ادوار میں منقسم نظر آتی ہے، جیسے چار ادوار بنی اسرائیل کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ دو عروج اور دو زوال ــــ ان کے عروجِ اوّل کا نقطہ کمال (climax) حضرت طالوت، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کا عہدِ حکومت ہے۔ اس کے بعد زوالِ اوّل آتا ہے، جو ۵۸۷ قبل مسیح میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ بخت نصر (Nebukadnazar) کے حملے کے وقت بیت المقدس تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے، ہیکلِ سلیمانی مسمار کر دیا جاتا ہے، لاکھوں یہودی قتل ہوتے ہیں اور چھ لاکھ یہودیوں کو وہ اسیر بنا کر بابل (Babilonia) لے جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے عروج کا ایک دور آتا ہے، جس کا سب سے بڑا مظہر سلطنت مکابی کا ظہور ہے۔ پھر وہ اپنے دوسرے زوال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کا آغاز ۸۰ء میں رومی جنرل ٹائٹس (Titus) کے حملے سے ہوتا ہے، جس نے پھر بیت المقدس کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے بعد سے اب تک بنی اسرائیل پستی و زوال اور اضمحلال کا شکار ہیں۔ وقفے وقفے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کوڑے ان کی پیٹھ پر برس رہے ہیں۔ ماضی قریب میں سلطنت اسرائیل کی شکل میں انہوں نے ذرا سا سانس لیا ہے، لیکن یہ

معلوم ہے کہ وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ امریکہ کی شہ پر اور اسی کے سہارے سے۔

اس نقشے کو پس منظر میں رکھیے اور اب آئیے اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ کی جانب۔ ہمارا عروجِ اوّل تقریباً ۴۰۰ سو سال پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ عروج ساتویں' آٹھویں' نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ یہ عروج عربوں کے زیر قیادت ہوا۔ یہ چار سو سال ایسے گزرے ہیں کہ زمین پر عظیم ترین مملکت' اسلامی مملکت تھی۔ اور یہ اسلامی مملکت صرف ایک عسکری اور سیاسی قوت نہ تھی بلکہ اس میں تہذیب و تمدن اور علوم وفنون اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہ ہمارا پہلا عروج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں اس سے پہلے اتنی عظیم الشان مملکت کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ لیکن پھر ہمارا زوال آیا۔ اس زوال کا اصل سبب جان لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں بطور تنبیہ (warning) ارشاد فرمایا گیا تھا:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (محمد:۳۸)

یعنی اے محمد ﷺ کے ماننے والو! اگر تم نے پیٹھ موڑ لی' اُن مقاصد کی تکمیل کے بجائے جو محمد ﷺ کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے تمہارے سپرد کیے گئے ہیں' اگر تم نے اپنی ذاتی منفعت اور ذاتی اقتدار کو ہی مطلوب و مقصود بنا لیا اور تم بھی دنیا کے عیش میں پڑ گئے تو جان لو کہ ہماری سنت کا ظہور ہوگا۔ ہم تمہیں ہٹائیں گے' کسی اور کو لے آئیں گے۔

ظاہری اعتبار سے اسبابِ زوال کا خلاصہ مطلوب ہو تو وہ علامہ اقبال کے اس شعر میں موجود ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل' طاؤس و رباب آخر!

چنانچہ جب ہمارا حال بھی ''طاؤس و رباب آخر'' کی تصویر بن گیا تو ہم زوال سے دوچار ہوئے۔ عذابِ الٰہی کے کوڑے ہماری پیٹھ پر برسے' پہلے صلیبیوں کی شکل میں اور پھر فتنۂ تاتار کی صورت میں۔ پھر ۱۲۵۸ء میں وہ اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے جب سلطنت یا خلافت بنی عباس کا چراغ گُل ہو گیا اور عالمِ اسلام پورے کا پورا ایسے ضعف و اضمحلال کا

شکار ہوا کہ بظاہر احوال کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسے دوبارہ بھی اٹھنا نصیب ہوگا۔ لیکن پھر اُسی سنت الٰہی کا ظہور ایک عجیب شان کے ساتھ ہوا۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

اللہ نے جن کو عذاب کا کوڑا بنا کر مسلمانوں کی پیٹھ پر برسایا تھا' انہی کو ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرما دی' انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا عَلَم تھما دیا۔ چنانچہ یہ تین ترک قبیلے ہی ہیں کہ جن کی زیر سیادت و قیادت پھر اسلام کو اپنے دوسرے عروج کا دور دیکھنا نصیب ہوا۔ ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم مملکت قائم کی۔ صفوی حکومت جو ایران میں قائم ہوئی' اصلاً وہ بھی ایک ترک حکومت تھی۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) قائم ہوئی اور پورا عالمِ عرب اور پورا شمالی افریقہ اس کے زیر نگیں آیا۔ انہی کے ہاں پھر خلافت کا احیاء ہوا۔ چوتھی بنوامیہ کی وہ سلطنت جو اندلس میں تھی۔ ان چار عظیم مملکتوں کی صورت میں دنیا میں پھر مسلمانوں کی سطوت کا ڈنکا بجا۔

لیکن اس عروج کے بعد پھر زوالِ ثانی آیا۔ یہ درحقیقت یورپی استعمار کے ہاتھوں آیا۔ اس کا نقطۂ آغاز پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر سلطنت اندلس (ہسپانیہ) کا زوال ہے۔ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد یوں سمجھئے کہ وہ سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ گئی جس کا مرثیہ علامہ اقبال نے اس طرح کہا ہے: ؎

غلغلوں سے جس کی لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

اس کے بعد ۱۵۴۸ء میں واسکوڈے گاما نے وہ راستہ تلاش کر لیا جس سے مغربی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے دائیں بازو یعنی مشرقِ بعید (Far East) پر حملہ آور ہوا۔ ملایا اور انڈونیشیا کی مملکتیں اور اس کے بعد ہندوستان کی عظیم سلطنت مغربی استعمار کا نوالہ بن گئیں۔ ہماری بڑی بڑی سلطنتیں اور مملکتیں کچے گھروندوں کے مانند مغربی استعمار کے سیلاب میں بہتی چلی گئیں۔ یہ عمل بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنے نقطۂ عروج کو

پہنچا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا یہ نقشہ سامنے آیا کہ سلطنت عثمانیہ ختم ہوگئی اور ترکی کے نام سے ایک چھوٹا سا ملک باقی رہ گیا۔ پورا عالم عرب مغلوب ہوگیا' اس کے حصے بخرے کر لیے گئے۔ اس کی خبر دی تھی نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں:

((يُوْشِكُ الْأُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا))

یعنی ''مسلمانو! اندیشہ ہے کہ تم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دستر خوان چنے جانے کے بعد مہمانوں کو بلایا کرتا ہے کہ آئیے اب کھانا تناول فرمائیے۔ اس طرح تم اقوامِ عالم کے لیے لقمۂ تر ہو جاؤ گے۔''

صحابہ نے بڑے تعجب کے ساتھ سوال کیا:

مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟

''حضور! کیا یہ اس لیے ہوگا کہ اس روز ہماری تعداد بہت کم ہو جائے گی؟'' حضور ﷺ نے فرمایا:

((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ ، وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ))

یعنی ''نام کے مسلمان تو بہت ہوں گے' تمہاری تعداد تو بہت ہوگی لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے اوپر کے جھاگ کے مانند ہو کر رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔''

اس پر سوال ہوا:

مَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟

''اے اللہ کے رسول! وہن کیا چیز ہے؟''

تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ))

''دنیا کی محبت اور موت سے کراہت!''

یہ حدیث سنن ابی داؤد' کتاب الملاحم میں وارد ہوئی ہے۔ یہ نقشہ جو ہمیں اس حدیث نبویؐ میں نظر آتا ہے' بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں عالمِ اسلام میں بچشم سر دیکھا گیا ہے۔

وہ وقت تھا جب ایک دلِ دردمند کی صدا سننے میں آئی تھی۔ مولانا حالی نے مسدس کی پیشانی پر جو شعر لکھے ہیں وہ اسی صورتِ حال کے عکاس ہیں:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور خاتمے پر بحضور سرورِ عالم ﷺ جو مناجات ہے، اس کا آغاز ان اشعار سے ہوا: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

یہ تھا نقشہ بیسویں صدی کے آغاز میں۔ البتہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس کے بعد سے اب تک ایک دوہرا عمل ہمارے سامنے آیا ہے۔ ایک طرف ہمارے انحطاط اور زوال و اضمحلال کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے، بیت المقدس دوسری مرتبہ ہمارے ہاتھ سے چھنا اور اب بھی وہ ایک مغضوب علیہم قوم کے قبضے میں ہے، سقوطِ ڈھاکہ اور عرب اسرائیل جنگوں میں جو مسلمانوں کو شکستیں ہوئیں، یہ عذابِ الٰہی کے کوڑے ہیں جو ہماری پیٹھ پر برس رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک احیاء و تجدید کی تحریک بھی شروع ہو چکی ہے اور ایک احیائی عمل کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اس کے پہلے مرحلے (phase) سے بحمد اللہ اور بفضلہٖ تعالیٰ امت مسلمہ کسی حد تک گزر بھی چکی ہے۔ چنانچہ پورے عالم اسلام سے مغربی استعمار کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس سیلاب کا رخ موڑا جا چکا ہے۔ سیاسی اعتبار سے تقریباً پورا عالم اسلام آزادی حاصل کر چکا ہے، اگرچہ ذہنی غلامی ابھی باقی ہے، تہذیبی و علمی اور فنی غلامی ابھی برقرار ہے۔

بایں ہمہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے کہ سیاسی طور پر عالمِ اسلام کی عظیم اکثریت

آزادی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ تاہم اصل کام ابھی باقی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

وہ کام جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ اُمت کے حوالے فرما کر گئے تھے' آپؐ کی جو امانت ہمارے پاس ہے' وہ فرضِ منصبی جو بحیثیتِ اُمت ہمارے کاندھوں پر ہے جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے کاندھے پر آیا تھا تو وحیِ آسمانی نے پیشگی طور پر فرما دیا تھا کہ:

﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ (المزمل)

''(اے محمد ﷺ!) ہم آپ پر ایک بڑی بات ڈالنے والے ہیں۔''

یہی بھاری بوجھ ہے جو اب اُمتِ مُسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ یہ امت پیغامِ محمدیؐ کی امین ہے' یہ دینِ خداوندی کی علمبردار ہے۔ اس پیغام کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا اس کے ذمے ہے' اس دین کو قائم اور نافذ کرنا اور پھر نوعِ انسانی کو اس نظامِ عدلِ اجتماعی سے روشناس کرانا جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں لائے تھے' یہ ہے ہمارا فرضِ منصبی' یہ ہیں ہماری ذمہ داریاں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا عروج اور ہماری عزت ووقار کا معاملہ دوسری قوموں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دنیا میں معزز اور سربلند اُس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے محنت' سعی وکوشش اور جدوجہد نہ کریں ؎

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!

گویا ہمارے عروج وزوال کا معاملہ دنیا کی عام قوموں کے عروج وزوال کے اسباب سے بالکل جدا ہے۔ ہمارے ذمے جو فرضِ منصبی ہے' اگر اس کو ادا کریں گے تو تائیدِ خداوندی ہمارا ساتھ دے گی۔ بقول علامہ اقبال ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں!

فَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ○

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ○○

(۱۲)

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

اور

نبویؐ مشن کی تکمیل اور ہمارا فرض

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف)

''پس جو لوگ ایمان لائے اُن (نبی کریم ﷺ) پر اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور جذبہ احترام کے ساتھ انؐ کی مدد و حمایت کی (اُن کے کام اور ان کے مشن میں اُنؐ کے دست و بازو بنے اور انؐ کے فرضِ منصبی کی تکمیل میں اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو اُنؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (یعنی قرآن مجید) تو یہی لوگ ہیں جو (اللہ کے ہاں) فلاح پانے والے (کامیاب و کامران اور شادکام ہونے والے) قرار پائیں گے۔''

اُمتِ مسلمہ اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہے اُس کی تفصیل میں جانے کی چنداں احتیاج نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر آگاہ ہے کہ عزت و وقار اور سربلندی گویا ہم سے چھین لی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ معاف فرمائے' واقعہ یہ ہے کہ جو مغضوب علیہم قوموں کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچا گیا ہے' مختلف اعتبارات سے وہی نقشہ آج ہمیں اپنے اوپر منطبق ہوتا نظر آ رہا ہے۔ افتراق ہے' باہمی خانہ جنگیاں ہیں' اختلافات ہیں۔ وحدتِ اُمت جو مطلوب ہے تو اس کا شیرازہ پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ اس کے لیے ہم کس طرف رجوع کریں؟ اس کا جواب اگر

ایک جملے میں جاننا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ خلوص اور اخلاص کا رشتہ اور وفاداری کا تعلق از سرِ نو اللہ سے‘ اس کی کتاب سے‘ اس کے رسول ﷺ سے استوار کیا جائے اور صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَۃُ)) قُلْنَا لِمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ : ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ)) (مسلم)

’’دین تو بس خیر خواہی‘ خلوص و اخلاص اور وفاداری کا نام ہے‘‘۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! کس کی وفاداری‘ کس سے خلوص و اخلاص؟ ارشاد فرمایا: ’’اللہ سے‘ اس کی کتاب سے‘ اس کے رسولؐ سے‘ مسلمانوں کے رہنماؤں اور قائدین سے اور عامۃ المسلمین سے۔‘‘

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا تعلق ہے تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے‘ وہ ایک لفظ میں ادا کیا جا سکتا ہے: التزامِ توحید اور شرک سے اجتناب‘ شرک کی ہر نوعیت سے‘ ہر شائبہ سے اپنے آپ کو پاک کر لیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری ہے۔ اگرچہ کام آسان نہیں‘ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

جہاں تک قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ ہے تو یہ درحقیقت دو چیزیں نہیں‘ ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ قرآن حکیم مصحف ہے‘ قرآن متلو ہے اور آنحضور ﷺ قرآنِ مجسم ہیں۔ جیسے کہ فرمایا اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب اُن سے فرمائش کی گئی کہ ہمیں حضور ﷺ کی سیرت بتائیے۔ آپؓ نے سوال کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ اور جب جواب اثبات میں آیا تو آپؓ نے فرمایا: کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنُ ’’حضور ﷺ کی سیرت قرآن ہی تو ہے!‘‘

اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص اور اخلاص کے تقاضے کیا ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہماری وہ نسبت کیسے قائم ہو سکتی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے سادہ ترین الفاظ میں تو یوں کہا ہے کہ: ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

اور بڑے پُرشکوہ انداز میں کہا ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں چار ہیں۔ آیت زیر مطالعہ کا پس منظر بڑا عجیب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے اور اپنی قوم کے لیے بارگاہِ خداوندی میں رحمت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا: میری ایک رحمت تو عام ہے جو تمام مخلوقات کے لیے کھلی ہوئی ہے' اور جو میری رحمت خصوصی ہے تو اُسے میں نے مخصوص کر دیا ہے اُن لوگوں کے لیے جو میرے نبی اُمی سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں گے۔ وہ تعلق کیا ہے؟ اس کو ان الفاظِ مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (الاعراف)

''پس جو لوگ اُن پر ایمان لائیں گے' ان کی تعظیم کریں گے' ان کی نصرت و حمایت کریں گے اور جو نور اُن کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (یعنی قرآن) اس کی پیروی کریں گے وہ ہوں گے اصل معنی میں کامیاب (اور میری رحمت خصوصی انہی لوگوں کے حصے میں آئے گی)۔''

اس آیہ مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلی بنیاد ہے تصدیق و ایمان۔ یہ تصدیق کرنا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ نے جو کچھ فرمایا اپنی طرف سے نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی فرمایا اُسی کو نوعِ انسانی کے سامنے پیش فرمایا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ (النجم)

''اور ہمارا نبی اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا' یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔''

اب اس ضمن میں یہ جاننا چاہیے کہ اس ایمان اور تصدیق کے دو درجے ہیں' ایک اقرارٌ باللسان یعنی زبانی اقرار کا درجہ ہے۔ اس سے انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ قانونی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں شامل ہونے کے لیے لازمی اور ضروری ہے' لیکن اصلی ایمان ''تصدیقٌ بالقلب'' کا نام ہے۔ جب آنحضور ﷺ کی رسالت پر' آپؐ کی نبوت پر دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ ہے ایمانِ مطلوب۔ اس کے بغیر ہم نبی اکرم ﷺ کے جو دوسرے حقوق ہیں وہ ادا نہیں کر سکتے۔ پھر زبانی کلامی تعلق رہے گا' جیسے کہ اللہ معاف فرمائے' ہماری عظیم اکثریت کا فی الواقع ہے۔

دوسرا تعلق ہے تعظیم ومحبت۔ یہ لازمی تقاضا ہے یقینِ قلبی کا۔ اگر یہ یقین ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو آپؐ کی عظمت کا ایک نقش قلب پر قائم ہوگا اور آپ کی محبت دل میں جاگزیں ہوگی۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (صحیح البخاری' کتاب الایمان)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا' جب تک کہ میں اُسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اُس کے اپنے باپ سے' اپنے بیٹے سے اور تمام انسانوں سے۔''

یعنی اگر ایک مؤمن کے دل میں آنحضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ واقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں ہوئی ہے تو وہ حقیقتاً مؤمن ہے۔ اس حدیث میں باپ اور بیٹے کے ذکر نے تمام عزیزوں' رشتہ داروں' قبیلوں اور قوموں کا احاطہ کر لیا ہے۔ ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ بات واضح نہ ہو' بلکہ صاف صاف اور دوٹوک انداز سے ارشاد ہوا کہ حقیقی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور ﷺ ایک بندۂ مؤمن کو دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب تر ہو جائیں ۔

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

تعظیم ظاہری بھی مطلوب ہے اور قلبی بھی۔ اسی طرح محبت کا زبانی بھی اظہار ہو اور

یہ دل میں بھی جاگزیں ہو۔ اور اس کا سب سے بڑا مظہر ہے حضور ﷺ پر درود بھیجنا۔ جس کے بارے میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی دعا کُل کی کُل حضور ﷺ پر درود بھیجنے پر مشتمل کر دے تو اس کا مقام اور مرتبہ کہیں زیادہ ہوگا اس سے کہ وہ اللہ سے خود اپنے لیے کوئی سوالات کرتا رہے۔

ان پہلی دو بنیادوں کا لازمی نتیجہ آنحضور ﷺ کی اطاعت اور آپؐ کا اتباع ہے۔ ظاہر بات ہے جب آپ کو اللہ کا رسول مانا تو اب آپؐ کے حکم سے سرتابی چہ معنی دارد؟ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہوگا۔ اس میں تو البتہ انسان تحقیق کا حق رکھتا ہے کہ واقعتاً محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے یا نہیں' لیکن جب طے ہو جائے کہ یہ آپؐ کا فرمان ہے' یہ آپ کا حکم ہے تو اب چون و چرا کا کوئی سوال نہیں۔ اب تو اطاعت کرنی ہو گی۔ اور اطاعت بھی کیسی! وہ اطاعت جس کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾﴾ (النساء)

''پس نہیں' آپ کے ربّ کی قسم! یہ لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہیں جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ آپ فیصلہ فرمائیں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں' بلکہ آپؐ کے فیصلے کے آگے دل کی پوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیں۔''

یہی بات آنحضور ﷺ نے فرمائی:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)) (رواہ فی شرح السنۃ)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

جب اطاعت کے ساتھ محبت کی شیرینی شامل ہو جائے تو اس طرزِ عمل کا نام ہے ''اتباع''۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت تو ان احکام کی ہو گی جو حضور ﷺ نے دیے ہوں۔ لیکن اتباع ان تمام اعمال و افعال کا ہو گا جن کا صدور و ظہور ہوا نبی اکرم ﷺ سے —— چاہے اس کو کرنے کا حکم حضور ﷺ نے بالفعل نہ دیا ہو۔ اس

اتباع کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ بھی سن لیجیے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۳۱) میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ﴾

''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو ڈھانپ لے گا۔''

اس آیتِ کریمہ سے اتباعِ رسول کی یہ اہمیت سامنے آتی ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازمی ولابدی ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ اللہ ہم سے محبت فرمائے گا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اس کی مغفرت وعفو کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے زیادہ ایک بندۂ مؤمن کی خوش بختی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اللہ کا محبوب اور اس کی مغفرت کا سزاوار بن جائے۔

آنحضور ﷺ کے ساتھ ہمارا تیسرا تعلق جسے یوں کہیے کہ یہ عروج ہے حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا' وہ ہے آپؐ کی تائید ونصرت۔ حضور ﷺ ایک مشن لے کر تشریف لائے تھے' آپؐ کا مقصدِ بعثت عالمی سطح پر ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے ۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

صحابہ کرام ﷢ نے دورانِ خلافتِ راشدہ اس عمل کو جہاں تک پہنچایا تھا ہم اپنی بے عملیوں کے طفیل وہ اثرات بھی ختم کر چکے ہیں۔ اب تو ازسرِ نو پیغامِ محمدیؐ کی نشر و اشاعت کرنی ہے۔ پیغامِ محمدیؐ کو پہنچانا ہے تمام اقوام وملِلِ عالم تک اور ازسرِ نو اللہ کے دین کو فی الواقع قائم' نافذ اور غالب کرنا ہے پورے کرۂ ارضی پر۔ اور اس کے لیے پہلے جہاں بھی اللہ توفیق دے' جس خطہ ارضی کی قسمت جاگے کہ وہ اس عہدِ حاضر میں انقلابِ محمدیؐ کا سب سے پہلا base قرار پائے تو اس ملک کی خوش بختی اور خوش نصیبی پر تو واقعتاً رشک کیا جانا چاہیے۔

یہ ہے وہ فریضہ منصبی جو اُمت کے حوالے کیا گیا ہے۔ آنحضور ﷺ کا مشن زندہ و تابندہ ہے۔ حضور ﷺ گویا اب بھی پکار رہے ہیں:

﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ (الصف:۱۴)

''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟''

یعنی کون ہے جو میرے پیغام کی نشر و اشاعت کا کام کرے' میرے دین کا علمبردار بن کر کھڑا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر اس کا جھنڈا سر بلند کرنے کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے آمادہ ہو جائے!

اسی ضمن میں آخری بات آتی ہے اس آیۂ مبارکہ میں کہ اس عمل کا ذریعہ کیا ہے؟ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا تو آلۂ انقلاب تھا قرآن حکیم ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ﴾ (الجمعة:۲)

''وہی (اللہ) ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

پس معلوم ہوا کہ آپؐ کی دعوت کا مرکز و محور قرآن حکیم تھا۔ آپؐ نے لوگوں کی ذہنیتیں بدلیں تو اسی قرآن حکیم سے' لوگوں کی سوچ میں انقلاب برپا کیا تو اسی قرآن حکیم سے' ذہن کی تطہیر فرمائی تو اسی قرآن کی آیاتِ بینات سے' تزکیۂ نفس فرمایا تو اسی قرآن کی آیاتِ بینات اُس کا ذریعہ بنیں' خارج و باطن سب منور ہوئے تو اسی قرآن حکیم کے نور سے۔

وہ کتاب موجود ہے اور آیت زیر مطالعہ میں اسی کے اتباع کا ان الفاظِ مبارکہ میں ذکر ہوا:

﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾

''اور انہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو ان (نبی) کے ساتھ اتارا گیا ہے۔''

وہ نور جو آپ ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا وہ نور حضور ﷺ اُمت کے حوالے کر کے گئے' وہ اُمت کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنا ہے۔ یہ

آنحضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی آخری اور اہم ترین بنیاد ہے۔ یہ وراثتِ محمدیؐ ہے۔ اُس کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے اور اسی کو حبل اللہ قرار دیا گیا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ (آل عمران:۱۰۳)

یہی کتاب اللہ امت کے اندر از سرِ نو اتحاد اور یک جہتی پیدا کرے گی' اسی سے وحدتِ فکر پیدا ہوگی' اسی سے وحدتِ عمل پیدا ہوگی' اس سے ہماری جدوجہد' یک جہتی کے ساتھ اپنے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھے گی۔ اس کتاب کے حقوق کو پہچاننا بھی ہمارے ایمان اور وقت کی ایک عظیم ضرورت ہے' جیسے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کی بنیادوں کو پہچاننا ہمارے حقیقی وقلبی ایمان کے لیے ضروری ولابدی ہے۔ یہی درحقیقت میلادالنبی ﷺ کا اصل پیغام ہے۔ یہی اصل لمحہ فکریہ ہے۔ اس کو از سرِ نو سمجھیں اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی لائی ہوئی کتاب مبارک کے ساتھ اپنی نسبت کو پوری درستگی کے ساتھ بتمام وکمال از سرِ نو استوار کریں۔ اس کتاب کو مانیں جیسا کہ اس کے ماننے کا حق ہے۔ اسے پڑھیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ اس کو سمجھیں جیسا کہ اس کو سمجھنے کا حق ہے۔ اس پر عمل کریں جیسا کہ اس پر عمل کا حق ہے اور پھر اس کے مبلغ' داعی اور معلم بن جائیں جیسے کہ اس کی تبلیغ' دعوت' تعلیم اور تبیین کا حق ہے۔ وَفَّقَنَا اللّٰهُ لِهٰذَا!

اللہ تعالیٰ ہمیں ان جملہ امور پر عمل کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم نبی اکرم ﷺ کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے راست سمت میں پیش قدمی کر سکیں۔ اور وہ وقت آئے جس کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب اور قائم ہو جائے گا جیسے محمد عربی ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب کر دیا تھا' تو وہ وقت ہوگا جب یہ آیہ مبارکہ اپنی پوری شان کے ساتھ ظاہر ہوگی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا ۝

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

اور

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

ترتیب

مقالۂ اولیٰ

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

☆ تمہید ص149
☆ بعثتِ انبیاء علیہم السلام کا اساسی مقصد ص150
☆ بعثتِ محمدی ﷺ کی اِتمامی و تکمیلی شان ص163

مقالۂ ثانیہ

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

صفحہ 185

مقالہ اولیٰ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت

قرآن حکیم کی روشنی میں

☆

تمہید

ہمارا ایمان ہے کہ سیدِ وُلدِ آدم حضرت محمد ﷺ صرف ایک نبی ہی نہیں ''خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ'' ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں ''آخِرُ الرُّسُل'' ہیں اور آپؐ پر نبوت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں، اِتمام و اِکمال بھی ہوا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو جہاں یہ بات قطعی اور یقینی نظر آتی ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد جملہ انبیاء و رُسل کے مقصدِ بعثت سے مختلف نہیں ہوسکتا، وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے مقصد میں ایک اتمامی شان اور تکمیلی رنگ بھی ہو، جس سے نبیوں اور رسولوں کی مقدس جماعت میں آپ ﷺ کا منفرد مقام اور اِمتیازی مرتبہ واضح ہو جائے۔

گویا آنحضور ﷺ کی بعثت کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ازروئے قرآنِ حکیم بعثتِ انبیاء و رسل کا عمومی اور اساسی مقصد کیا ہے؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بحیثیت خاتم النبیین و آخر المرسلین آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے؟

بعثتِ انبیاء علیہم السلام

کا اَساسی مقصد

ایمانیاتِ ثلاثہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کے اساسی معتقدات تین ہیں۔ یعنی توحید' معاد اور رسالت —— یا ایمان باللہ' ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت —— لیکن عام طور پر اس پہلو پر توجہ نہیں دی جاتی کہ ان تینوں میں گہرا منطقی ربط موجود ہے اور یہ تینوں مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آیئے ذرا اختصار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان تینوں کا اصل حاصل کیا ہے اور ان کے مابین ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

ایمان باللہ

فلسفیانہ موشگافیوں اور متکلمانہ نکتہ طرازیوں سے قطع نظر ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ یہ عالَمِ وجود اور سلسلۂ کون و مکاں جو تاحدِ نظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے' نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا' بلکہ حادث بھی ہے اور ہالک[1] و فانی[2] بھی۔ البتہ ایک ذات ایسی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا' اُسے اللہ کہہ لیا جائے یا الرحمٰن کوئی فرق واقع نہیں ہوتا[3]۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا' اور تمام صفاتِ کمال سے بتمام و کمال متصف ہے اور ہر اعتبار سے تنہا اور یکتا ہے' نہ کوئی اُس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں' نہ حقوق میں نہ اختیارات میں![4]

---

(۱) ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٨٨﴾﴾ (القصص)

(۲) ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾﴾ (الرحمٰن)

(۳) ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

(۴) (i) ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿١﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿٢﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿٣﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ ◄

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ''بِالْحَقِّ'' اور ''اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی'' تخلیق فرمایا ہے اور اس سلسلہ تخلیق کا مرتبہ کمال ہے انسان' جسے اس نے اپنی صورت پر تخلیق فرمایا[1]' پھر اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اسے اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز فرما دیا۔ گویا اسے ایک اعتبار سے جملہ مراتبِ تنزّل کا حاصل بھی قرار دیا جا سکتا ہے' بقول حضرت بیدلؒ ؎

ہر دو عالم خاک شُد تا بست نقشِ آدمی   اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!

اور ایک دوسرے پہلو سے پورے سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ عروج بھی!

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝۵﴾ (التین)

''ہم نے پیدا فرمایا انسان کو بہترین ساخت پر۔ پھر لوٹا دیا اس کو نچلوں میں سب سے نچلا!''

ایمان بالآخرت

ایمان بالآخرت کا حاصل یہ ہے کہ اس انسان کی یہ موجودہ دنیوی زندگی ہی کل زندگی نہیں' بلکہ یہ تو اس کی اصل زندگی کا حقیر سا آغاز ہے یا اس کی کتابِ حیات کا مختصر سا دیباچہ اور مقدمہ یا اس کے سفرِ حیات کا محض ایک آزمائشی اور امتحانی وقفہ[2]۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ   جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب   اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

موت فنا یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں' بلکہ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کو نقلِ مکانی کا نام ہے' جس کی پہلی اور عارضی منزل ہے عالمِ برزخ' جس کا آغاز موت کے فوراً

◄ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ (الاخلاص) (ii) ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۝۱۱۱﴾ (بنی اسراءیل)

(iii) ﴿وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝۲۶﴾ (الکھف)

(۱) ((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ)) (متفق علیه' عن ابی هریرةؓ) ''اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔''

(۲) ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)

''پیدا کیا سلسلہ موت و حیات تاکہ جانچے تمہیں کہ کون ہے تم میں سے سب سے اچھے عمل کرنے والا۔''

بعد ہو جاتا ہے' اور دوسری اور مستقل منزل ہے عالَمِ آخرت' جس کا آغاز یومِ قیامت سے ہوگا۔ بعث بعد الموت' حشر ونشر' حساب وکتاب' جزاوسزا اور جنت ودوزخ سب اسی ایمان بالآخرت کی تفاصیل ہیں' بقول نبی اکرم ﷺ:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ' ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ' ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ' ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا ، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) (ماخوذ از خطبات نبویؐ بحواله نهج البلاغه)

''اللہ کی قسم تم سب پر موت طاری ہو کر رہے گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو' پھر تمہیں لازماً اٹھالیا جائے گا جیسے تم روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو۔ پھر یقیناً تم سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو۔ پھر بدلہ مل کر رہے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا۔ اور وہ یا تو جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے ہمیشہ کے لیے۔''

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا باہمی ربط

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت باہم مل کر مبدأ ومعاد یا حیاتِ انسانی کی ابتدا وانتہا کے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان سے سفرِ حیات کے آغاز وانجام کا تعین ہو جاتا ہے۔ بمصداق الفاظِ قرآنی ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے!''

واقعہ یہ ہے کہ مبدأ ومعاد کے اس علم کے بغیر انسان کی حالت یا تو اُس مسافر کی سی ہے جسے کسی افتاد کے باعث نہ تو یہ یاد رہے کہ اس نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا نہ یہ یاد رہے کہ اُس کے سفر کی منزل کون سی ہے۔ گویا بقولِ فانیؔ ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور وکفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یا بقولِ غالبؔ ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس حال میں انسان بغیر کسی منزلِ مقصود کے تعین کے محض بطن وفرج کے تقاضوں سے مجبور ہو کر گویا پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے زندگی بسر کر دیتا ہے۔ مطابق تمثیلِ قرآنی:

﴿اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ مُکِبًّا عَلٰی وَجۡہِہٖۤ اَہۡدٰۤی اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾﴾ (الملك)

''بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر؟'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یا پھر اُس کی کیفیت اُس پتنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ چکی ہو اور اب وہ محض ہوا کے رحم وکرم پر ہو کہ جہاں چاہے اسے لے جائے۔ از روئے تمثیلِ قرآنی:

﴿فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ ﴿۳۱﴾﴾ (الحج)

''تو گویا وہ گر پڑا بلندی سے' پھر اُچک لیتے ہیں اسے (مردار خور) پرندے یا لے جا پھینکتی ہے اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر!''

اور اس ع ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!'' کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے' گویا لاادریت (agnosticism) اور ارتیابیت (scepticism) کے سوا انسان کے پاس اور کچھ رہ ہی نہیں جاتا' جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہستی اور وجود کے بارے میں بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائے' گویا ع:

''رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!''(۱)

ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس کے صحیح جواب ہی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ایمانِ بالرسالت کے صحیح منطقی ربط کے فہم وادراک کا دارومدار ہے' یعنی یہ کہ انسان سے آخرت میں حساب کس بنیاد پر لیا جائے گا' یا بالفاظِ دیگر محاسبہ اُخروی کی اساسات کیا ہیں۔

---

(۱) شاد عظیم آبادی نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ:

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی — نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جسے فانی بدایونی نے اپنی منطقی انتہا تک بایں طور پر پہنچایا کہ:

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!

مطالعہ قرآن حکیم سے اس کا جو جواب سامنے آتا ہے اسے ایک جملے میں تو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ

انسان اوّلاً اور اصلاً تو مسئول ہے ان استعدادات فطریہ یا لطائفِ اصلیہ کی بنیاد پر جو ہر انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں' جیسے سمع و بصر' عقل و شعور اور تفکر و اعتبار یا لطیفۂ نفس' لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح — اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان پر ''اتمامِ حجت'' کا اہتمام کیا ہے بذریعہ اجرائے وحی و انزالِ کتب اور بعثتِ انبیاء و ارسالِ رسل — لیکن یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے!

لطیفۂ نفس

انسان کے متذکرہ بالا لطائفِ ثلاثہ میں سے ادنیٰ ترین لطیفۂ نفس ہے جس کے اعتبار سے بلاشبہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے اور جو بالکلیہ عالمِ خلق سے تعلق رکھتا ہے' چنانچہ اس کا رجحانِ اصلی عالمِ اَسفل ہی کی جانب ہے اور اس کی گہرائیوں میں واقعتاً ''اَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ'' ہی کا طوفان موجزن ہے' جس کا ایک پہلو سے مشاہدہ کیا مارکس نے' دوسری جانب سے مشاہدہ کیا فرائڈ نے اور تیسری طرف سے مطالعہ کیا ایڈلر نے' اور یہی ہے وجودِ انسانی کا وہ جانبِ اَسفل جس کے بارے میں کچھ حقائق منکشف ہوئے ڈارون پر!

لطیفۂ روح

اور بالکل دوسری انتہا پر ہے لطیفہ روح جس کی نسبت ہے خود ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر:۲۹ اور صٓ:۷۲) اور جس کا تعلق ہے کلیتاً عالمِ امر سے ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (بنی اسراء یل:۸۵) اور جس کا اصل رخ ہے ؏ ''اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن!'' کے مصداق عالم بالا کی جانب' چنانچہ اس میں محبتِ الٰہی کا ایک جذبہ اور 'لقاءِ ربّ' کا ایک داعیہ ایک دھیمی آنچ والی آگ کے مانند تو ہر دم ہی سلگتا ہے' بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں!

البتہ کبھی کبھی اس میں ایک شعلے کی سی لپک بھی پیدا ہو جاتی ہے' جسے بعض ارباب دانش نے شعلۂ ملکوتی (Divine Spark) سے تعبیر کیا ہے۔

خیر و شر کا داخلی معرکہ

گویا غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ''انسان عالمِ اصغر ہے'' اور واقعتاً انسان کے باطن میں سب ہی کچھ موجود ہے۔ چنانچہ بدی کے پست ترین رجحانات بھی ہیں اور نیکی کے اعلیٰ ترین داعیات بھی۔ اور ان ہی کے مابین ایک شدید کشمکش اور مستقل جنگ جاری ہے انسان کی باطنی شخصیت کے وسیع وعریض میدانِ کارزار میں!

مسئولیت کی اساساتِ اصلیہ

لیکن اس معرکۂ خیر و شر میں خالقِ فطرت نے انسان کو بے یار و مددگار یا بے تیر و تفنگ نہیں جھونک دیا بلکہ اسے بہت سی استعدادات سے نواز کر اور بہت سی قوتوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے' چنانچہ اس کی شخصیت کا ادنیٰ ترین پہلو یعنی 'لطیفۂ نفس' بھی ایک جانب مسلح ہے استعداداتِ سماعت و بصارت اور قوائے تعقّل و تفکّر سے اور دوسری جانب مسلح ہے ایک اَخلاقی حس سے جو تمیز کرتی ہے خیر اور شر میں اور پہچانتی ہے نیکی اور بدی کو۔ بنابریں خود گواہ ہے اپنے آپ پر بصورتِ نفسِ لوّامہ! بحوائے آیاتِ قرآنی:

(۱) ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ۝﴾ (الدھر)

''ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے نطفہ سے تاکہ آزمائیں اسے' چنانچہ بنا دیا ہم نے اسے سننے والا' دیکھنے والا!''

(۲) ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس)

''اور (قسم ہے) نفس کی اور جیسا کہ اسے بنایا ٹھیک' پھر ودیعت کر دی اس میں سوجھ بدی اور نیکی کی۔''

(۳) ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝﴾ (القیمۃ)

''نہیں! قسم ہے مجھے قیامت کے دن کی اور نہیں! (بلکہ) قسم کھاتا ہوں میں نفس ملامت گر کی!''

(۴) ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝﴾ (القیمۃ)

''بلکہ انسان خود ہی گواہ ہے اپنے نفس پر' خواہ پڑا بنائے بہانے!''

بنابریں ہر ذی نفس خود اپنی جگہ مسئول ہے اور جزا و سزا کے قابل اور اس کا مستحق! یہاں تک کہ عدالتِ اُخروی میں ہر نفس کو اپنی جواب دہی خود ہی کرنی ہوگی اور اپنا محاسبہ خود ہی بھگتنا (face کرنا) ہوگا۔ بمصداق الفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ﴾ (النحل:۱۱۱)

''جس دن آئے گا ہر نفس مدافعت کرتے ہوئے اپنی جانب سے۔ اور پورا پورا صلہ مل جائے گا ہر نفس کو اپنے کیے کا!''

اور نہ کوئی نفس دوسرے نفس کے کام آسکے گا' نہ اس کی جانب سے کوئی سفارش یا فدیہ قبول ہوگا' نہ اسے کسی طرف سے مدد ہی مل سکے گی۔ بمصداق الفاظِ قرآنی:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸﴾ (البقرة)

''اور ڈرو اُس دن سے جب نہ کام آسکے گا کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے کچھ بھی' اور نہ قبول کی جائے گی اس کی جانب سے کوئی سفارش' اور نہ قبول ہوگا اُس سے کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہوگی۔''

لطیفۂ قلب

اللہ نے اس پر بھی اکتفا نہیں فرمایا' بلکہ انسان میں ایک اور جوہر نایاب ودیعت فرما دیا' جس میں معرفتِ ربانی کی شمع بھی روشن ہے اور جملہ حقائقِ کونیہ بھی منعکس ہیں۔ ہماری مراد ہے 'لطیفہ قلب' سے جو گویا جامِ جہاں نما ہے یا اس آئینے کے مانند جس میں عالم اکبر کے تمام حقائق کا انعکاس موجود ہے۔ گویا اگر لطیفہ نفس قوائے سمع و بصر اور تعقّل و تفکّر سے مسلح ہے جو اساس ہیں جملہ علومِ مادی و نظری کی تو لطیفہ قلب مسلح ہے ان قوائے تفہم و تفقہ سے جو وجدانی طور پر ادراک کرتے ہیں لطیف تر حقائقِ کونیہ اور معارفِ لدنیہ کا۔ بقول شاعر:

؎ بینی اندر دل علومِ انبیاء — بے کتاب و بے معید و اوستا!
اور ؎ صد کتاب و صد ورق در نار کن — روئے دل را جانبِ دلدار کن!
اور ؎ در کنز و ہدایہ نہ تواں یافت خدارا — در آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست! (۱)

---

(۱) اسے محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں سمجھنا چاہیے' اس لیے کہ خود کلامِ نبوت میں 'قلب' کے ◄

الغرض لطیفہ قلب کے ودیعت کیے جانے کے بعد انسان کی مسئولیت پر آخری مہرِ تصدیق ثبت ہو جاتی ہے' بمصداق الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾﴾ (بنی اسراءیل)

''یقیناً کان' آنکھ اور دل ہر ایک کے بارے میں پرسش ہو کر رہے گی۔''

اور وہ لوگ حیوان اور چوپائے ہی نہیں ان سے بھی ارذل و اسفل قرار پاتے ہیں جو اپنی ان فطری استعدادات کو بے کار رکھ چھوڑیں یا قوائے فطریہ کو شل کر لیں' بمصداق آیتِ قرآنی:

﴿لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا ز وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا ز وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا ط اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں' اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں' اور کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں' وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے!''

خیر و شر کے خارجی داعیات

خیر و شر کے مابین جو داخلی معرکہ انسان کی شخصیت کے باطنی میدانِ کارزار میں جاری ہے' اس کو تقویت پہنچانے والے کچھ داعیاتِ خیر و شر خارج میں بھی موجود ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش   تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

◀ لیے اسی قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں' مثلاً اس مشہور حدیث میں جس کی رو سے آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ: ((اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ اِذَا اَصَابَہُ الْمَاءُ))

''یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں بالکل ایسے جیسے لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ آ جاتا ہے!''

جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بالکل صحیح سوال کیا کہ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ وَمَا جِلَاءُ ھَا

''اے اللہ کے رسول! پھر انہیں صیقل کیسے کیا جائے؟'' جواباً ارشاد ہوا:

((کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃُ الْقُرْاٰنِ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

''موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی کثرت کے ساتھ تلاوت!''

اللہ کو پامردئ مؤمن پہ بھروسہ   ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اصل اور فیصلہ کن اہمیت داخلی کشاکش ہی کی ہے' خارجی داعیات محض تقویت کے موجب ہو سکتے ہیں' خواہ وہ خیر کی جانب تشویق وترغیب پر مشتمل ہوں خواہ شر کی طرف تحریص وتحریض پر۔ چنانچہ نہ کسی داعئ شر حتیٰ کہ ابلیسِ لعین وشیطانِ رجیم تک کو یہ قوت واختیار حاصل ہے کہ وہ کسی انسان کو بالجبر برائی پر مائل کر سکے' بجوائے آیاتِ قرآنی:

(۱) ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ﴿۴۲﴾﴾ (الحجر)

''جو میرے بندے ہیں تیرا اُن پر کچھ زور نہیں! سوائے اُس کے جس نے خود ہی تیری پیروی کی بہکے ہوؤں میں سے!''

(۲) ﴿اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ﴿۹۹﴾﴾ (النحل)

''اسے (ابلیس کو) کوئی اختیار حاصل نہیں ہے ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں!''

اور نہ ہی کسی داعئ خیر حتیٰ کہ سید الاوّلین والآخرین' خاتم النبیین وآخر المرسلین ﷺ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جسے چاہتے ہدایت سے نواز دیتے' از روئے آیت قرآنی:

﴿اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵۶)

''(اے نبی ﷺ!) تو راہ پر نہیں لا سکتا جسے چاہے' بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

خیر اور شر کے ان خارجی داعیوں میں سے جہاں تک شر کے داعیوں کا تعلق ہے انہیں تو سب جانتے ہیں' یعنی ابلیس اور اس کی صُلبی ومعنوی ذُرّیت' انسانوں میں سے بھی اور جنوں میں سے بھی! جن کے بارے میں قرآن میں بھی وضاحت ہے:

﴿اِنَّهٗ یَرٰىکُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ﴾ (الاعراف:۲۷)

''وہ (ابلیس لعین) دیکھتا ہے تم کو اور اس کے ہم جنس بھی' جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے!''

اور حدیثِ نبویؐ میں بھی تصریح ہے کہ: ((اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ)) (صحیح البخاری) یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند سرایت کر جاتا

ہے' لیکن داعیانِ خیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ ملائکہ حیاتِ دنیوی کے دوران اصحابِ خیر اور اہل حق کے لیے تقویت و تثبیت کا ذریعہ بنتے ہیں' اور جس طرح شیاطینِ جن و اِنس انسان کے نفسانی داعیات کی تحریک و اشتعال کا سبب بنتے ہیں اسی طرح ملائکہ انسان کی روحِ ملکوتی میں نشاط و اہتزاز کا ذریعہ بنتے ہیں اور معرکہ حق و باطل کے دوران اہلِ حق کے قلبی سکون و اطمینان اور عملی ثبات و استقلال کا سبب بنتے ہیں۔ بمصداقِ آیاتِ قرآنی (الاحزاب:۴۳) :

(۱) ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

''وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی' تا کہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اُجالے میں!''

(۲) ﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الانفال:۱۲)

''جب وحی (کے ذریعے حکم) فرما رہا تھا تیرا رب فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' پس دلوں کو جمائے رکھو اہل ایمان کے!''

(۳) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۳۱)

''بے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہی ہمارا ربّ ہے' پھر اس پر جم گئے' ان پر نازل ہوتے ہیں فرشتے کہ نہ خائف ہو نہ غمگین' اور خوشخبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی اور مددگار دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی!''

اِتمامِ حُجّت اور قطعِ عُذر

اب ہم موضوعِ زیرِ بحث کی بحثِ اوّل کے آخری نقطے تک پہنچ گئے ہیں جو یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اصل داخلی داعیاتِ خیر و شر ہیں اس کے لطائفِ نفس و روح' لیکن اصل حجت داخلی بنتی ہیں استعداداتِ سمع و بصر و تعقّل و تفکر اور حسِّ اخلاقی اور تفقہ قلبی جنہیں انسان کی مسئولیت کی اساساتِ اصلیہ کہا جا سکتا ہے' اسی طرح اصل خارجی داعیان خیر و شر تو ہیں علی الترتیب ملائکہ کرام اور ابلیس اور اس کی ذُرّیتِ صلبی و معنوی' لیکن اس ضمن میں

اتمامِ حجت ہوتا ہے اجرائے وحی' تنزیلِ کتب' بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل سے' جن کی حیثیت ہے حجتِ خارجی کی اور جن کا مجموعی نام ہے ایمان بالرسالت! چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

(۱) ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ (النساء)

''(بھیجے اللہ نے) رسول بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے' تاکہ نہ رہے لوگوں کے پاس کوئی عذر و دلیل اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں ان رسولوں کے بعد۔ اور اللہ تو ہے ہی زبردست اور (کمال) حکمت والا!''

(۲) ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾﴾ (المائدۃ)

''اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آ گیا ہے ہمارا رسولؐ جو واضح کر رہا ہے تم پر (ہماری ہدایت) اس کے باوجود کہ (عارضی طور پر) منقطع ہو چکا تھا سلسلہ رسالت' مبادا تم کہو کہ نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا' تو اب آ گیا ہے تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے ہی!''

گویا بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل کی اصل غرض و غایت ہے اتمامِ حجت اور قطعِ عذر تاکہ انسان پر اللہ کی جانب سے آخری حجت قائم ہو جائے اور اس کے پاس اپنی غلط روی یا کج عملی کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہ رہ جائے۔

یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے کہ جس طرح خیر و شر کے دوسرے خارجی داعیات کو انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض ترغیب و تحریص اور تحریک و تشویق کی ہے اسی طرح نبوت و رسالت کی اصل نوعیت بھی دعوت و تبلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل کے لیے قرآن مجید میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اصطلاح مُبشرین و مُنذرین ہی کی ہے۔ جیسے ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ (الکہف:۵۶) اور وحی و کتاب کے لیے سب سے زیادہ کثیر

الاستعمال الفاظ' ذِکر' ذِکریٰ اور تذکرۃ کے ہیں۔ جیسے:

(۱) ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨﴾ (الحجر)

''یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے یہ 'ذکر' (یعنی قرآن مجید) اور ہم ہی ہیں اس کے محافظ ونگہبان!''

(۲) ﴿طٰهٰ ① مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ② اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ③﴾ (طٰہٰ)

''(اے نبی ﷺ!) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ بلکہ (اتارا ہے) صرف یاددہانی کے طور پر ان کے لیے جو ڈرتے ہوں!''

(۳) ﴿كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ⑪﴾ (عبس)

''نہیں! یہ ایک یاددہانی ہے۔''

(۴) ﴿تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ⑧﴾ (قٓ)

''سجھانے اور یاد دلانے کو اُس بندے کے لیے جو رجوع کرے!''

(۵) ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ㊲﴾ (قٓ)

''اس میں یاددہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس ہو دل (زندہ و بیدار) یا کان لگا کر سنے پوری توجہ کے ساتھ!''

(۶) ﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ㉑ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ㉒﴾ (الغاشیۃ)

''تو (اے نبی ﷺ!) تم یاددہانی کراتے جاؤ' تمہارا کام تو بس یاددہانی کرانا ہی ہے۔ ان پر داروغہ تو ہو نہیں (کہ ضرور ہدایت پر لے آؤ!)''

اور ان سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ انسان پر ایک خارجی گواہی اور شہادت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کارِ رسالت کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اصطلاح 'شہادت' کی ہے اور فریضہ رسالت کا اصل حاصل شہادت علی الناس ہی ہے' اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' بمصداقِ آیاتِ قرآنی:

(۱) ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ⑮﴾ (المزمل)

''ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے پاس ایک رسول گواہ بنا کر تم پر جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی جانب!''

(۲) ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج:۷۸)

”تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر‘ اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر!“

(۳) ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾ (النساء)

”تو کیا ہو گا اس وقت جبکہ ہم بلائیں گے ہر گروہ میں سے ایک گواہ‘ اور بلائیں گے آپ کو (اے نبی ﷺ!) بطورِ گواہ ان کے خلاف!“

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کی غرضِ اصلی اور ارسالِ رسل کا مقصدِ عمومی ہے انسانوں پر اتمامِ حجت اور قطعِ عذر بذریعہ تبلیغ ودعوت‘ تلقین ونصیحت‘ وعظ وتذکیر اور اِنذار وتبشیر‘ جن کا مجموعی حاصل ہے ”شہادت علی الناس!“

چنانچہ یہی ہے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا اوّلین مقصد۔ بفحوائے آیتِ قرآنی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾﴾ (الاحزاب)

”اے نبی (ﷺ)! ہم ہی نے بھیجا ہے تمہیں بنا کر گواہ اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور روشن چراغ (ہدایت)۔“

گویا معلّم ومبلّغ‘ مربّی ومزکّی‘ مبشّر ومُنذِر اور داعی وشاہد کی جملہ حیثیتیں مشترک ہیں آنحضور ﷺ اور جملہ انبیاء ورُسل علیہم السلام میں‘ اگرچہ ان اعتبارات سے بھی ع ”ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!“ کے مصداق ہر نبی اور ہر رسول کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے‘ اور اس گلدستے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند و بالا مقام ہے سید الاوّلین والآخرین ﷺ کا! تاہم بحیثیتِ خاتم النبیّین وآخر المرسلین جن پر نبوت ورسالت کا اختتام ہی نہیں اِتمام واِکمال بھی ہوا ہے۔ آپؐ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کچھ اور ہی ہے‘ جس کا بیان آگے آئے گا!

بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام

کی اتمامی و تکمیلی شان

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآن حکیم میں تین مقامات[1] پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم ﷺ کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے' جبکہ پورے قرآن مجید میں یہ الفاظ کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔

ان الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے اپنی مشہور تالیف ''ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخُلفاء'' میں مفصل کلام کیا ہے اور انہیں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہرنوع آنحضور ﷺ کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے ان الفاظِ مبارکہ پر غور و تدبر لازمی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا: ایک ''الہدیٰ'' اور دوسرے ''دینِ حق''۔

''الہدیٰ''

''الہدیٰ'' کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی' لیکن نظائرِ قرآنی

(۱) التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸' اور الصف: ۹۔ ترجمہ: ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اسے کُل دین پر۔''

کی مدد سے اس کی مراد کے تعین کی کوشش کی جائے تو وہ ہے ''قرآن حکیم''۔ اس لیے کہ وہی ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (۱) بھی ہے اور ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (۲) بھی۔ اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ ﴿وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۤءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ﴾ (۳) اور یہ بھی کہ ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (۴) اور وہی ہے کہ جسے جِنّوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکار اٹھے کہ ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ① يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ﴾۔ (۵)

مزید برآں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں ''ارسالِ رسل'' کے ضمن میں فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور روشن نشانیوں کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان۔''

ظاہر ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں جس طرح ''اَلْمِیْزَان'' کو ''دِیْنِ الْحَقّ'' کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح ''اَلْکِتٰب'' ٹھیک اسی مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیۂ زیرِ بحث میں ''اَلْھُدٰی'' کا لفظ آیا ہے۔ گویا ''اَلْھُدٰی'' سے مراد بعثتِ محمدیؐ کے ضمن میں سوائے ''اَلْقُرْآن'' کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ سورۃ الحدید 'اُمُّ الْمُسَبِّحَات' کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی اِسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سورۃ الصف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیرِ بحث الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں۔)

---

(۱) البقرۃ:۲: ''ہدایت پرہیزگاروں کے لیے۔''

(۲) البقرۃ:۱۸۵: ''ہدایت پوری نوعِ انسانی کے لیے۔''

(۳) الشوریٰ:۵۲: ''لیکن بنا دیا ہم نے اسے روشنی' ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے۔''

(۴) بنی اسرائیل:۹: ''یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے۔''

(۵) الجن:۱-۲: ''ہم نے سنا ایک قرآن بہت اچھا' جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف' تو ہم ایمان لے آئے اس پر۔''

”دین الحق“

اسی طرح ”دِیْنُ الْحَقِّ “ کو بھی خواہ ظاہری ترکیب اضافی پر محمول کر لیا جائے‘ گویا اس کا ترجمہ کیا جائے ”حق کا دین “ خواہ اسے ترکیبِ توصیفی بشکلِ ترکیبِ اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے ”سچّا دین “ (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہر صورت ایک ہی ہیں‘ یعنی ”اللّٰہ کا دین “ اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

(۱) ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ (الحج:٦٢‘٦)

”یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے حق“ ۔ (یعنی کامل حق یا سراپا حق)

(۲) ﴿وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾﴾ (النور)

”اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھلا حق ۔“

گویا ”دین الحقّ “ بالکل مساوی و مترادف ہے ”دین اللّٰہ “ کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیت زیرِ بحث کے ضمن میں ”دین الحق “ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ ”دین اللّٰہ “ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں!)[۱] لفظ ”دین“ پر توجہ کو مرکوز کیجیے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ ”اساس القرآن “ یعنی سورۃ الفاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے‘ یعنی بدلہ[۲] (جو لامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں)[۳]

---

(۱) آل عمران:۸۳‘ النور:۲‘ النصر:۲۔

(۲) یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت ”كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ “ (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور دیوانِ حماسہ کے مشہور مصرعہ کے الفاظ ع ”دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا “ (ہم نے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کر لیں اور اسے بھی کہ عربی میں ’دَین‘ کہتے ہیں قرض کو‘ جس کا لوٹایا جانا لازم ہوتا ہے۔

(۳) جیسا کہ آنحضورﷺ نے فرمایا: ((ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءً))

”پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا!“

چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزاوسزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے' جیسے:

(۱) ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ①﴾ (الماعون)

''تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزاوسزا کو؟''

(۲) ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ⑦﴾ (التین)

''تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزاوسزا کے جھٹلانے پر؟''

(۳) ﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ⑨﴾ (الانفطار)

''کوئی نہیں' بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزاوسزا کو!''

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ 'یوم' کی اضافت کے ساتھ یومِ قیامت کے معنی میں' یعنی بدلے یا جزاوسزا کا دن!

پھر چونکہ بدلے اور جزاوسزا کا تصور لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اس کی اطاعت ومتابعت کے تصور کو' لہٰذا لفظ 'دین' نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اولاً 'اطاعت' کا مفہوم پیدا ہوا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ ''مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ'' اور ایک بار ''مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِىْ'' اور چھ مرتبہ ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' کے الفاظ اطاعت اور بندگی وفرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں' جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے ''حَنِيْفًا'' یا ''حُنَفَآءَ'' کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ کا: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ﴾ (الزمر:۳) اور ﴿وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ﴾ (النحل:۵۲) —— اور بالآخر اس نے 'نظامِ اطاعت' کی صورت اختیار کر لی' جس کی اضافتِ حقیقی تو اُس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظامِ زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو' جیسے سورۂ یوسف میں فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ﴾ (یوسف:۷۶)

''اس طرح ہم نے تدبیر کردی یوسفؑ کے لیے' ورنہ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ مجاز نہ تھا کہ اپنے بھائی کو روک سکے۔''

گویا مصر کے اس دور کے رائج الوقت نظامِ ملوکیت کو جس میں مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہ یا 'مَلِك' کو حاصل تھی قرآن حکیم 'دِیـن الـمَـلِك' سے تعبیر کرتا ہے اور ٹھیک اسی مفہوم (sense) میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں ''دِین اللّٰہ'' کے الفاظ سورۃ النصر میں:

﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝۱ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۝۲﴾

''جب آ گئی اللہ کی مدد اور فتح۔ اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔''

گویا آنحضورﷺ کی بیس سال سے زائد جِدّوجُہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورت حال پیدا ہوگئی کہ اللہ ہی کو مُطاعِ مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظامِ اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے ''دیـن الـلّٰـه'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ——— (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کو' جس میں غلط یا صحیح بہر حال نظری طور پر[1] حاکمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں جمہور' تعبیر کیا جائے 'دِینُ الجَمهور' کے الفاظ سے!)

البتہ قرآن حکیم میں 'دین' کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے' جسے اضافتِ مجازی قرار دیا جانا چاہیے' جیسے ''دِیۡنِیۡ'' یا ''دِیۡنُکُمۡ'' یا ''دِیۡنُهُمۡ''۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظامِ اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا 'اس کا دین' بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دعا کے الفاظ میں: اَللّٰهُمَّ انۡصُرۡ مَنۡ نَصَرَ دِیۡنَ مُحَمَّدٍ ﷺ ...... الخ اسلام اصلاً تو 'دین اللہ' ہے لیکن مجازاً 'دِیـنُ مُـحَـمَّـد' بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں' فِدَاهُ آبَاءُنَا وَاُمَّهَاتُنَا)

حاصلِ کلام یہ کہ 'دین الحق'' سے مراد ہے ''دین اللّٰه'' یعنی وہ نظامِ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کلی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو' اور یہ دراصل خاتم النبیین و آخر

---

(۱) بقول علامہ اقبال مرحوم۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

المرسلین ﷺ کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس ''اَلْمِیْزَان'' کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ! ___ اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس 'نظام عدلِ اجتماعی' کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے۔

''تا کہ لوگ قائم رہیں اس نظامِ قسط پر۔''(۱)

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت' اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمتِ الٰہی کارفرما ہے اس کی جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثتِ محمدی علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسلِ انسانی گویا عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی:

(۱) ایک اس اعتبار سے کہ عقل انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیتِ انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسل انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور جنہوں نے مذاہبِ عالم' فلسفہ' تصوف اور علم کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا' گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیحؑ تک کا عرصہ فکرِ انسانی کے عہدِ طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہبِ عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے' لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعتاً نیا مذہب وجود میں آیا ہے' نہ حقیقتاً جدید مکتبِ فکر یا مدرسہ فلسفہ۔ اور 'فلسفۂ جدید' کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتب فکر سامنے آئے ہیں ان کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں ___ اب اگر یہ صحیح ہے' اور یقیناً صحیح ہے تو

---

(۱) ﴿لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید: ۲۵)

صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں و مناسب تھی اس کے لیے کہ ع ''نوعِ انساں را پیامِ آخریں!'' یعنی قرآن حکیم ''اَلْھُدٰی'' بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا تاکہ نوعِ انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

۱۔ ﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ﴾ (الاسراء:۹)

''یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔''

۲۔ ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (الاسراء:۱۰۵)

''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔''

۳۔ ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا﴾ (الاسراء)

''کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔''

اور اُس نے پوری نوعِ انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

﴿وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ﴾

(البقرۃ:۲۳)

''اور اگر ہو تم شک میں اس کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورۃ!''

افسوس کہ تاحال قرآن حکیم کے وجوہِ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اُس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیت' تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے — اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں' بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اس کے قدموں میں ڈال دی گئیں' درآں حالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً ''اَلْھُدٰی'' ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی 'فکری و عملی رہنمائی' ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکرِ انسانی بطورِ خود (as such) اپنی آخری بلندیوں کو چھو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے 'بالغ' ہو گیا تھا!

(۲) آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ بھی ارتقاء کے جملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انسان اولاً قبائلی زندگی اور اس کے بعد شہری ریاستوں (city states) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پوری شدت کو پہنچ چکی تھی' اور انسان کو تمدن و اجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اس دور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں فرد بمقابلہ جماعت' مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالمِ انسانیت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور to be or not to be کی سی اذیت بخش کیفیت سے دوچار ہونا تھا — لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا 'نظامِ عدلِ اجتماعی' عطا کر دیا جائے جو واقعتاً ''اَلْمِیْزَان'' کے حکم میں ہو اور تمدن و اجتماعیت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وَسَط کا تعین کر دے اور معاشرت' معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کو پوری طرح واضح کر دے' تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی (social perversion) کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال (economic exploitation) کا اور نہ سیاسی جبر (political repression) کا۔ اور ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیش نظر تھا' یعنی ''لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' وہ نبی آخر الزماں ﷺ پر تکمیلِ دینِ حق کے ذریعے ابد الآباد تک کے لیے پورا ہو جائے' بفحوائے آیت قرآنی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ

﴿الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

’’آج کے دن میں نے کامل کر دیا تمہارے لیے تمہارا دین اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو۔‘‘

لِيُظْهِرَهٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور لِیُظْھِرَہٗ پر غور فرمایئے۔ تو بحمد اللہ یہاں ’اظہار‘ کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی ’غالب کر دینا‘(۱) البتہ یہاں فعل اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد آراء موجود ہیں‘ اگرچہ ان سے مراد و معنی میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں فعل اظہار کا فاعل بھی وہی ہے جو فعل ارسال کا ہے‘ یعنی اللہ تعالیٰ‘ اور دوسری رائے یہ ہے کہ ’لِیُظْھِرَہٗ‘ میں ضمیر فاعلی رسول کی جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب ہو تو دور جانا صحیح نہیں اِلاّ آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو‘ سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں اس کے باوجود عالمِ واقعہ میں قرآن حکیم کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہارِ دینِ حق کے لیے عالمِ واقعہ میں بالفعل سعی و جُہد اور شدید محنت و مشقت آنحضور ﷺ ہی نے کی اگرچہ فاعلِ حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے‘ بمصداق آیتِ قرآنی:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ﴾ (الانفال:۱۷)

’’تو نہیں (کفارِ قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا اور (اے نبی ﷺ!)

---

(۱) ’ظھر‘ کہتے ہیں پیٹھ کو ــــــ اور ’ظاھر‘ استعارۃً غالب کے معنی میں بھی مستعمل ہے‘ جیسے قرآن مجید میں سورۃ الصف کے آخر میں ہے: ﴿فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ﴾ (پس وہی ہوئے غالب!) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے‘ اور عیاں کے معنی میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے! ’اظھار‘ بابِ افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعل متعدی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے‘ یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

جب آپ نے ان پر خاک پھینکی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی (وہ مشت خاک) بلکہ اللہ نے پھینکی تھی!''

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کمزور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پورے تصور ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعمِ خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضۂ اظہارِ دینِ حق ہی سے بَری ہو بیٹھے ہیں' وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیتِ متذکرہ بالا نازل ہوئی اگر آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سعی و جُہد سے دستکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رخ بہتا؟ اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولتِ ایمان اور نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا؟ غور کرنا چاہیے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آ گئے؟ اور صورتِ حال وہ تو نہیں جو ''خوئے بدرا بہانہ بسیار!'' کی کہاوت میں بیان ہوئی یا جگر مراد آبادی کے اس شعر میں کہ: ؎

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصف جن میں آیت زیرِ بحث وارد ہوئی ہے' تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں۔ خصوصاً سورۃ الصف تو از اوّل تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ اور اس میں اس آیہ مبارکہ یعنی: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ کے فوراً بعد مسلمانوں کے جذبہ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں؟ اور پھر صاف صاف سنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پُرصعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ (الصف: ۱۰'۱۱)

''اے اہلِ ایمان! کیا میں رہنمائی کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب جو چھٹکارا دلا دے تمہیں دردناک عذاب سے؟ ایمان (محکم) رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اور کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی۔''

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنت کا بھی' اُخروی فوز وفلاح کا وعدہ بھی ہے اور دنیا میں تائید اور فتح ونصرت کا بھی' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصرتِ الٰہی ورسولؐ کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی —— بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث ہیں ہی' عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسول اللہ ﷺ کا۔ اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعوے دار ہوں اُن کے خلوص واخلاص کا اصل امتحان (test) یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسولؐ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں تو کامیاب وکامران ہیں ورنہ خائب وخاسر اور ناکام ونامراد!!

چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرما دی:

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾

''اور تا کہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب کے باوجود۔''

اور سورۃ الصّف کا اختتام بھی ہوا اس آیہ مبارکہ پر!

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۴)

''اے اہلِ ایمان! بنو مددگار اللہ کے جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف!''

اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کی مرضی۔

لِيُظْهِرَهٗ کی ضمیر مفعولی کے بارے میں بھی دو آراء ہیں: ایک یہ کہ اس کا مرجع ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجع ہے رسولؐ کی جانب —— اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' اس لیے کہ رسول ﷺ کے غلبے کا مطلب بھی ان کی ذات یا ان کے

کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دین حق ہی کا غلبہ ہے۔

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

''عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کا ترجمہ اکثر و بیشتر مترجمین نے ''تمام ادیان پر'' کیا ہے۔ گویا ''الدین'' کے لام تعریف کو لامِ استغراق قرار دیا ہے' حالانکہ یہاں جس قدر امکان لامِ استغراق کا ہے اتنا ہی لامِ جنس کا بھی ہے' چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ ''سب دین پر'' یا ''سارے دین پر'' یا ''کُل دین پر'' یا ''پورے جنس دین پر'' بھی کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اوّلین اردو مترجمین امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کے جلیل القدر صاحبزادے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہما اللہ ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کے ترجمے میں رعایت لفظی زیادہ ملحوظ ہے اور مؤخر الذکر کا ترجمہ بامحاورہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعد کے اکثر و بیشتر مترجمین اصلاً ان دو بھائیوں ہی کے خوشہ چین ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ نے تو اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچے میں صاف اعلان کیا ہے کہ اصلاً وہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ ہی کا ترجمہ ہے جس میں ایک صدی بیت جانے کے باعث اردو کے محاورے میں جو تبدیلی آ گئی ہے صرف اس کے پیش نظر لفظی تبدیلی کی گئی ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ''عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کا ترجمہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں تو ''ہر دین سے'' کے الفاظ سے کیا ہے اور سورۃ الصّف میں ''دینوں سے' سب سے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جبکہ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۃ التوبہ میں ''اوپر دین سب کے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں' اور سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف دونوں مقامات پر ''اوپر دین سارے کے'' کی تعبیر اختیار کی ہے۔

گویا جہاں تک ٹھیٹھ عربی قواعد کا تعلق ہے یہ دونوں ترجمے مساوی طور پر صحیح اور درست ہیں' البتہ اگر حسب ذیل حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح تر اور موزوں تر ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ ہی کا ہے:

(۱) پورے قرآن مجید میں نہ کہیں 'اَدیان' کا لفظ استعمال ہوا ہے' نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں ''الدِّین'' کا ترجمہ ''تمام ادیان'' کرنا ممکن ہو۔

(۲) تفسیر قرآن کے اہم اصول ''القرآن یفسّر بعضہ بعضًا'' کے پیش نظر اس معاملے میں یہ حقیقت تو انتہائی فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے کہ ''الدّین'' کے ساتھ ''کُلّہ'' کا تاکیدی کلمہ ان تین آیات کے علاوہ پورے قرآن میں صرف حسب ذیل آیہ مبارکہ میں وارد ہوا ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال:۳۹)

''اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

اور یہاں ظاہر ہے کہ ''سارے ادیان'' کا ترجمہ قطعاً ممکن نہیں ہے' بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی ''پورے کا پورا دین'' یا ''سارے کا سارا دین'' اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں' جبکہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے۔ (جیسا کہ اس سے قبل ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' اور ''اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ'' اور ''وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا'' کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔)

اب ''الدّین'' کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے ''هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کا ترجمہ کیجیے تو وہ یوں ہوگا:

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو 'الھدیٰ' (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی کے اصول پر مبنی نظامِ زندگی یعنی اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے وہ (یعنی رسول ﷺ) اسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پورے کے پورے دین (یعنی نظامِ اطاعت یا نظامِ زندگی) پر!''

اس آیہ مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یہ 'اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ' کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہیے کہ آنحضور ﷺ کے لیے یہ 'اظہار دین حق' دو وجوہات کی بنا پر لازمی و لابدی تھا:

(۱) ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار ہی سے غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظامِ اطاعت بے معنی ہے جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گزارا کر سکتا ہے۔ جس طرح غلبۂ اسلام کے زمانے میں عیسائیت' یہودیت اور مجوسیت یا بدھ مت اور ہندومت ایسے مذاہب ﴿يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (۱) کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ (۲) رہا -- جبکہ دین ایک کُلّی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریت اور ملوکیت یا کیپٹلزم اور کمیونزم کسی خطہ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے اسی طرح دو دین بھی کسی جگہ ہمسر اور ہم پلّہ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے مابین مفاہمت (detente) یا پُرامن بقائے باہمی (peaceful co-existence) کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ کر (۳) مذہب کی حیثیت اختیار کر لے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی (۴) ہو جائے!

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیشِ نظر رہنی چاہئیں:

ایک یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیثِ نبویؐ کے

---

(۱) التوبة:۲۹: ''دیتے ہوئے جزیہ اپنے ہاتھ سے 'چھوٹے' ہو کر!''

(۲) جس کی صحیح ترین تصویر ہے علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ۔

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

(۳) بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!! (اقبالؔ)

(۴) اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۃ التوبہ کی محولہ بالا آیت کے الفاظ 'وَهُمْ صٰغِرُوْنَ'' کا مفہوم پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتا ہے!

پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے۔ جیسے مذہب حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی اور مذہب اہلِ حدیث، جن کی حیثیت دین اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے، جیسے شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے، تاہم از حضرت آدمؑ تا آنحضورعلیہ السلام جملہ انبیاء ورسل کا دین ایک ہی تھا، بجوائے آیاتِ قرآنی:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ......﴾ (الشوریٰ:۱۳)

''مقرر کیا اُس (اللہ) نے تمہارے لیے (اے مسلمانو) دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اُس نے نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبی ﷺ!) تمہاری طرف، اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو......''

(۲) نبی اکرم ﷺ کے لیے اِظہارُ دِین الحقِّ علی الدِّین کُلِّه، اس لیے بھی ضروری تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظامِ اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کے نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنت (utopia) کی حیثیت رکھتا ہے اور رسالتِ محمدیؐ کی جانب سے نوعِ انسانی پر ''شہادت'' اور ''اِتمامِ حجت اور قطع عذر'' (جو سلسلہ رسالت کی غرضِ اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ آپؐ اس دین حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور ﷺ نے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم سعی و جہد سے 'غلبۂ دینِ حق' کی صورت میں وہ 'نظامِ عدلِ اجتماعی' بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا' جو بعد میں خلافتِ راشدہ کے دوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دوران نوعِ انسانی کے سامنے یہ 'معجزات' عملاً رونما نہ ہو جاتے

کہ ''انسانی حریت' اخوت اور مساوات'' صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا روپ بھی دھار سکتے ہیں۔ (۱) اور نہ صرف یہ کہ نظامِ عائلی میں مرد کی قوامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے' بلکہ یہ بھی کہ نظامِ سیاسی میں کامل آزادیٔ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے' بلکہ عدل وانصاف کے جملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظامِ معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیت اور ذاتی مفاد کے جذبۂ محرکہ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے —— تو اُس دور کے انسان پر 'دینِ حق' کی جانب سے ''اتمامِ حجت'' کیسے ہو سکتا جس کے فاتح ہیں آنحضور ﷺ! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (good) یا قدر (value) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے بتمام وکمال اور بغایتِ توازن واعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ ﷺ (۲) نے اور بالکل یہ محسوس ہو

(۱) ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G.Wells) کو آنحضور ﷺ سے جو بغض وعداوت ہے وہ ان رکیک حملوں سے ظاہر ہے جو اس نے آنحضور ﷺ کی ذاتی اور خصوصاً عائلی زندگی پر کیے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A Concise History of the World) میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ''انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے' چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے' لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا محمد نے'' (ﷺ)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہاوت کی کہ: ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' (اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پائے)۔

(۲) چنانچہ یہ 'معجزہ' نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو مہاتما (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم وہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے نمونے کے طور پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا دورِ حکومت رہنا چاہیے (نہ کہ رامائن اور مہابھارت اور بکرماجیت یا چندر گپت موریا کا!)۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے رسالے ''ہریجن'' ◄

کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری ذہنی تگ و دو اور عملی بھاگ دوڑ گویا نظامِ محمدی تک رسائی کی سعی و کوشش ہے' بقول علامہ اقبال: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو آنکہ از خاکش بروید آرزو!

یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

گویا آنحضور ﷺ پر اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دین اور ختم و اکمالِ نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپؐ انذار و تبشیر' دعوت و تبلیغ' وعظ و نصیحت' تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم' ہجرت' جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جِدوجُہد کے ذریعے باطل نظامِ زندگی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظامِ اطاعتِ خداوندی کو پورے نظامِ اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپؐ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے آپؐ انبیاء و رسل کی پوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

داعیٔ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کو بھی داعیٔ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ کی تحقیر و توہین ہے' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ 'داعی انقلاب' کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف **محمدؐ** رسول اللہ ﷺ ہیں! اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ

◄ میں ۱۹۳۷ء میں اس وقت لکھے تھے جب برطانوی ہند میں پہلی بار صوبائی وزارتیں بنی تھیں اور چونکہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات کا مقاطعہ کیا تھا لہٰذا پورے ہندوستان میں کانگریس ہی نے وزارتیں بنائی تھیں!

روس سب کے سب جزوی تھے اور ان سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رونما ہوئی' جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئتِ حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں' جبکہ نبی اکرم ﷺ نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد و نظریات' علوم و فنون' قانون و اخلاق' تہذیب و تمدن' معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

انقلابی جدّوجُہد

رہی آپؐ کی انقلابی جدوجہد تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو' پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو' پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کشمکش اور تصادم کے جملہ مراحل اور ہجرت و جہاد و قتال کی تمام منازل سے گزار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ اور یہ نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم ﷺ کا کہ آپؐ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس (اور وہ بھی قمری) کی مختصر سی مدت میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فَصَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلَّم وفداہ آباء نا واُمّھاتنا!

نبویؐ طریقِ کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رونما ہوئی اور انقلابِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا منہاجِ اساسی کیا ہے؟ اور آپؐ کی انقلابی جدوجہد کن کن مراحل سے گزری؟ تو یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے' جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہو گی!

سرِدست موضوعِ زیرِ بحث کی مناسبت سے مزید دو امور کی نشاندہی مطلوب ہے:

(۱) مغربی مفکّرین کی ناسمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے اسی اِتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں آنحضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے فہم میں مغربی مفکّرین یا

مستشرقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے' چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلّغ بھی' معلّم بھی ہوتے ہیں اور مربّی و مزکّی بھی' بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی' واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی' ریفارمر (reformer) بھی ہوتے ہیں اور مصلح بھی۔ لیکن چونکہ ان پر ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں' لہٰذا یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ علم بھی' سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبر و سیاست دان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضور ﷺ کی شخصیت مبارکہ میں یہ جملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی تو آپؐ کو نبی یا رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپؐ کی عظمت صرف بطورِ انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے[1]' کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ ''محمد بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے' البتہ بحیثیت مدبر و سیاست دان کامیاب ہو گئے''[2] اور کوئی آپؐ کی شخصیت کو دو مستقل حصوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے' چنانچہ اسے ''مکے والا محمدؐ'' اور نظر آتا ہے اور ''مدینے والا''[3] اور! **فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْجَاهِلِيْنَ!**

(۲) اُمت کا فرضِ منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل جملہ اعتبارات سے

---

(۱) جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ:

ONE OF THE GREATEST SONS OF ADAM

یا جیسے ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے الفاظ:

THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

(۲) جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا:

MUHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN

(۳) جو وہم پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضور ﷺ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے ایک MUHAMMAD AT MECCA اور دوسری MUHAMMAD AT MEDINA

بتمام و کمال ہو چکی ہے یا وہ کسی پہلو یا اعتبار سے ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے؟ اور اگر بات دوسری ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

تو کیا اُمت صرف عید میلاد النبیؐ منا کر' یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق و شوق کے ساتھ درود و سلام بھیج کر اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے' اور صورتِ حال واقعتاً یہ ہے کہ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

تاہم ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک   اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

کے مصداق گزارش ہے —— کہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ختمِ نبوت و رسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضورﷺ سے قبل انبیاء و رسل کیا کرتے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی اُمت کے ذمے ہیں۔ گویا خواہ دعوت و تبلیغ' انذار و تبشیر' تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ پر مشتمل فریضہ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیاء و رُسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اساسی ہے' خواہ اعلاءِ کلمۃ اللہ' اقامتِ دین اور اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّین کُلِّہٖ پر مشتمل بعثتِ محمدیؐ کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو' جملہ اہلِ ارض اور جمیع کرۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو آنحضورﷺ کے نام لیوا ہیں اور آپؐ کے نام نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپؐ کی اُمت میں ہونے کو موجبِ سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ چونکہ نبی اکرمﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا' لہٰذا آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے' ایک اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ چنانچہ سورۃ الجمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپؐ ''اُمیین'' کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور ''آخرین'' کے لیے بھی' اور آغازِ کلام میں آنحضورﷺ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا اس میں بھی آپﷺ نے فرمایا:

((اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً))

''میں یقیناً اللہ کا فرستادہ ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!''

ان میں سے ''بعثت اولیٰ'' کے جملہ فرائض ''شہادت علی النّاس'' اور ''اظہارِ دینِ الحقّ علی الدّین کُلِّہ'' دونوں کے اعتبار سے آپؐ نے بنفس نفیس ادا فرما دیئے' خواہ اس میں مخالفت ہوئی یا مزاحمت' تمسخر ہوا یا استہزاء' ذہنی کوفت کا سامنا ہوا یا جسمانی اذیت کا' مصیبتیں آئیں یا مشکلات' محنت کرنی پڑی یا مشقت' پھر خواہ شعب بنی ہاشم کا دور آیا یا یومِ طائف' اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابن مالک کے تعاقب کی' اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا اُحد کا۔ اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ بن عبدالمطلب کا اعضاء بریدہ لاشہ' خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حنین کا' اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنی پڑی یا تبوک کی' آپ ﷺ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور ؎

''یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید!''

کے مصداق آپؐ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتیٰ کہ تیئیس برس کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعتاً بالا ہو گیا' کلمہ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا' تا آنکہ حجۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف و اکناف عرب سے آئے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوا لاکھ افراد کے اجتماع سے ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟))(۱) کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ: نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ!))(۲) آپؐ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیق اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے' اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

آپ ﷺ کے بعد' آپؐ کی بعثتِ عامہ کی جملہ ذمہ داریاں اُمت کے کاندھوں پر

---

(۱) ''میں نے (آپ لوگوں تک پیغامِ الٰہی) پہنچا دیا یا نہیں؟''

(۲) ''ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے تبلیغ بھی فرما دی' امانت ادا فرما دی اور (ہماری) خیر خواہی کا حق بھی ادا فرما دیا!''

آ گئیں' بمصداقِ آیتِ قرآنی: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے' جو آپ ﷺ کے حقیقی جانشین تھے' خلافتِ راشدہ کے دوران جو واقعتاً خلافت علٰی منہاج النبوۃ تھی' آپ ﷺ کی جانب سے تبلیغ دین و 'شہادت علی النّاس'، 'اقامتِ دین' اور 'اظہار دین الحقّ علی الدین کلہ' کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر لہرا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال و انحطاط کا وہ عمل جو مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دینِ حق جو پورے روئے ارضی پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا ''غریب الغرباء'' بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے ۔۔۔ اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

—— اور ——

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

الغرض آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ اب پھر اُمتِ محمد علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اپنے فرض منصبی کو پہچانے اور اُس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک عزمِ نو کے ساتھ کمربستہ ہو جائے' تاکہ بعثتِ محمدی کا مقصد بتمام وکمال پورا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر دینِ محمدیؐ کا پرچم لہرا اُٹھے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَهُمْ

—— آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ! ——

مقالۂ ثانی

انقلابِ نبویؐ
کا اساسی منہاج

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کو 'داعئ انقلاب' کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپؐ کی تحقیر و توہین ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ''داعئ انقلاب'' کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام وکمال ہوسکتا ہے تو وہ صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور ان کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک ہی گوشے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاست وحکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں، جبکہ نبی اکرم ﷺ نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد ونظریات، علوم وفنون، قانون واَخلاق، تہذیب وتمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست وحکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی ایک گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

مزید برآں اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی خود ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جِدّوجُہد کو کشمکش اور تصادم کے جملہ مراحل سے گزار کر خود ہی کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ انقلابِ فرانس اُس فکر کے نتیجے میں رونما ہوا جو والٹیئر اور روسو ایسے بیسیوں مصنفوں کی تالیفات کے ذریعے تخلیق پایا اور پھیلا۔ لیکن انقلاب عملاً کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں برپا ہوا اور اس کی بالفعل رہنمائی میں ان مفکرین کا کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح

انقلابِ روس کی اساس اس فکر پر قائم ہوئی جو مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ”داس کیپٹل“ کے ذریعے پیش کیا لیکن خود مارکس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان پیدا نہ ہوسکا۔ اگرچہ بعد میں ایک فعال شخص لینن نے اس فکر کے ذریعے انقلاب برپا کردیا — اس پس منظر میں دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حددرجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم ﷺ کا کہ آپ نے ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز فرما کر کُل ۲۳ برس میں، اور وہ بھی شمسی نہیں قمری، انقلابِ اسلامی کی تکمیل فرمادی اور ایک وسیع و عریض خطے پر دین حق کو اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کردیا۔ **فصلّی اللّٰہ علیہ وعلٰی آلہٖ واصحابہٖ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرا وفداہُ آباءُ نا وامھاتنا!**

ایک فردِ واحد کی مختصر سی زندگی کے بائیس سالوں میں تاریخ انسانی کے عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب کے از ابتدا تا انتہا جملہ مراحل طے پا جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران حالات و واقعات کی رفتار اتنی تیز اور انقلابی عمل کا زور (tempo) اتنا شدید نظر آتا ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے میں بالعموم نگاہیں صرف تصادم و کشمکش کے مختلف مراحل و مظاہر میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، اور جس طرح کسی زورشور سے بہنے والی پہاڑی ندی کو دیکھتے ہوئے انسان بالعموم اس کی سطح کے ہیجان و اضطراب ہی سے مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی گہرائی کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی اسے نہیں ملتا، اسی طرح انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج بھی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ چنانچہ اوّل اوّل تو سیرتِ مطہرہ سے متعلق جو مواد جمع ہوا تھا، وہ تھا ہی سارے کے سارا مغازی پر مشتمل۔ تاحال بھی سیرتِ مبارکہ کے مطالعے میں اصل توجہ مرتکز رہتی ہے ہجرت سے پہلے کی passive resistance پر، جس کے اہم نقوش ہیں تمام مسلمانوں پر بالعموم اور غلاموں پر بالخصوص شدید بہیمانہ تشدد (persecution)، ہجرتِ حبشہ، شعب بنی ہاشم، یومِ طائف، فیصلہ قتلِ نبویؐ، محاصرۂ کاشانہ نبوت، غارِ ثور اور تعاقب سراقہ بن مالک — اور ہجرت کے بعد کے اقدام اور active resistance پر

جس کے اہم اور نمایاں نشانات ہیں قریش کی معاشی ناکہ بندی' بدر' اُحد اور احزاب کا مسلح تصادم' جس میں عارضی سا وقفہ ہوا صلح حدیبیہ سے جس کے ختم ہوتے ہی تصادم دوگونہ ہو گیا۔ یعنی اندرونِ عرب بھی جس کے اہم نقوش ہیں فتح خیبر' فتح مکہ اور غزوۂ حنین اور بیرونِ عرب بھی جس کے نمایاں نشانات ہیں غزوۂ موتہ اور سفرِ تبوک۔

حضرتِ اکبرالٰہ آبادی کے اس حد درجہ سلیس لیکن نہایت پُر معنی شعر کے مصداق کہ ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے　　　نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

غور کرنا چاہیے کہ آنحضورؐ کی عظیم انقلابی جِدّوجُہد کی تہہ میں کارفرما وہ اصل طریق کار اور اساسی منہج عمل کیا تھا جس کے ذریعے وہ مردانِ کار فراہم ہوئے جنہوں نے آیۂ قرآنی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾ (الاحزاب)

''اہلِ ایمان میں وہ جواں مرد ہیں جنہوں نے پورا کر دکھایا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا' پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر کے سرخرو ہو چکے اور وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں (کہ کب باری آئے اور وہ بھی اللہ کی راہ میں سر کٹا کر سبکدوش ہو جائیں۔) بہرصورت انہوں نے اپنے موقف سے سر مو تبدیلی نہیں کی۔''

کے مصداق انقلابِ نبویؐ کے شجرۂ طیبہ کو اپنے خون سے سینچا اور اپنی ہڈیوں اور گوشت پوست کی کھاد سے پروان چڑھایا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

قرآن حکیم کی چار اہم اصطلاحات

اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم قرآن حکیم کی جانب رجوع کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کی وضاحت کے لیے اگر تین بار ان الفاظِ مبارکہ کو دہرایا کہ:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ : ۳۳‘ الفتح ۲۸ اور الصف:۹)

’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو پورے کے پورے دین پر!‘‘

تو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے بھی چار اہم اور بنیادی اصطلاحات کو پورے چار بار دہرایا —— یعنی:

۱۔ تلاوتِ آیات‘ ۲۔ تزکیۂ نفوس‘ ۳۔ تعلیمِ کتاب‘ اور ۴۔ تعلیمِ حکمت!

(۱) چنانچہ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ کے پندرھویں رکوع کے آخر میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ (البقرۃ)

’’اے ربّ ہمارے! ہم دونوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت برپا کیجیو جو تیری فرمانبردار ہو‘ اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے طور طریقے‘ اور قبول فرما ہماری توبہ‘ یقیناً تو توبہ قبول کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ربّ ہمارے! تو مبعوث فرمائیو ان میں‘ ان ہی میں سے ایک رسول جو ان کو سنائے تیری آیات‘ اور انہیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور تزکیہ کرے ان کا۔ بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا۔‘‘

(۲) پھر تین ہی رکوعوں کے بعد‘ اٹھارھویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت دراصل اسی دعائے ابراہیم و اسماعیل عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْهِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کا ظہور ہے‘ ان ہی اصطلاحاتِ اربعہ کو دہرایا گیا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾ (البقرۃ)

''چنانچہ بھیج دیا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے جو سناتا ہے تمہیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔''

(۳) اگلی سورت یعنی سورۂ آلِ عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ وارد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۱۶۴﴾﴾

''اللہ نے احسانِ عظیم فرمایا ہے اہلِ ایمان پر کہ اٹھایا ان میں ایک رسول ان ہی میں سے جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی۔ اور یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں۔''

(۴) آخری بار یہ مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الجمعہ میں آتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۲﴾﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا اُمیوں میں ایک رسول ان ہی میں سے جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔ اور یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!''

اور یہاں اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۃ الجمعہ سے متصلاً قبل ہے سورۃ الصف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں آنحضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے، یعنی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

گویا آنحضور ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے: 'اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلّہ اور اُس کے لیے آپ ﷺ کا طریقِ کار اور منہجِ عمل ہے: تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیمِ کتاب وحکمت!

مقصد اور طریق کار

اس مقام پر ذرا توقف کر کے ایک اہم حقیقت پر غور کر لینا چاہیے اور وہ یہ کہ کسی بھی اہم کام کے لیے مقصد اور طریق کار دونوں نہایت اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقصد میں آخری منزل پیش نظر رہتی ہے اور طریق کار میں ہر ہر مرحلے کے لوازم پر توجہ دی جاتی ہے' اور ظاہر ہے کہ ان دونوں کا توازن ہی کسی کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا ضامن بن سکتا ہے' اور جو شخص یا گروہ بیک وقت ان دونوں کو ملحوظ نہ رکھ سکے وہ اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ ماضی کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے اور خود ہمارے گردو پیش میں بھی اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخصیت یا جماعت اپنے پیش نظر مقصود کے حصول کی عجلت میں درمیانی مراحل کو پھلانگ جانا چاہتی ہے اور کسی راہِ قصیر (short cut) کی دلدل میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اُس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا اور وہ راہِ قصیر اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ گویا وہ کمبل کو چھوڑنا چاہے بھی تو کمبل اسے نہیں چھوڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے اپنے متوسلین کی ہمت یہ کہہ کر بندھائی جاتی رہے کہ: ؏

''اِس موڑ سے آگے منزل ہے' مایوس نہ ہو درّاتا جا!''

اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ذریعے ہی کو مقصد بنا بیٹھتا ہے اور راستے ہی کو منزل قرار دے لیتا ہے۔ نتیجتاً ساری توانائیاں ایک دائرے میں حرکت کرتے رہنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور اہل قافلہ ﴿وَهُمْ يَحْسَبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾(۱) کے مصداق صرف حرکت اور اس کی تیز رفتاری ہی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

اب اگر اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب طریق ہوتا ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کار موزوں نہیں ہوتا تو جو لوگ **خلافة علٰى منهاج النبوة** کے قیام کے خواہش مند ہوں ان کے لیے لازمی و لابدی ہے کہ وہ غور کریں کہ آنحضور ﷺ کا اصل منہج عمل کیا تھا۔ مبادا وہ بھی متذکرہ بالا اِفراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جائیں!

---

(۱) الکہف:۱۰۴: ''اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔''

اس ضمن میں کتنی پیاری ہے وہ بات جو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمائی کہ **لَا یَصْلُحُ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا** ''اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر صرف اسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی کایا پلٹ ہوئی تھی'' ــــــ اور کتنی حیرت ناک ہے یہ حقیقت کہ دورِ نبویؐ سے اس قدر قرب کے باوصف ائمہ دین کو کتنی فکر تھی اس آخری دور کی جس میں ہم جی رہے ہیں!

اس ضمن میں ایک اور اہم حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ قرآن حکیم انقلابِ اسلامی کے لیے کسی منہجِ عمل کی جانب رہنمائی نہیں کرتا تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ یہ قرآن مجید پر بھی ایک سنگین طعن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی حد درجہ ناروا سوءِ ظن۔ اس لیے کہ مسلمانوں پر 'خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' کے قیام کی سعی کو مستقلاً فرض اور واجب کر دینا لیکن اس کے لیے کسی واضح طریق کار کی نشاندہی نہ کرنا صریح ظلم قرار پائے گا۔ **سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ!** اصل بات یہ ہے کہ ہم نے نہ تو بمصداق آیتِ قرآنی: ﴿**وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ**﴾(۱) اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت کو پہچانا' نہ بمصداق آیت مبارکہ: ﴿**اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا ○**﴾(۲) قرآن حکیم ہی پر غور کیا' بلکہ اسے: ﴿**نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ**﴾(۳) کے مصداق پس پشت ڈال دیا اور صرف حصول و ایصالِ ثواب کا آلہ بنا کر رکھ دیا ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا!

مرکز و محور: قرآنِ حکیم

اب ذرا ان چار اصطلاحات پر توجہ مرکوز فرمائیے جن میں نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہجِ عمل کا بیان ہوا ہے' تو سب سے نمایاں حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کا مرکز و محور قرآن حکیم ہے! اس لیے کہ ان میں سے پہلی اور تیسری یعنی تلاوتِ

(۱) الزمر:۶۷ (۲) محمد:۲۴ (۳) البقرۃ:۱۰۱

آیات اور تعلیم کتاب تو بالبداہت قرآن مجید ہی سے متعلق ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور چوتھی کا مدار بھی قرآن ہی پر ہے' اس لیے کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) (لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے موعظت و نصیحت بھی اور جملہ امراضِ قلبی کی شفا بھی) تزکیۂ نفوس' تصفیۂ قلوب اور تجلیۂ باطن درحقیقت ثمرہ ہے تلاوتِ آیات کا اور بفحوائے آیت قرآنی: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسراءیل:۳۹) (یہ ہے وہ حکمت جو تیرے رب نے تجھ پر وحی فرمائی) حکمت بھی جزوِ لاینفک ہے قرآن حکیم کا!

گویا انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہج عمل پورے کا پورا گھومتا ہے قرآن مجید کے گرد' یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ آنحضورﷺ کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم!

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں تو بیان کیا مولانا حالی نے کہ:

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

اور حد درجہ پُرشکوہ الفاظ میں بیان فرمایا علامہ اقبال نے کہ: ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست او — زندہ و پائندہ و گویا ست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

گویا آنحضورﷺ کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ یہ تھا کہ قرآن حکیم: ''چوں بجاں در رفت!'' کے مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باطن میں سرایت کر گیا اور ان کے اذہان و قلوب اس کے نور سے منور ہو گئے۔ نتیجتاً ان کی زندگیوں میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ ان کی سوچ بدل گئی' ان کا فکر بدل گیا' ان کے عقائد بدل گئے' ان کی اقدار بدل گئیں' ان کے

عزائم بدل گئے‘ ان کے مقاصد بدل گئے‘ ان کی آرزوئیں بدل گئیں‘ ان کی تمنائیں بدل گئیں‘ ان کے دن بدل گئے‘ ان کی راتیں بدل گئیں‘ ان کی صُبحیں بدل گئیں‘ ان کی شامیں بدل گئیں‘ ان کی زمین بدل گئی‘ ان کا آسمان بدل گیا‘ یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہوگئی! اور یہ ساری تبدیلی ثمرہ تھی ایک کتاب اور اس کے علم و حکمت کا اور اس کے معلم اور اس کی تعلیم و تربیت کا —— فصلی اللّٰہ علیہ وسلم! اسی لیے فرمایا آنحضورﷺ نے کہ: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) [1] (میں تو صرف معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں!)۔ واضح رہنا چاہیے کہ آنحضورؐ کا اصل ایجابی اور مثبت عمل صرف تلاوتِ آیات و تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت تھا۔ تصادم اور کشمکش کی وہ ساری صورتیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اصلاً مظہر ہیں اس ردعمل کا جو ایک غلط نظامِ فکر و عمل کی جانب سے دعوتِ حق کے جواب میں پیش آنا لازمی ہے۔ تاہم اصل عمل اور ردعمل کے تدارک کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر کے مابین فرق و امتیاز نہ کرنا بڑی ناسمجھی ہے!

کتابِ الٰہی اور اس کے معلم ﷺ کی ذاتِ اَقدس کی عظمت تو ظاہر ہے کہ بیان تو کجا تخیل و ادراک کی گرفت میں بھی نہیں آسکتی۔ موجودہ دور میں تو ایک عام انسان کی تصنیف [2] کا یہ اعجاز نگاہوں کے سامنے ہے کہ روئے زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر جو نظام قائم ہے وہ سب اس کے ظہور و بروز کے سوا اور کچھ نہیں۔ غالباً اسی لیے کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے مارکس کے بارے میں کہ ؏: ''نیست پیغمبر ولیکن دربغل دارد کتاب!''

تلاوتِ آیات

اس اجمال کی تفصیل قرآن حکیم کے طول و عرض میں تانے بانے کے مانند بُنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کارِ نبوت و رسالت کی تکمیل اور فرائضِ دعوت و تبلیغ کے جتنے پہلو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان سب کا مبنیٰ و مدار اور مرکز و محور خود قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں طوالت کے خوف کے باوجود چند اشارات ضروری ہیں:

(۱) قرآن حکیم کی رو سے انبیاء و رسل ؑ کے فرائض میں سب سے زیادہ اساسی فریضہ

(۱) سنن ابن ماجہ‘ المقدمۃ‘ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم۔ (۲) داس کیپٹل

اِنذار و تبشیر کا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں بہت سے انبیاء ورسل کا ذکر کر کے فرمایا گیا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ﴾ (آیت ۱۶۵)

''(یہ حضرات) رسول بنا کر بھیجے گئے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے' تاکہ ان (کی بعثت) کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی دلیل (عذر) نہ رہ سکے!''

سورۃ الکہف میں بطور کلیہ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۚ﴾ (آیت ۵۶)

''اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر صرف مبشر اور نذیر بنا کر!''

اور سورۂ بنی اسرائیل میں تعین کے ساتھ آنحضور ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾﴾

''اور نہیں بھیجا (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو مگر صرف مبشر اور نذیر بنا کر!''

اب دیکھئے کہ ازروئے قرآن اس انذار و تبشیر کا مبنیٰ و مدار خود قرآن حکیم ہی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۰﴾﴾

''بے شک یہ قرآن اس راستے کی راہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے' اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے!''

سورۃ الکہف کا آغاز ان مبارک الفاظ سے ہوا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾﴾

''شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اُس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ بالکل ہموار اور استوار' تا کہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال کر رہے ہیں' اس بات کی خوشخبری سنا دے کہ ان کے لیے بہت اچھا اجر ہے!''

اور سورۂ مریم کے اختتام پر فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾﴾

''پس ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں اس لیے سہل و سازگار بنایا کہ تم اس کے ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو۔''

سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (آیت ۱۹)

''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تمہیں بھی خبردار کر دوں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچ جائے۔''

(۲) فرائضِ نبوت کے ضمن میں قرآن حکیم کی دوسری اہم اصطلاح 'تذکیر' ہے۔ اس ضمن میں اس سے قطع نظر کہ قرآن خود اپنے آپ کو جا بجا **الذّکر**' **ذِکْرٰی** اور **تَذْكِرَة** قرار دیتا ہے' سورۂ قٓ کے آخر میں یہ صریح حکم بھی دے دیا گیا:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾﴾ یعنی تذکیر کرو بذریعہ قرآن حکیم......

(۳) اسی طرح فرائض رسالت کے ذیل میں قرآن حکیم کی ایک اہم اصطلاح 'تبلیغ' ہے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے تو اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''پہنچا دو جو کچھ نازل کیا گیا تم پر تمہارے رب کی جانب سے''۔ اور آنحضور ﷺ نے اُمت کو حکم دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً))[1] ''پہنچا دو میری جانب سے خواہ قرآن کی ایک ہی آیت ہو!'' گویا تبلیغ کا اصل موضوع قرآن مجید اور اس کی آیاتِ بینات کے سوا اور کچھ نہیں!!

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ راوی: عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما۔

(۴) غالباً اس سلسلے کی سب سے جامع اصطلاح 'دعوت' ہے جس کے ضمن میں سورۃ النحل میں یہ جامع و مانع ہدایت دی گئی :

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (آیت ۱۲۵)

''بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ سے اور بحث و جدال کرو اس طور سے جو نہایت عمدہ ہو۔''

اب غور فرمائیے کہ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے حکمت بھی قرآن حکیم ہی کا ایک جزوِ لاینفک ہے اور موعظہ حسنہ کا مصداقِ کامل بھی خود قرآن مجید ہی ہے' اور خواہ ملحدین ہوں یا مشرکین' یہود ہوں یا نصاریٰ' منکرینِ قیامت ہوں یا مکذبینِ رسالت' کافر ہوں یا منافق ان سب کے ساتھ مفصل مباحثہ و مجادلہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ گویا دعوت الی اللہ یا دعوت الیٰ سبیل رب کا اصل مبنیٰ و مدار خود قرآن حکیم ہے۔

الغرض یہ تفصیل و تشریح ہوئی 'تلاوتِ آیات' کی کہ انذار ہو یا تبشیر' تبلیغ ہو یا تذکیر اور مباحثہ ہو یا مجادلہ' دعوتِ نبویؐ کا مرکز و محور ہیں آیاتِ قرآنی۔

تزکیہ

اب آیئے عملِ تزکیہ کی جانب' جس کے ضمن میں افسوس ہے کہ قرآن کی ناقدری کا معاملہ اُمتِ مسلمہ نے آخری حدوں تک پہنچا دیا۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت مجموعہ ہے فکر و عمل کا اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں' بایں معنیٰ کہ ''گندم از گندم بروید' جو ز جو!'' کے مصداق غلط فکر' غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لیے تصحیح فکر لازمی و لابدی ہے۔ گویا اگر کسی انسان کے فکر کی تطہیر ہو جائے اور فاسد خیالات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا جائے تو غیر صالح اعمال اور ناقص عادات و اطوار آپ سے آپ پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں گے' اور اگر صحیح فکر کی جڑیں ذہن انسانی میں راسخ ہو جائیں تو اَعمالِ صالحہ اور اَخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (phenomenon) کو قرآن حکیم ﴿وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ

سَيِّاٰتِهِمْ ﴾[1] بھی قرار دیتا ہے اور ﴿ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ﴾[2] بھی۔ اور یہی قرآن حکیم کا اصل فلسفہ تزکیہ ہے یعنی یہ کہ تزکیہ نفس کے لیے اضافی اور مصنوعی تدابیر نہ ضروری ہیں نہ مفید مطلب' بلکہ تزکیہ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیر فکر کا اور وہ فطری ثمرہ ہے تلاوت آیات کا۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ ابراہیم و اسماعیل (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) نے تو اصطلاحاتِ اربعہ میں تزکیہ کا ذکر آخر میں کیا تھا' لیکن قرآن مجید میں بقیہ تینوں مقامات پر اس کا ذکر تلاوتِ آیات کے فوراً و معاً بعد ہوا ہے!

تزکیۂ نفس کے ضمن میں ایک دوسری حقیقت بلاشبہ یہ بھی ہے کہ انسانی شخصیت میں فکر اور عمل کے مابین ایک اور عنصر جذبات کا بھی ہے' اور ویسے تو ان کی اہمیت ہر انسان کی زندگی میں مسلم ہے' لیکن خصوصاً وہ لوگ جن کا شعور پختہ نہیں ہوتا یا جو عقلاً بالغ نہیں ہوتے اُن کی زندگیوں میں تو فیصلہ کن اہمیت ان ہی کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن دعوت کی اساس صرف حکمت ہی پر نہیں رکھتا موعظت پر بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو ''موعظہ حسنہ'' بھی قرار دیتا ہے اور ''شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ'' بھی — اس پس منظر میں دیکھئے کہ کس قدر افسوسناک ہے وہ صورت حال جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ان اشعار میں کھینچا ہے کہ:۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست   از شرابِ نغمہ قوال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش   در نمی سازد بقرآں محفلش![3]

حالانکہ اگر جذبات کی جلا اور سوز و گداز و کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو ان کا بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ خود قرآن مجید ہی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے اپنے حواشی ترجمۂ قرآن میں اپنے والد مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُرتاثیر اشعار نقل کیے ہیں:۔

---

(۱) الفتح: ۵ : ''اور تاکہ دور کر دے ان سے ان کی برائیاں!''

(۲) الفرقان: ۷۰: ''تبدیل کر دے گا اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے!''

(۳) اونی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے' لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو
کان بہرے ہوگئے دل بے مزہ ہونے کو ہے!
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی
پارہ جس کے لحن سے طورِ ہدیٰ ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو
کوہ جس سے خاشعاً متصدّعا ہونے کو ہے!

اس ضمن میں ذرا غور فرمایئے اور داد دیجیے اس پر کہ نفسِ امارہ کی طوفاں خیزیوں' اور ابلیسِ لعین کی وسوسہ اندازیوں سے بچنے کے لیے کس قدر صحیح مشورہ دیا ہے علامہ اقبال مرحوم نے کہ: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی[1]

تعلیمِ کتاب

آنحضور ﷺ کے طریق انقلاب میں تلاوتِ آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد نمبر آتا ہے 'تعلیم کتاب' کا جو اصلاً عبارت ہے شریعتِ اسلامی کے اوامر و نواہی کی تعلیم اور احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ سے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں لفظ کتاب کا اطلاق بالعموم شریعت کے قواعد و ضوابط پر ہوا ہے جیسے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا﴾[2] میں' یا: ﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ أَجَلَهُ﴾[3] میں۔ اسی طرح قرآن مجید میں کسی شے کی فرضیت و مشروعیت کے لیے بھی

(۱) شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے' اس لیے کہ اس کا بسیرا نفس انسانی کی گہرائیوں میں ہے! بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت و ہدایت کی) شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے!

(۲) النساء: ۱۰۳: ''بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں۔''

(۳) البقرۃ: ۲۳۵: ''اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت مقررہ اپنی انتہا کو۔''

''کُتِبَ'' کالفظ بکثرت استعمال ہوا ہے' جیسے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾[1]—
﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾[2]— ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ﴾[3]— ﴿رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ﴾[4]- ﴿وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾[5]۔

واضح رہنا چاہیے کہ تلاوتِ آیات اور تزکیہ کے مراحل طے ہو جانے کے بعد ہی انسانی شخصیت کی زمین پورے طور پر تیار ہوتی ہے کہ اس میں شریعت کے اوامر ونواہی اور احکامِ الٰہی کے بیج بوئے جائیں اور وہ بر وتقویٰ کی ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی کی صورت اختیار کر لے۔ بصورتِ دیگر فصل کا حصول در کنار بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن مجید کا 'کتاب' والا حصہ یعنی اس کی وہ آیات وسُور جن میں حلال وحرام کے تفصیلی احکام بیان ہوئے ہیں' اُس وقت نازل ہوا جب پورے پندرہ سال کی محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں' جس میں تمام تر توجہات تلاوتِ آیات اور تزکیہ پر مرتکز رہی تھیں' ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا جوان احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب تھا! اس کی سب سے نمایاں اور درخشاں مثال حرمت شراب کے معاملے میں ملتی ہے کہ اُدھر حکم نازل ہوا اِدھر شراب کے برتن توڑ ڈالے گئے اور پھر ان لوگوں نے کبھی شراب کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا جن کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور پوری پوری عمریں پینے اور پلانے میں گزری تھیں۔ اور اس کے بالکل برعکس معاملہ ہوا اس دور میں امریکہ ایسے تعلیم یافتہ اور مہذب ومتمدن ملک میں جہاں prohibition act کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں اور ع ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کے آگے تمام سائنسی حقائق اور اعداد وشمار دھرے کے دھرے رہ گئے!

(۱) البقرۃ:۱۸۳: ''فرض کیا گیا تم پر روزہ۔''
(۲) البقرۃ:۲۱۶: ''فرض کی گئی تم پر لڑائی۔''
(۳) البقرۃ:۱۸۰: ''فرض کر دیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت' بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال' وصیت کرنا۔''
(۴) النساء:۷۷: ''(اور کہنے لگے) اے رب ہمارے! کیوں فرض کی تو نے ہم پر لڑائی؟''
(۵) النساء:۶۶: ''اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جان......''

تعلیمِ حکمت

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج (climax) ہے 'تعلیم حکمت'——
حکمت اصلاً عبارت ہے انسانی عقل اور شعور کی پختگی کی اس سطح سے جہاں پہنچ کر احکامِ شریعت کے اَسرار و رموز واضح ہو جاتے ہیں اور ان کی حکیمانہ غرض و غایت منکشف ہو جاتی ہے۔ گویا اَحکام بے جان اور زبردستی کے ساتھ ٹھونسے ہوئے اوامر و نواہی نہیں رہتے بلکہ فکر و عمل کے ایک حد درجہ حکیمانہ نظام کے ایسے باہم دگر منظّم و مربوط اجزاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن میں نہایت حسین توازن و توافق موجود ہو۔ یاد ہو گا' یہی اصل موضوع ہے فاتح دورِ حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق تالیف ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة'' کا' اور یہی ہے وہ جنسِ کمیاب جسے قرآن حکیم 'خیر کثیر' قرار دیتا ہے' بفحوائے آیت قرآنی: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ ﴾ (البقرة: ۲۶۹) (اور یہ بات بھی محض اتفاقی نہیں کہ 'خیر کثیر' بھی نام ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک حد درجہ پُر از حکمت تصنیف کا!) گویا حکمت کی تحصیل ہر انسان کے بس کا روگ نہیں' بلکہ یہ تعلیم و تربیتِ نبویؐ کا وہ 'درجہ تخصّص' ہے جس سے فیض یاب صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کے نفوس میں علم کی ایک پیاس فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے لیے ظواہر پر اکتفا ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ حقائقِ باطنی کی تحقیق و تفتیش پر اسی طرح مجبور و مضطر ہو جاتے ہیں جس طرح بھوکا تحصیلِ غذا پر اور پیاسا تلاشِ آب پر —— وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ! اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں!

اس ضمن میں بھی اس خیال سے کہ حکمت سے لازماً قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز مراد ہے قرآن حکیم کے ساتھ ایک نادانستہ اور غیر شعوری سوءِ ظن کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حکمت تو قرآن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے' اس لیے بھی کہ اس کی ایک مستقل صفت ہی ''حکیم'' ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس کی شان یہ ہے کہ ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ① ﴾ (ھود)۔ مزید برآں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' قرآن میں صراحتاً بھی مذکور ہے کہ: ﴿ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ

رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ اور اس سلسلے میں بھی حظ اٹھایئے اور وجد میں آیئے علامہ اقبال کے ان اشعار پر۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم! تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اَسرارِ دیں را فاش کُن نکتہ شرعِ مبیں را فاش کُن!

افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ علم وفضل نے بہت کم توجہ دی قرآن حکیم کی ان اصطلاحاتِ اربعہ پر جو قرآن مجید میں ایک نہ دو پورے چار مرتبہ دہرائی گئیں' حالانکہ بلاسبب تکرار بظاہر کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور نہ قرآن عظیم کے مُنزِل ومُرسِل تبارک وتعالیٰ کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی تھی' نہ عربی زبان کا دامن ہی اتنا تنگ تھا کہ ہر بار مختلف الفاظ نہ لائے جاسکتے۔ اس اعادہ وتکرار کا سبب ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اگرچہ ویسے تو قرآن مجید کا ہر ہر لفظ غالبؔ کے اس شعر کا مصداقِ کامل واتم ہے کہ: ع

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے!

لیکن ان اصطلاحاتِ اربعہ کی حیثیت تو بالخصوص ایسی ہے کہ ان پر توجہات کو بالکل ع ''زیرِ ہر ہر لفظ غالب چیدہ اَم میخانہ!'' کے مصداق مرتکز کردیا جائے۔

الغرض! انقلابِ نبویؐ کے تکمیلی مراحل تو وہی ہیں جو ہر انقلاب میں پائے جانے لازمی ہیں' یعنی دعوت وتنظیم' تصادم وکشمکش' ہجرت وانقطاع اور جہاد وقتال۔ لیکن اس کا اساسی منہاج مشتمل ہے تلاوتِ آیات' تزکیہ اور تعلیمِ کتاب وحکمت پر' جس کا مرکز ومحور ہے قرآن حکیم!

انفرادی تبدیلی

اگر آپ کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی یہ 'انقلاب' لانا چاہیں تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے آپ اس کے فکر کا جائزہ لیں اور تلاوتِ آیات کے ذریعے اس کے ذہن کو فاسد خیالات اور غلط نظریات سے اور اُس کے قلب کو فاسد ارادوں اور غلط اُمنگوں اور خواہشات سے پاک کریں۔ اس کے فکر کی ایمان باللہ' ایمان بالآخرت اور ایمان

بالرسالت کی محکم اساسات پر ازسرِ نو تعمیر کریں اور اس کے قلب کو نورِ ایمان سے منور کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غیر صالح اعمال اور غلط عادات و اطوار پت جھڑ کے پتوں کی طرح خود بخود جھڑ جائیں گے۔ اور تب موزوں وقت آئے گا اس کا کہ شریعت کے اوامر و نواہی کی تلقین اسے کی جائے۔ گویا اس کے وجود پر شریعت کا نفاذ عمل میں آ جائے۔ پھر اگر وہ صاحبِ استعداد ہو تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر حکمت کی تحصیل کرے جس سے اصل انشراحِ صدر اور اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو جائے گا—— اور اس کی شخصیت میں اس انقلاب کو تمکّن و استقلال بھی حاصل ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ہے وہ محنت و مشقت جس کا ثمرہ بیان ہوا آنحضور ﷺ کے اس حکیمانہ قول میں جو آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطاب کر کے فرمایا تھا: ((فَوَ اللّٰهِ لَاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ))(۱) ”اے علیؓ! اللہ کی قسم، اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے“۔ اور اگر آپ اس ہفت خواں کو طے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو آپ کی حالت وہی ہوگی جو ہمارے معاشرے میں ان بہت سے بڑے بوڑھوں کی ہوتی ہے جنہوں نے اپنی نوجوان نسل کو حوالے تو اس نظامِ تعلیم کے کیا ہے جس کے بارے میں غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

اور

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

نتیجتاً کسی کے ذہن پر برٹرینڈ رسل سوار ہے اور کسی کے ساغت، کوئی فرائڈ کا شیدائی ہے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة خیبر۔ وصحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب ؓ۔

اور کوئی یونگ یا ایڈلر یا میکڈوگل کا‘ کسی پر ڈارون کا جادو چلا ہوا ہے اور کسی پر ہیگل اور مارکس کا‘ چنانچہ خدا و آخرت اور وحی و رسالت پر ایمان و یقین کے آثار کا کوسوں پتا نہیں لیکن تلقین ہو رہی ہے نماز اور روزے کی اور فرمائش و فہمائش ہو رہی ہے شعائرِ دینی کے احترام کے بارے میں۔ نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ نوجوان اگر نسبتاً شریف اور سعادت مند ہے تو نگاہیں نیچی کر لے اور آپ کی موجودگی میں احتراماً آپ کی خواہش بھی پوری کر دے‘ لیکن اگر ذرا بے باک اور جری ہو تو صاف کہہ دے کہ ”چھوڑیئے ابا جان! یہ سب ڈھکوسلے ہیں‘ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے!“

اجتماعی انقلاب

اس معاملے میں انسانی معاشرہ یا انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا طرزِ عمل (behaviour) بھی بالکل ایک فردِ واحد کے مانند ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں قوم کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جسے بالعموم ذہین اقلیت یعنی intellectual minority یا intelligentsia یا brain trust قرار دیا جاتا ہے اور جس کی حیثیت جسدِ اجتماعی میں بالکل وہی ہوتی ہے جو فردِ واحد کے جسم میں اس کے دماغ کی۔ اگر کسی معاشرے میں اسلامی انقلاب لانا مطلوب ہو تو اولاً اس کے اس طبقے کو appeal کرنا اور اس کے قلوب و اذہان کو نورِ ایمانی سے منور کرنا‘ گویا اسے اسلام کے حق میں بالفعل convert کرنا ناگزیر ہے۔ معاشرے یا قوم کے دوسرے طبقات کی حیثیت اعضاء و جوارح کی ہے جو قلب و ذہن کے بے دام غلام ہوتے ہیں اور ان سے صادر ہونے والے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرتے ہیں۔ جو لوگ کسی معاشرے یا قوم کے اجتماعی فکر کی تطہیر اور اس کی سوچ کے دھارے کا رخ تبدیل کیے بغیر خواہش مند ہوں کہ معاشرہ بحیثیتِ مجموعی اسلام کو عملاً قبول کر لے‘ اُن کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ‘ اور نیک خواہشات اور تمنّائیں اپنے مقام پر‘ لیکن امرِ واقعہ کے اعتبار سے ان کی حالت بھی ان نیک مگر سادہ دل لوگوں سے کسی طرح مختلف نہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

① ایمان 209

② توقیر و تعظیم 211

اطاعت 213

محبت 215

اِتباع 216

انتباہ 219

③ نصرتِ رسولؐ 221

تبلیغ کا بارِ گراں 222

دعوت و تبلیغ کی غایت اولیٰ 223

آنحضور ﷺ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری 225

امتحان اور آزمائش 227

دروں بینی کی ضرورت 228

نبی اکرم ﷺ کی مستقبل کے بارے میں فہمائشیں 230

اتباع کا تقاضا 232

رسولؐ کی نصرت اللہ کی نصرت ہے 233

④ اتباعِ قرآن مجید 234

حبل اللہ 235

ہماری حالتِ زار 236

اصلاحِ حال کا واحد طریق 238

حرفِ آخر 243

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ وَنُسَلِّمُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ...... اَمَّا بَعْدُ:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف) صدق اللہ العظیم

ربیع الاوّل کے مہینے میں چونکہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی' لہٰذا اس مہینے میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً آنحضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں' آپ ﷺ کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت وعقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ ہم نے بحیثیتِ اُمتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور نبی اکرم ﷺ کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیے۔ یہ جھوٹا اطمینان (pseudo satisfaction) عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ازروئے قرآن حکیم نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے' اور ہم سے خدا کے ہاں آنحضور ﷺ کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہوگا؟ پھر اس علم کی روشنی میں حضور ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کریں اور اس ضمن میں جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کا ازالہ کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ اگر ہم یہ

ارادہ لے کر سیرت کی کسی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر وہاں سے اٹھیں تو یہ یقیناً فائدے کی بات ہے اور آخرت کے اعتبار سے نفع بخش ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت کے تقاضوں کو واضح کرنے کے لیے میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ اس کے لیے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کا آخری جزو منتخب کیا ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۵۷﴾﴾

''پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرم ﷺ) پر اور جنہوں نے انؐ کی توقیر و تعظیم کی' اور جنہوں نے انؐ کی مدد اور حمایت کی (یعنی انؐ کے مشن میں انؐ کے دست و بازو بنے' اور ان کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو انؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے' تو یہی ہیں وہ لوگ جو فلاح پانے والے ہیں۔''

جس آیتِ کریمہ کا آخری جزو اِس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ پوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ اس میں اصل تخاطب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ ''اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ'' ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں اور جن کی آمد کی خوش خبری انبیاءِ سابقین دیتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے یہ رسول (ﷺ) تمہارے پاس آ گئے ہیں' یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں' تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہیں' اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بیجا وزن اور بوجھ لاد رکھے ہیں اور رسوم و قیود کی جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں' ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں...... اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جو اس وقت ہمارے زیر مطالعہ ہیں:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۵۷﴾

آیت کریمہ کے اس حصے پر غور کرنے سے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق کی چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

- پہلی یہ کہ حضور ﷺ پر ایمان لایا جائے‘ آپؐ کی تصدیق کی جائے۔
- دوسری یہ کہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے۔
- تیسری یہ کہ حضور ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔
- چوتھی یہ کہ حضور ﷺ پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی جائے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لیے اس مینارۂ نور سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں پیش کر دی جائیں‘ جو اگرچہ تفصیل کی متقاضی ہیں‘ لیکن میں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کر دی جائیں جو ہمارے لیے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

(۱) ایمان

متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اوّلین اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ کو اللہ کا نبی‘ اللہ کا رسول‘ اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس اقرار و یقین کا نام ''ایمان'' ہے اور اسی سے ہمارے اور حضور ﷺ کے مابین ایک تعلق اور رشتے کا آغاز ہوتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ میں اگرچہ سادات اور ہاشمی بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں‘ لیکن عظیم اکثریت یقیناً اُن لوگوں کی ہے جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہر اُمتی کو حضورؐ کے ساتھ ایک نسبت و تعلق حاصل ہے اور یہی تعلق سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے‘ یعنی ایمان کا تعلق‘ اِس یقین کا تعلق کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو پورے عالَم کے لیے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث کیے گئے اور جو تمام بنی نوعِ آدم

کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ بحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا...... ﴾ (سبا: ۲۸)

''اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر!)''

اکثر و بیشتر حضرات کے علم میں ہوگا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ میں ان دو درجوں کے لیے دو اصطلاحیں آئی ہیں' ایک اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ اور دوسری تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ۔ یعنی نبی اکرم ﷺ پر ایمان کے ضمن میں زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقینِ کامل رکھنا۔ ان کو آپ ایمان کے دو درجے' دو مراتب' یا دو پہلو کہہ سکتے ہیں اور جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہوگا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے لیکن دل میں یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں' بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے' بلکہ آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے' روزے رکھتے تھے' زکوٰۃ ادا کرتے تھے' لیکن ان کے دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانا جہنم قرار پایا' بلکہ جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (النساء: ۱۴۵) ''یقیناً منافق تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔'' اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضور ﷺ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو' لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانونِ شریعت کی رُو سے ایسا شخص کافر قرار پائے گا۔ دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار کرے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ' اور آخرت میں وہی شخص مؤمن قرار پائے گا جو اقرار بالّسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو' جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور ان پر اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابد الآباد تک محفوظ

رہے گی۔ غرضیکہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہو گی۔

② توقیر و تعظیم

ایمان کے دونوں درجوں کو لازم و ملزوم سمجھنے سے یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ میں آ جائے گی کہ ایمان جب یقینِ قلبی کے درجے تک پہنچتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات لازماً پیدا ہونے چاہئیں۔ اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد ''عَــــزَّرُوْهُ'' کے لفظ میں آیا ہے۔ ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ﴾ یعنی ''پس وہ لوگ جو محمد (ﷺ) پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی''۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ آپؐ ہمارے خالق، ہمارے مالک، ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں، اس کے پیغامبر ہیں، اس کے رسول ہیں، جنہیں اس نے ہماری ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا ہے اور آنحضور ﷺ نے جو کچھ پیش فرمایا ہے، جو تعلیم دی ہے، جو احکام دیے ہیں، جو خبریں دی ہیں، جو اوامر و نواہی بتائے ہیں، حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں، ان میں سے کوئی بات بھی انہوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے، جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ③ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ④﴾ ''اور یہ (رسول ﷺ) اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو صرف وحی ہے جو (ان پر) بھیجی جاتی ہے'' تو دل میں آپؐ کی توقیر و تعظیم کا جذبہ پیدا ہونا اور عمل میں اس کا اظہار منطقی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ آنحضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا ادب و احترام ہے۔

سورۃ الحجرات میں اس ادب و احترام اور توقیر و تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں سے مطلوب ہے اور جو انہیں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿٢﴾﴾

''اے ایمان والو! مت بلند کرواپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کیا کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے ہو' مبادا تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں شعور تک نہ ہو۔''

شعور واحساس تو اسی وقت ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ آنحضورﷺ کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہورہا ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں رسولﷺ کی نافرمانی اور معصیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا' بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے نیک اعمال اکارت ہونے کی وعید سنائی جارہی ہے۔ رسول اللہﷺ کی نافرمانی اور حکم عدولی اور آپﷺ کی رائے کو پس پشت ڈال دینا تو بڑی دُور کی بات ہے' جس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں' محض یہ سوئے ادب کہ رسول اللہﷺ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کردیا جائے' تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے اور کیسی زبردست تنبیہہ کی گئی ہے کہ حضورﷺ کے معاملے میں ایسی بے احتیاطی برتنے کے سبب سے اب تک کے تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا' تمہاری سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور تمہیں معلوم تک نہ ہوگا کہ تم نے اس بے ادبی اور بے احتیاطی سے کیا کچھ کھودیا اور تم کیسے عظیم نقصان اور خسارے سے دوچار ہوگئے۔ اس لیے کہ تم اس مغالطے میں رہو گے کہ ہم نے حضورﷺ کی کوئی حکم عدولی تو نہیں کی اور ہم سے کسی معصیتِ صریحہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا۔ سورۃ الحجرات کی اس آیتِ مبارکہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ایمان بالرسالت کا پہلا لازمی نتیجہ نبی اکرمﷺ کا ادب واحترام اور آپؐ کی توقیر وتعظیم ہے۔

اب اسی ایمان کے دو مضمرات رسول اللہﷺ کی دو مشہور احادیث کے حوالے سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک ہے اطاعتِ رسولﷺ اور دوسرا ہے محبتِ رسولﷺ۔

اطاعت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کا پہلا لازمی نتیجہ آپؐ کی مکمل اطاعت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ)) (۱)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں ''شرحُ السُّنہ'' کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک ان تمام احکامِ شریعت' حدود و قیود اور اوامر و نواہی کو دلی آمادگی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاتا جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن و سُنّت کے ذریعے سے پیش فرمائے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی خواہشات کو کچلتے ہوئے قرآن و سنت پر عمل کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا تب تک ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن و سنت کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا ایمان بالرسالت کی شرطِ لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہوگا۔ مثلاً سورۃ آل عمران (آیت ۳۲) میں ارشاد ہوا: ﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ ج﴾ اسی طرح سورۃ التغابن (آیت ۱۲) میں فرمایا گیا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ج﴾ یعنی ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔'' جب محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ مان لیا ہے تو اب تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ تمہیں ان کا ہر حکم ماننا پڑے گا اور ہر ارشاد کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ جس رسول کو بھی بھیجتا ہے اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے

---

(۱) رواہ فی شرح السُّنۃ' وقال النووی فی اربعینہ : ھذا حدیث حسن صحیح ' رویناہ فی کتاب الحجۃ باسناد صحیح۔

کہ اس کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ سورۃ النساء (آیت ۶۴) میں فرمایا: ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا: ﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (آیت ۸۰) ''جس شخص نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کے لیے ہمارے پاس خود نہیں آتا' اس نے اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لیے انبیاء و رسل کو واسطہ بنایا ہے' لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسولؐ کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا کہ:

((مَنۡ اَطَاعَنِیۡ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنۡ عَصَانِیۡ فَقَدۡ عَصَی اللّٰهَ)) (۱)

''جس نے میری اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی تو اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے لزوم کے لیے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔ فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِيۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ۝۶۵﴾

''پس نہیں' آپ کے ربّ کی قسم! یہ لوگ مؤمن نہیں ہوں گے جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حَکم نہ مانیں' پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں۔''

یہ آیتِ مبارکہ حضور ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے نصِ قطعی ہے۔ رسول محض مان لینے کے لیے نہیں بھیجا جاتا' بلکہ وہ اس لیے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے' اس کے تمام فیصلے تسلیم کیے جائیں' اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے'

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد' باب قول الله تعالیٰ: اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم...... وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة...... عن ابی هریرة رضی الله عنه

اس کی سنت کی پیروی کی جائے اور اس کے نقش قدم کو راہنما بنایا جائے۔ حضور ﷺ کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں' بلکہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے لازمی عملی نتیجے کے طور پر آپؐ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس اطاعتِ کُلّی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا' لیکن یہ حقیقی ایمان کے اعتبار سے خدا کے ہاں معتبر نہیں ہوگا۔

محبت

نبی اکرم ﷺ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کا دوسرا لازمی نتیجہ آپؐ سے محبت ہے۔ صرف زبردستی' مجبوری اور مارے باندھے کی اطاعت تو کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جاسکتی ہے' بلکہ کی جاتی ہے' لیکن جب یہ اطاعت رسول اللہ ﷺ کے لیے مطلوب ہو تو پھر زبردستی کی اطاعت نہیں' بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو انتہائی گہری محبت' دل کی پوری آمادگی اور پورے انبساطِ قلب اور شرح صدر کے ساتھ ہو' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ اس ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (۱)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے لیے اس کے باپ' اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔''

یعنی اگر ایک مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزّہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مؤمن نہیں۔ حدیثِ مبارک کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے' بلکہ بڑے واضح الفاظ میں صاف صاف اور دوٹوک

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حبّ الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ اکثر من الاھل والولد والوالد والناس اجمعین...... عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

انداز میں ایسے شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو درحقیقت آپؐ پر صحیح معنوں میں وہ ایمان ہی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اس کی عدالت سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔

اس ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے سوال کیا: ''عمرؓ! تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟'' ذرا اندازہ لگایئے کہ اس گفتگو سے کس قدر اپنائیت کا احساس اُبھرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مابین کس قدر قلبی و ذہنی قرب موجود تھا۔ سوال کا انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ سوال اس ہستی سے کیا جا سکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلّم ہو۔ حضرت عمرؓ نے جواباً عرض کیا کہ ''حضور! آپؐ مجھے دنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں''۔ حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: ''اور خود اپنی جان سے بھی؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا: ''اَلْآنَ'' یعنی ہاں حضور! اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سوال کا جواب سوچ سمجھ کر، اپنا جائزہ لے کر اور اپنے دل کے اندر جھانک کر دیا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعوائے محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں، اِلّا ماشاء اللہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں، اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو''۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب وہ صحیح تعلق پیدا ہوا جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اِتباع

دل کی حقیقی محبت، طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم ہی کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو، بلکہ وہ اس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لیے باعثِ سعادت

سمجھتا ہے اور اس کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند' ان کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے' ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے' چلتے کس طرح ہیں' وہ لباس کون سا پہنتے ہیں' انہیں کھانے میں کیا چیز مرغوب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں خواہ کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو' لیکن جس کے دل میں کسی کی حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے' جو کسی کا والہ و شیفتہ ہو جائے' اس کے لیے وہ احکام جو الفاظ میں دیے گئے ہوں' زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں یا وہ کام جن کے کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہو اُن کا تو کہنا ہی کیا' وہ تو ہیں ہی واجب التعمیل' ایسے شخص کے لیے تو چشم و ابرو کا اشارہ بھی حکمِ قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ محبوب کی ہر ہر ادا کی نقالی اور اس کے ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

اس طرزِ عمل کا نام ''اتباع'' ہے جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بہت سے واقعات مرقوم ہیں جن سے ان کے جذبۂ اتباع کا پتا چلتا ہے۔ وہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے' اتفاق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا' لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لیے لازم کر لیا کہ جب بھی ان کا اس راستے سے گزر ہوتا تو وہ اس درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ سفر جہاں جہاں پڑاؤ کیا' جہاں جہاں استراحت فرمائی اور جہاں حوائج ضروریہ سے فراغت پائی' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے سفرِ حج میں انہی مقامات پر پڑاؤ' استراحت اور رفعِ حاجت کا التزام کیا۔ حالانکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اور شریعت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اعمال واجب التعمیل بھی نہیں تھے' بلکہ خالص عقلیت پسند (rationalist) لوگ تو شاید اس کو جنون اور خواہ مخواہ کا fanaticism کہیں' لیکن یہ معاملہ عشق و محبت کا معاملہ ہے جس میں محبوب

کے ہر نقشِ قدم کی پیروی دستورِ محبت شمار ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنا فی حُبِّ الرسول ﷺ ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویہ یہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح سِیَرِ صحابہؓ میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے جو کسی دُور دراز علاقے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو بس اسی ایک موقع پر دیکھا تھا اور اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ کا گریبان کھلا تھا۔ آپ ﷺ کو کھلے گریبان کے ساتھ دیکھ کر ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے' اس لیے کہ انہوں نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اسی حال میں دیکھا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کی طرف سے انہیں ایسا کوئی حکم تو کجا' کسی ادنیٰ درجے میں اشارہ تک نہیں کیا گیا' اور شریعت کی رو سے یہ نہ فرض ہے نہ واجب' لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کے ہر نقش قدم کی پیروی اور ہر ادا کی نقالی اپنے اوپر لازم کر لی جائے۔ اسی طرزِ عمل کا نام قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اتباع ہے۔

اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۱ کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱﴾

''(اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو' (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دے گا' اور اللہ بہت معاف کرنے والا (اور) بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم ﷺ کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں ان کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ہم اب تک کی گفتگو کے اہم

نکات کا اعادہ کرلیں اور اس کے لُبِ لُباب کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اوّلین اور اہم ترین بنیاد آپ ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ اس ایمان کا زبانی اقرار بھی ضروری ہے اور قلبی یقین بھی۔ پھر ایمان کا اوّلین تقاضا آنحضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا کماحقہٗ ادب و احترام ہے۔ آپؐ پر ایمان اور آپؐ کی توقیر و تعظیم کے دو ناگزیر لوازم ہیں۔ ایک اطاعتِ کُلّی اور دوسرے محبتِ قلبی جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اور جب یہ دونوں جمع ہوں گی تو اس کا نام ''اتباع'' ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبی اکرم ﷺ کا اتباع اپنے اوپر لازم کرلو اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبت کرے گا' تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرمادے گا۔

انتباہ

یہاں پر اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے ان دونوں ناگزیر لوازم میں سے اگر ایک بھی غائب ہو تو اس ادھورے طرزِ عمل سے آخرت میں نجات کی توقع ایک امیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر نبی اکرم ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے' لیکن محبت نہیں ہے' اطاعت میں دلی آمادگی نہیں ہے' يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کی کیفیت نہیں ہے' دل میں تنگی اور اپراہٹ ہے' تو اس طرزِ عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دَور کے منافقین بھی ایمان لانے کے مدعی تھے اور وہ آپؐ کی اطاعت بھی کرتے تھے' لیکن یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعتِ رسول ﷺ تو درکنار رسول اللہ ﷺ کے احکام کا استہزاء کریں' جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا مذاق اڑائیں' ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں' سنت رسول ﷺ کے التزام سے انکار کریں اور اسلام کے نظامِ زندگی کو آج کے دَور کے لیے ناقابلِ عمل قرار دیں' لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اُس معاشرے کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں

شمار کرانا تھا اور خود کو مسلمان کہلاتا تھا اس کے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ اس پر مجبور تھا کہ نماز پڑھے‘ شعائرِ دین کا احترام کرے اور فرائض دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے جتن کرتے تھے‘ بلکہ قسمیں کھا کھا کر حضور ﷺ کو اپنے صادق و مخلص ہونے کا یقین دلاتے تھے‘ لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی‘ وہ تھی یقینِ قلبی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حضور ﷺ سے حقیقی و واقعی محبت۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون میں فیصلہ فرما دیا کہ:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①﴾

”(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشبہ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں۔“

یعنی ان کی یہ بات تو اپنی جگہ سچی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں‘ لیکن چونکہ یہ دل سے آپؐ کی رسالت کے قائل نہیں‘ ان کے دلوں میں آپؐ کی حقیقی محبت موجود نہیں‘ صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں‘ ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور‘ اس لیے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قلبی یقین اور محبت کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہو تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ محبتِ رسول ﷺ کے محض دعوے ہیں‘ لیکن اطاعت نہیں‘ فرائض کی ادائیگی نہیں‘ اوامر و نواہی کی پرواہ نہیں‘ احکامِ شریعت کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں‘ تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت اور فسق و فجور پر مبنی ہے۔ محبت کا یہ خالی خولی دعویٰ اللہ کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہوگا۔ ایسا دعویٰ تو اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہو سکتا‘ بلکہ مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ کسی بیٹے کو والد کی محبت کا دعویٰ ہو‘ لیکن وہ ان کا کہنا نہ مانتا ہو‘ بلکہ ہر عمل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیتا ہو تو معقول بات

یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعوائے محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عشقِ رسول ﷺ اور محبتِ رسول ﷺ کے بلند بانگ دعاوی' بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام' بڑے جوش و خروش اور شان و شوکت سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالسِ سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی اور پیرویٔ سنت کے جذبہ سے عاری ہیں تو یہ سب کچھ سراپا ڈھونگ ہے' فریبِ نفس ہے' اس کی کوئی حقیقت نہیں' میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں' اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں' بلکہ یہ سب قابلِ مؤاخذہ ہیں۔

③ نصرتِ رسول ﷺ

آیت زیر مطالعہ میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد ''وَنَصَرُوْهُ'' کے لفظ میں بیان ہوئی ہے' یعنی ''جن لوگوں نے آپ (ﷺ) کی مدد اور حمایت کی۔'' اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بات طے کرنی چاہیے کہ رسول ﷺ کی نصرت و حمایت اور ان کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ نبوت و رسالت ایک فریضۂ منصبی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رُسل کو تفویض کیا جاتا ہے۔ یعنی بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھانا' نیند کے ماتوں کو جگانا' انسان کو شرک کے اندھیاروں میں سے نکال کر توحید کے روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا' اسے اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کا خوگر بنانا' انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا' معاشرے میں سے ہر قسم کے جور و استبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا' اور انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک و آقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لیے کھڑا ہونا ہوگا' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥﴾ (المطففین) اور ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ⑲﴾ (الانفطار) یعنی جس روز لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور جس روز کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا' کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا اور جس دن تکوینی حاکمیت کے

ساتھ اللہ تعالیٰ تشریعی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ جس روز انسان کی اِس دنیا کی کمائی اور سعی و جُہد کا نتیجہ اس کے سامنے ہوگا۔ بُرے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا' اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیشِ نظر اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾ (النّٰزعٰت)

''جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا' اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی۔ تو جس نے سرکشی کی تھی' اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی' تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔ اور جس نے اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی!''

تبلیغ کا بارِ گراں

دعوت و تبلیغ کا کٹھن کام' شرک کے اندھیروں کو دور کر کے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری' بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام' طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور اقامتِ دین کے جان جوکھوں کے یہ مراحل طے کرنا' یہ تھا وہ بارِ گراں جو نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر آیا تھا۔ اس بارِ گراں کی خبر حضور ﷺ کو نبوت کے آغاز ہی میں دے دی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ المزمل میں فرما دیا گیا تھا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿٥﴾﴾ یعنی ''ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے (ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے)'' اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند ہی دنوں بعد آنحضور ﷺ کے شانوں پر رکھ دیا گیا' چنانچہ سورۃ المدثر میں حکم آ گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا

الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَأَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③﴾ یعنی ''اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو' ان کو ہوشیار کرو' ان کو باطل عقائد اور غلط اعمال کے انجامِ بد سے ڈراؤ) اور اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کرو۔''

سورۃ المدثر کی تیسری آیت میں نبی اکرم ﷺ کو ''تکبیرِ ربّ'' کا حکم دیا گیا ہے' جس کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور اللہ کی بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں' بلکہ فی الواقع وہ نظام قائم اور برپا کر دینا ہے جس میں تشریعی حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاکمِ اعلیٰ اور مقتدرِ مطلق (Absolute Sovereign) تسلیم کیا جائے' اسی کا حکم حرفِ آخر ہو' اسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو' اسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلندتر ہو جائے اور اسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے۔ بمصداق الفاظِ قرآنی: ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ (التوبۃ: ۴۰) ''اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے''۔ کبریائی تو واقعتاً وہ کبریائی ہے جو عملاً قائم ہو' محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں اور محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی' بلکہ بڑائی اور کبریائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی تسلیم کیا گیا ہو۔ چنانچہ ''تکبیرِ ربّ'' کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے احکام' اس کی ہدایات اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو' اس کا عطا کردہ آئین اور اس کے نازل کردہ قوانین عملاً نافذ ہوں' اور اس طرح اسے حقیقی طور پر مقتدر تسلیم کیا گیا ہو۔

دعوت و تبلیغ کی غایتِ اولیٰ

مدنی دَور میں اس بات کو مزید واضح کر دیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں' لہٰذا دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ اظہارِ دینِ حق اور غلبۂ دینِ متین بھی نہ صرف آپؐ کے فرائضِ رسالت میں شامل ہے' بلکہ آپ ﷺ کی بعثت کی غایتِ اولیٰ ہے۔ چونکہ تا قیامِ قیامت کوئی اور رسول یا نبی آنے والا نہیں' لہٰذا بنی نوعِ انسان پر اتمامِ

حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی آخری کتاب اور مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا وہاں یہ بھی ضروری قرار دیا کہ دینِ حق بتمام وکمال قائم بھی ہو تا کہ انسان کے لیے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ یہ مضمون مدنی دَور کی تین سورتوں' سورۃ التوبہ (آیت ۳۳) سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصف (آیت ۹) میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا:

﴿هُوَ الَّذِىٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) دے کر تا کہ وہ اِس (ہدایت اور دینِ حق) کو پورے کے پورے دین (نظامِ حیات) پر غالب کر دے۔''

تو یہ تھا وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم ﷺ کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور ظہورِ نبوت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ آپؐ اس وقت پورے عالمِ انسانی میں اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل یکہ وتنہا تھے۔ دنیا کے بُت کدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا' تکبیرِ ربّ کا نعرہ لگانا' خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا' اظہار وغلبۂ دین کے لیے کشمکش کرنا' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا' اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا عَلَم بلند کرنا اور ظلم وتعدّی' جور وستم اور استبداد واستحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا' اسی لیے اسے ''قولِ ثقیل'' سے تعبیر کیا گیا۔ تکبیرِ ربّ کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرے سے اعلانِ جنگ تھا اور حضور ﷺ کو حکم تھا کہ ﴿قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۝۳﴾ (المدثر) یعنی ''کھڑے ہو جاؤ' پس (بنی نوعِ انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو!'' آپؐ سے فرمایا گیا کہ آپ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی فرماتے رہیں اور ''وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ'' اور ''وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ۝'' کے مصداق چاہے مشرکوں اور کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی ہو وہ کتنا ہی راستہ روکیں اور مزاحمت کریں' وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرے میں پڑ گئی ہوں' وہ

چاہے کتنی مخالفتیں کریں‘ کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں‘ ظلم وتشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں اور جور وتعدی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں‘ ان تمام مخالفتوں‘ مظالم اور استبداد کے علی الرغم‘ ان تمام موانع کے باوجود اور ان تمام شدائد ومصائب کے باوصف نبی اکرم‘ سرورِ عالم‘ محبوبِ خدا‘ رحمۃ للعالمین‘ خاتم الانبیاء والمرسلین محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا کہ تکبیرِ ربّ کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں‘ باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوں اور اس راستے میں ہر نوع کے شدائد و مصائب اور ہر طرح کے طنز واستہزاء اور طعن وتشنیع کے وار برداشت کریں۔ یہ وہ بھاری بوجھ اور بھاری ذمہ داری تھی جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی۔

آنحضور ﷺ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری

نبی اکرم ﷺ کے فرضِ منصبی کے ادراک سے نصرتِ رسول ﷺ کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو شخص آنحضور ﷺ پر ایمان لائے اور اس کا دل اس بات کی تصدیق کرے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں‘ اس کے لیے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت ونبوت کی ادائیگی میں آپ ﷺ کا رفیق وناصر بنے۔ اب اسے تکبیرِ ربّ کی کٹھن مہم میں‘ اقامتِ دین اور غلبۂ دین کی جاں گسل جدوجہد میں‘ دعوت وتبلیغ کے راہِ خارزار میں‘ حق و باطل کے معرکۂ کارزار میں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدانِ جنگ وجدال میں رسول اللہ ﷺ کا دست وبازو اور آپؐ کا حامی ومددگار بننا ہوگا۔ جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرے وہاں وہ اپنا خون بہانے کو اپنے لیے باعثِ فخر وسعادت سمجھے‘ اسے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقدِ جان کی نذر گزارنے میں فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی کا یقین ہو‘ اس کا جینا اور مرنا حضور ﷺ کی دعوت کی تبلیغ واشاعت کے لیے ہو‘ اس کا مال ومنال اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دینِ حق کے غلبے کے لیے وقف ہوں جو خالقِ کائنات اور ربّ العالمین کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا۔ اگر حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ

وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ (الانعام) نہ ہو تو ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا دعویٰ غیر معتبر ہے' اور مغالطے اور فریبِ نفس پر مبنی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول ﷺ ہے۔

لفظِ نصرت سے کسی کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ اللہ کے نبی اور رسول علیہ الصلاۃ والسلام کو کسی انسان کی مدد کی کیا حاجت؟ نبیؐ کا مقام و مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود اُن کا مولا اور ناصر ہوتا ہے' پھر اللہ کے فرشتے نبیؐ کے پشت پناہ ہوتے ہیں' اور نبیؐ کو تو روح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے' لہٰذا نبیؐ کو اہلِ ایمان کی مدد و حمایت کی کیا ضرورت؟ پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس عالمِ اسباب میں دینِ حق کے غلبے کی جِدّوجُہد انسانوں ہی کو کرنی ہے' جن کو زمین میں اللہ کے خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے انبیاء و رُسل کو دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق و انفس میں اللہ کی آیات انبیاء و رُسل کی دعوت کے قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ ان کی صداقت کے ثبوت کے لیے ان پر آسمانی کتابوں کا نزول بھی ہوتا ہے جو واضح اور روشن آیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو حسّی معجزات سے بھی سرفراز فرماتا ہے' لیکن حق کو قبول یا ردّ کرنے کے فیصلہ کے لیے وہ انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾﴾ (الدھر) یعنی ''ہم نے تو انسان کو سیدھی راہ بجھا دی ہے' اب وہ حق کو تسلیم کرے یا ناشکری کرے!'' بہرحال اقامتِ دین' شہادتِ حق اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت و تبلیغ کا داعیٔ اوّل ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے دنیا کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾﴾

''اے نبی (ﷺ!) ہم نے آپ کو گواہی دینے والا' بشارت دینے والا اور

خبردار کرنے والا' اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔''

امتحان اور آزمائش

پھر جو لوگ نبی علیہ الصّلاۃ والسلام کی دعوت قبول کریں اور اس پر ایمان لائیں' اللہ تعالیٰ عزّوجل اس عالمِ اسباب میں ان کو جانچتا ہے' ان کا امتحان لیتا ہے۔ چنانچہ اس عالمِ علت ومعلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر' رسولؐ پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مؤمنین صادقین کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں' ان کے ایثار وقربانی اور ان کی جدوجہد سے پھیلے گا۔ دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہو گی تو ان ہی کی کشاکش' محنت اور جہاد وقتال سے قائم ہو گی۔ وہ خاک وخون میں لوٹیں گے اور راہِ حق میں نقدِ جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائید ونصرت سے اللہ کا دین غالب ہو گا۔ یہی سنت اللہ ہے' اور اللہ کو ایسے ہی جوانمردوں سے محبت ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

''یقیناً اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

اور انہی سرفروشوں کے بارے میں شاعر نے کہا ہے: ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی جدوجہد اور کشمکش میں مؤمنینِ صادقین کی آزمائش ہے۔ اسی سے معلوم ہو گا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے اور کون ایمان کا جھوٹا دعوے دار ہے۔ اس جہاد وقتال کے ذریعے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل میں سردھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نصرتِ رسول ﷺ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول ﷺ ہی وہ کسوٹی ہے جس پر عالمِ رنگ و

بو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں' جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱﴾ ''اور اللہ تعالیٰ لازماً ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور لازماً ظاہر کر دے گا ان کو بھی جو منافق ہیں''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مؤمن بنے پھرتے ہیں' جو حقیقتِ واقعی کے لحاظ سے منافق ہیں۔ اس دنیا میں ایمان و نفاق کا فیصلہ انہی آزمائشوں' ان ہی سرفروشیوں اور ان ہی جانفشانیوں سے ہوتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا؟ آپ ﷺ کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا؟ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے منصبِ رسالت کی تکمیل میں اپنا جان و مال کھپایا یا نہیں کھپایا؟ دعوت الی اللہ کے مراحل میں صبر و استقامت دکھائی یا نہیں دکھائی؟ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں' پھر تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ ناقابلِ قبول ٹھہرے گا' رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ بھی مسترد کر دیا جائے گا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا دعویٰ بھی غیر معتبر اور محض ریا اور دکھاوا قرار پائے گا۔

دروں بینی کی ضرورت

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ذرا چشمِ تصور میں غزوۂ اُحد کا نقشہ لایئے کہ محبوبِ خدا' سرورِ عالم' محمدٌ رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں مشرکین کے سامنے سینہ سپر ہیں' آپ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس معرکۂ کارزار میں جان کی بازی لگا رہے ہیں' اس کشمکش میں رحمۃٌ للعالمین زخمی ہو گئے ہیں' خود کی کڑیاں سر مبارک میں گھس گئی ہیں' رخسار مبارک بھی مجروح ہو گیا ہے' دندانِ مبارک بھی شہید ہو چکے ہیں' آپؐ کا مقدس خون راہِ حق میں بہہ رہا ہے...... اور فرض کیجیے کہ عین اُس وقت کوئی مدعیٔ عشقِ رسول ﷺ کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو' آنحضور ﷺ پر سلام پڑھ رہا ہو یا آپ ﷺ کی شان میں نعتیں پڑھے جا رہا ہو' تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہو گی! اس طرزِ عمل کا ایمان بالرسولؐ اور محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ کیا نسبت و تعلق؟ تو یہ طرزِ عمل کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ تو کارزارِ اُحد میں' جہاں پر ہر چہار طرف موت کا رقص ہو رہا ہو' اپنے

جاں نثاروں کے ساتھ اپنے خون سے ایک نئی تاریخ رقم فرما رہے ہوں اور اللہ کے جھنڈے کو سربلند کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشقِ رسولؐ کہیں کسی گوشے میں بیٹھا درود و سلام پڑھ رہا ہو' جس قدر مضحکہ خیز اُس وقت ہوتا اسی قدر مضحکہ خیز آج بھی ہے۔ اس لیے کہ آنحضورﷺ کا مشن مردہ نہیں ہوا' زندہ و تابندہ ہے اور تاقیامت زندہ رہے گا۔

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت ہے اور آپ ﷺ کے بعد یہ فریضہ رسالت اُمتِ مسلمہ کو بحیثیتِ اُمت ادا کرنا ہے۔ بنی نوعِ انسان آج بھی ہدایتِ ربانی کی محتاج ہے۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے۔ آج بھی ہر اُس شخص پر جو خود کو مسلمان سمجھتا ہے' یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ آنحضورﷺ کی بعثت صرف اہلِ عرب کے لیے نہ تھی' بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے تھی۔ آنحضورﷺ کی بعثت ایک مخصوص زمانے اور وقت کے لیے نہ تھی بلکہ قیامِ قیامت تک کے لیے تھی۔ توحید کی دعوت دینا' شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ......﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق اس آیت کی کامل شان کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اس کا ظہور اُس وقت تک نہ ہو گا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اُسی طرح اللہ کے دین کا جھنڈا نہیں لہراتا اور ادیانِ باطلہ کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے جس طرح محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے تیئیس سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور وہاں پہلے سے قائم طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ چنانچہ جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے' نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پس اب اس مدعیٔ ایمان‘ اس عاشقِ رسولؐ اور اس محبِّ رسولؐ کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر اپنا جائزہ لینا چاہیے جسے حضورﷺ کے مقصدِ بعثت اور آپؐ کے مشن سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسے خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے۔ آج عملاً یہ صورت حال رونما ہو چکی ہے کہ بقولِ حالی: ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

نبی اکرمﷺ کی مستقبل کے بارے میں فہمائشیں

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی آنحضورﷺ نے خبر دی تھی۔ صحیح مسلمؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) (۱)

”اسلام کی ابتدا غربت (اجنبیت) کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ جائے گا۔ تو بشارت ہے ”غرباء“ کے لیے۔“

اردو میں غریب کے معنی مفلس و نادار کے ہوتے ہیں‘ لیکن عربی میں یہ لفظ ”اجنبی“ کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ جیسے ایک اجنبی مسافر اپنے اہل و عیال اور اپنے وطن سے دور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے‘ اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں اجنبی اور تنہا تھا‘ یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ پھر غریب یعنی اجنبی ہو جائے گا۔ کفار‘ ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہو گی‘ اگرچہ نام کے مسلمان کثیر التعداد ہوں گے لیکن سچے‘ موحد‘ دین دار اور متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو ان قلیل ’غرباء‘ کے لیے (بہشت کی) بشارت اور مبارک باد ہے۔ مسند احمدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضورﷺ نے ”غرباء“ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

((اُنَاسٌ صَالِحُوْنَ فِيْ اُنَاسِ سُوْءٍ كَثِيْرٍ مَنْ يَعْصِيْهِمْ اَكْثَرُ مِمَّنْ يُطِيْعُهُمْ))

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان ان الاسلام بدأ غریباً وسیعود غریباً......

''برے لوگوں کی کثیر تعداد میں وہ نیک لوگ (غرباء) ہیں کہ جن کی بات ماننے والے کم ہوں اور نافرمانی کرنے والے زیادہ ہوں۔''

ایک اور روایت میں حضورﷺ نے خبر دی کہ:

((لَا يَبْقٰى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهٗ)) (۱)

''اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ نہ بچے گا۔''

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ روئے زمین پر اسلام کہیں فی الواقع قائم نظر نہیں آئے گا۔ انسانوں کے کردار اور ان کی شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کارفرما دیکھنے کے لیے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ اس کی تلاوت صرف رسماً اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لیے باقی رہ جائے گی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورتِ حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر اِن احادیثِ مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورتِ حال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اسے حضورﷺ سے محبت ہے' اگر اسے حضورﷺ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے' اگر وہ سمجھتا ہے کہ حضورﷺ کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو کیا اس کا مقصودِ حیات اور نصب العین بھی وہی ہے یا نہیں جو محمدٌ رسول اللہﷺ کا مقصدِ بعثت تھا؟ یعنی اعلاءِ کلمۃ اللہ' اظہارُ دینِ الحقِّ علی الدّین کُلِّہ اور تکبیرِ ربّ! اگر ہم میں سے کسی کے مقاصدِ زندگی میں اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم شامل نہیں' اور اگر وہ آنحضورﷺ کے مشن کی تکمیل میں آپﷺ کا دست و بازو اور آپؐ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا آنحضورﷺ سے تعلق درست نہیں' جس کی اسے فکر کرنی چاہیے۔ تو یہ ہے نبی اکرمﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو ''وَنَصَرُوْهُ'' کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ان الاسلام بدأ غریباً وسیعود غریباً......

اِتباع کا تقاضا

''نصرتِ رسول ﷺ'' کی مزید وضاحت ''اتباعِ رسول ﷺ'' کے حوالے سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' اتباع کے معنی ہیں آنحضور ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنا اور آپ ﷺ کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے' پیہم و مسلسل ہوا ہے' جو پورے تیئیس برس تک شب و روز ہوا ہے' جس میں ایک لمحے اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں' وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں' کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا؟ ان سب کے لیے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے' جس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں' اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اوّل یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دُنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم' مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے' جلوت و خلوت میں کیا ہے' وہ عمل دعوت و تبلیغ کا عمل ہے' وہ تکبیرِ ربّ کی سعی و جہد ہے' وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ہے' وہ دینِ حق کے سربلند کرنے کی تگ و دَو ہے' وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ اور تصادم ہے۔ اس سعی و جہد اور مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں' صورتوں میں تبدیلی آئی ہے' بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں۔ کہیں مکی دَور میں یہ جدوجہد دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجے میں تھی' جس میں آپؐ کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دَور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر و اُحد اور احزاب و تبوک کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی' کہیں قبائل عرب اور قرب و جوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعے دعوت دینے کے مراحل میں تھی اور کہیں صلح حدیبیہ' فتح مکہ اور غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن آپؐ کا جو عمل تیئیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے'

ہر لمحہ' ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جا رہا ہے' وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبعِ رسول ﷺ ہونے کا مدعی ہو' جو یہ سمجھتا ہو کہ سنتِ رسول ﷺ کا التزام ضروری ہے' اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی' سب سے زیادہ متواتر' متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت و تبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

رسولؐ کی نصرت اللہ کی نصرت ہے

نصرتِ رسولؐ کے حوالے سے قرآنِ مجید کا ایک اہم مقام سورۃ الصّف کی آخری آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؑ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا: ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ط﴾ یعنی ''اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟'' تکبیرِ ربّ' دعوتِ توحید' تبلیغِ دین اور نورِ ہدایت سے دنیا کو منور کرنے کا جو کام میرے سپرد ہوا ہے اس کی جدوجہد میں اب کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو اس راہ میں میرا دست و بازو بنے؟ آنحضرتؑ کے حواریوں کے جواب کو قرآن مجید یوں نقل فرماتا ہے: ﴿قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ یعنی ''حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار''۔ حضرت مسیحؑ کے سوال اور حواریوں کے جواب کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا تھا: ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ط﴾ جواب دیا گیا: ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت یہ ہے کہ رسولؐ کی نصرت اللہ ہی کی نصرت ہے اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسولؐ کا حامی' مددگار اور دست و بازو بنتا ہے' اس راہ میں جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنا جان و مال کھپاتا ہے' وہ اللہ کے رسولؐ کی نصرت بھی کر رہا ہے اور اللہ کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ چنانچہ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے رسولؐ دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔

④ اِتّباعِ قرآنِ مجید

اب اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد کا ذکر ہے اور وہ ہے نورِ قرآن مجید کو حرزِ جان بنانا' اسے اپنا راہنما قرار دینا اور اس کا اتباع کرنا۔ فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ ''اور اتباع کیا اُس نور کا جو اُن (ﷺ) کے ساتھ (یا ان پر) نازل کیا گیا۔'' یہاں نور سے مراد قرآن ہے' یہ وہ نورِ ہدایت ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا' اس کا اتباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں' یعنی ''اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ'' تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اس چوتھی بات کا اضافہ کس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے کہ ''وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ!'' یہ اس لیے ضروری تھا کہ نبی اکرم ﷺ بہر حال اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک معین مدت تک کے لیے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آنحضور ﷺ کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی۔ آنحضور ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابدالآباد تک کے لیے جس چیز کو محمد رسول اللہ ﷺ کا جانشین اور قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے' جو فرقانِ حمید بھی ہے اور کتابِ مبین بھی۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا' گویا آپ ﷺ کے ساتھ اُترا۔ اور یہ وہ نور ہے جو دائم و قائم ہے۔ بقول اقبال: ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں   زندہ و پائندہ و گویاست ایں!

چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے جو آخری بات فرمائی وہ اسی قرآن مجید کے بارے میں تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ کِتَابُ اللّٰهِ)) (۱)

''اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سرِ رشتہ اگر تم

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے' وہ چیز ہے کتاب اللہ۔''

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں گفتگو سے قبل مناسب ہو گا کہ ہم اس ارشادِ گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آپ کشمکشِ حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پورے خطبے میں موجود ہے' بلکہ خطبے کے آغاز ہی میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

((اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ وَاللّٰہِ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَلْقَاکُمْ بَعْدَ یَوْمِیْ ھٰذَا بِمَکَانِیْ ھٰذَا' فَرَحِمَ اللّٰہُ مَنْ سَمِعَ مَقَالَتِیَ الْیَوْمَ فَوَعَاھَا......)) (۱)

''لوگو! اللہ کی قسم' میں نہیں جانتا' شاید آج کے بعد میں تم سے اس مقام پر دوبارہ نہ مل سکوں۔ پس اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے آج میری باتوں کو سنا اور ان کو یاد رکھا......''

چنانچہ اس خطبہ میں آنحضور ﷺ کے ارشادات کا انداز وصیت کا سا ہے' یعنی اُمت کو ان اُمور کی تاکید و تلقین جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے یہ بات تاکیداً ارشاد فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا' اسے حرزِ جان بنانا' اس کے دامن سے وابستہ رہنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لیے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں' اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جا رہا ہوں جو تمہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

حبلُ اللہ

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمودات کی رُو سے قرآن مجید ہی وہ ''حبل اللہ'' ہے جس کے ساتھ چمٹ جانے اور وابستہ ہو جانے کا سورۂ آلِ عمران میں

(۱) سنن الدارمی' المقدمۃ' باب الاقتداء بالعلماء۔

حکم آیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا حکم سورۃ الحج میں وارد ہوا ہے جس کی آخری آیت میں فرمایا گیا: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ﴾ ''اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ''۔ اس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ سے کیسے چمٹیں' اس کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؟ سورۂ آل عمران میں اس کو مزید کھولا گیا: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو''۔ اللہ کی رسّی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اس وضاحت کے باوجود یہ سوال باقی رہا کہ پھر حبل اللہ سے کیا مراد ہے؟ کیسے تھامیں؟ کس سے جُڑیں؟ اس کی شرح و توضیح نبی اکرم ﷺ نے فرمادی اور وحی غیر متلو کے ذریعے اُمت کو مطلع فرمادیا کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسّی ہے جس سے اعتصام کا' جس کے ساتھ چمٹ جانے اور جڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم سورۂ آل عمران میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک نہایت جامع حدیث میں جس کے راوی حضرت علی ؓ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت و شوکت' اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی اہمیت کا بیان مفصل انداز میں ہوا ہے' نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((هُوَ حَبۡلُ اللّٰهِ الۡمَتِيۡنُ)) یعنی ''یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔'' اسی طویل حدیث میں قرآنِ حکیم کی شان میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی لائقِ توجہ ہیں کہ ''قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے' نہ کثرت اور تکرارِ تلاوت سے اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے''۔ یعنی اس کے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا' اور اس کان سے حکمت و معارف کے نئے نئے موتی اور جواہرات برآمد ہوتے رہیں گے۔ (یہ حدیث سنن ترمذی اور سنن دارمی میں روایت ہوئی ہے۔)

ہماری حالتِ زار

نبی اکرم ﷺ نے تو خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تاابد گمراہ نہیں ہوگے' لیکن بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے ساتھ پورے طور پر وابستہ ہو جانے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت قرار پایا تو ظاہر بات ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی کی

صورت ہی میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں‘ آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا‘ اسی کو حقیقی معنوں میں اپنا ہادی و راہنما سمجھا‘ اپنے عمل‘ اخلاق اور معاملات کو اسی کے مطابق استوار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی‘ ہر سطح پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا‘ دنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں لہراتا رہا‘ لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا اور نور و حکمت کے اس خزینہ سے بے تعلق ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان پر زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے اور وہ بتدریج فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور نتیجتاً مغلوب و مقہور ہو گئے۔ ان کے عقائد خراب ہوئے‘ اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو دراندازی کا موقع ملا۔ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور بجائے اس کے کہ وہ بنیانِ مرصوص بنتے‘ بے شمار فرقوں اور قومی و نسلی اور لسانی و جغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہیے آج اسے ہم ترک کر چکے ہیں۔ ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں رہا کہ ہم اسے محض حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اگر اس کی تلاوت کرتے بھی ہیں تو اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے نہیں‘ بلکہ محض حصولِ ثواب کے لیے! بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا‘ اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لیے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ گویا اپنے لیے بھی اب ہم تلاوتِ قرآن کے ذریعے حصولِ ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے‘ بلکہ اب تو قرآنِ مجید ہمارے نزدیک صرف مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے!! بقول اقبال: ؎

با یاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ﴿۳۰﴾﴾ ”اور کہا رسولؐ

نے کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا (نظر انداز کر دیا تھا)''۔ اگرچہ سیاق و سباق کے لحاظ سے اس آیت میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز تھی ہی نہیں اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحیٔ ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے' تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدمِ توجہ والتفات کی روش اختیار کریں' یعنی جو نہ اس کی تلاوت کو اپنے معمولات میں شامل کرتے ہوں' نہ اسے اپنے غور و فکر کا موضوع بناتے ہوں اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنانے پر آمادہ ہوں۔ یہاں آیت زیرِ نظر ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ میں ''اتباع'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ ہر حکم' ہر ہدایت' ہر امر اور ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن حکیم کے ساتھ اگر اس نوع کا تعلق ہوگا تو ہم نہ صرف یہ کہ گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے' بلکہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہماری نسبت بھی صحیح بنیادوں پر استوار رہ سکے گی!...... یہاں یہ بات اب بالکل واضح ہوگئی کہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا' اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی' حَکم اور راہنما قرار دینا' اس کی تعلیمات پر عمل کرنا' اس کی صبح و شام تلاوت کرنا' اس میں تدبر اور غور و فکر کرنا' اس کو حرزِ جان بنانا' اس کا اتباع کرنا' یہ ہے نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ گویا اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمد ﷺ سے جڑ گئے اور اس سے کٹے تو محمد ﷺ سے کٹ گئے۔

اصلاحِ حال کا واحد طریق

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے' اس ضمن میں یہ حدیث شریف نہایت جامع ہے' جو حضرت عبیدہ ملیکی ؓ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) [1]

---

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنا لو' بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگِ عالم میں) پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو' اور اس میں تدبر اور غور و فکر کیا کرو' تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

اس حدیث مبارک میں مسلمانوں کو حضور ﷺ نے اہلِ قرآن کا خطاب دیا ہے:

''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ''۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اُس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے ''یَا اَھْلَ الْکِتَابِ''۔ الکتاب کا آخری' مکمل اور جامع ایڈیشن ''القرآن'' ہے' جس کی حامل اُمتِ مسلمہ ہے' اسی مناسبت سے آنحضور ﷺ نے اُمت کو ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ سبحان اللہ' کتنا پیارا خطاب ہے جو اِس اُمت کو ملا۔ میں اس سے قبل بھی کسی موقع پر یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے ''اہلِ قرآن'' کا عنوان اختیار کیا' ہم نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا' حالانکہ یہ نام انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنے گمراہ کن نظریات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ان کا اصل نام ہونا چاہیے تھا ''منکرینِ سنت'' یا ''منکرینِ حدیث''۔ ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا جس کے وہ ہرگز اہل نہیں ہیں! یہ خطاب تو آنحضور ﷺ نے اُپنی امت کو دیا تھا' منکرینِ حدیث کو نہیں!

اس حدیث کا ایک ایک لفظ لائقِ توجہ ہے۔ کس قدر جامع ہیں نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا ہے۔ یہاں اس حدیث کی تشریح تو پیش نظر نہیں ہے' محض ایک نکتے کی جانب اشارہ کر کے ہم آگے بڑھیں گے۔ ''یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ'' کا سادہ سا ترجمہ تو یہ ہوگا کہ اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا۔ لیکن یہاں تکیہ کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ تکیہ چونکہ کمر کے پیچھے لگایا جاتا ہے' لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ اس قرآن کو پسِ پشت نہ ڈال دینا' اسے نظر انداز نہ کر دینا۔ پھر یہ کہ تکیہ چونکہ سہارے کے

طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنا لینا کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول کر اور اسے نہایت قیمتی جُزدان میں اونچے طاق پر رکھ کر مطمئن ہو جاؤ کہ اس کی موجودگی باعثِ برکت ہے۔ اس کتابِ مبین سے ہمارا عملی تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑتی ہے' چاہے وہ جھوٹی قسم ہی کیوں نہ ہو' تو اس کے لیے اس کتاب کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے' دم توڑتے شخص کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنا دی جاتی ہے' یا بیٹی کو قرآن کا ایک نسخہ جہیز میں دے کر ایک رسم پوری کر دی جاتی ہے' اللہ اللہ اور خیر سلّا! قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا عملی رویہ تو وہ ہونا چاہیے جو اس حدیث کی رو سے سامنے آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ میں ہمارے لیے فکری و عملی راہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

اللہ کے اس نور کا جو محمد ﷺ کے توسط سے ہم کو ملا' جب ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس دنیا میں اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم یہاں ذلت و رسوائی کا ایک عبرت ناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذابِ اُخروی' تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت ہماری دستگیری فرمائے اور وہ ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے تو دوسری بات ہے۔ اللہ اکبر! کیسا صادق آتا ہے ہمارے حال پر آنحضور ﷺ کا یہ فرمان جسے حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ))(۱) یعنی ''اللہ تعالیٰ یقیناً اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کو چھوڑنے کے باعث) ذلت و نکبت سے دوچار کرے گا۔'' گویا دنیا میں بحیثیتِ قوم ہماری تقدیر اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حدیث کی بہت عمدہ تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ''ہم'' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ......

آیت زیرِنظر کے اس ٹکڑے ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ﴾ پر غور کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس میں ایمان بالرسالت' توقیر و تعظیمِ رسولؐ اور نصرتِ رسولؐ یعنی نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پوری طرح احاطہ کرلیا گیا ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں اور اسی طرزِ عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح ہے کہ فلاح وصلاح اور نجات نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی ان چار بنیادوں کی درستگی پر موقوف ہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے قبل ایک بات مزید عرض کرنا چاہوں گا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور اس کا زوال وانحطاط دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلند پایہ علمائے اسلام اپنی تقریروں اور تحریروں میں کہتے چلے آئے ہیں' جن میں سے ایک ایسی بزرگ ہستی کا حوالہ میں اس وقت پیش کروں گا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں۔ وہ ماضی بعید کی نہیں' ماضی قریب کی ایک مسلّمہ محترم شخصیت ہیں اور وہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران حکومتِ برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کردیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تالیف ''وحدتِ اُمت'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور علماء کو جمع کیا اور فرمایا:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے انہیں آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت

پر برداشت نہ کیا جائے۔“

میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزومند ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرکوز ہو جانی چاہیے۔ قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے‘ سمجھنے اور سمجھانے اور اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لیے اپنی بہترین عملی جدوجہد اور قوتوں کو صرف کرنا اگر ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرے میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہوگا‘ عقائد اسی سے درست ہوں گے‘ جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ کا ابطال اسی فرقانِ حمید سے ہوگا۔ شرک و بدعت کے اندھیرے اسی نورِ ہدایت کی ضیا پاشی سے دور ہوں گے‘ عمل و اخلاق کی اصلاح اور ان میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہوگی۔ معاملات اگر سنوریں گے تو اسی کتاب مبین کی رشد و ہدایت سے سنوریں گے۔ اور اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبلُ اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسک کے نتیجہ میں قائم ہوگا۔ اس کی بنیاد پر جو دعوت اٹھے گی اور نبی اکرم ﷺ کے طریق پر جو انقلابی کام ہوگا اسی کے نتیجے میں یہاں اسلامی نظام کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ کسی اور ذریعے سے یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے!

تعلّم و تعلیم قرآن کی عظمت و اہمیت اور قرآن حکیم کے ”حبل اللہ“ ہونے کے بارے میں درج ذیل تین احادیث نہایت اہم اور جامع ہیں۔ انہیں اپنے ذہن نشین کر لیجیے۔ پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان ؓ۔ صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))(۱) یعنی ”تم میں سے بہترین وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب فضائل القرآن‘ باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ وسنن الترمذی‘ ابواب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔

اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔''

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیر بن مطعم ﷛ سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((اَلَیْسَ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَا اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَّ الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ؟)) قُلْنَا: بَلٰی، قَالَ: ((فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ فَتَمَسَّکُوْا بِہٖ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَھْلِکُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا))

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' ہم نے عرض کیا: یقیناً! تب آپؐ نے فرمایا: ''پس تم خوشیاں مناؤ، اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ کبھی گمراہ۔''

تیسری حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدری ﷛ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((کِتَابُ اللّٰہِ، ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ)) (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے۔''

حرفِ آخر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادوں میں سے اولین بنیاد ''ایمان'' ہے اور دوسری توقیر و تعظیم، جو دراصل ایمان ہی کا فوری لازمی تقاضا ہے۔ ایمان و تعظیم ہی کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پورے طور پر اطاعت کی جائے اور یہ کہ ہمارے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت خود سے اور دوسرے تمام انسانوں

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ و ابن جریر بحوالہ صحیح الجامع الصغیر للالبانی: ۴۴۷۳۔

سے بڑھ کر ہو۔ ان دونوں چیزوں کے اجتماع کا نام ''اتباعِ رسولؐ'' ہے جو فی الاصل مطلوب ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد ''نصرت'' ہے۔ اس نصرت کی ضرورت، نبیؐ کو اپنے کسی ذاتی کام کے لیے نہیں، بلکہ اپنے مشن کی تکمیل یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد میں انہیں معاون اور دست و بازو درکار ہیں۔ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ایک درجے میں ہوئی، یعنی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک۔ حالانکہ آپ ﷺ کی بعثت کُل روئے ارضی کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ چنانچہ وسیع تر سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام اور پورے کرۂ ارضی پر غلبۂ دین کا مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض اُمت کے ذمہ ہے، اس مشن کی تکمیل کا بوجھ اُمت کے کندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہر اُس شخص کی طرف منتقل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے اور آپ ﷺ کا نام لیوا ہے۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد ''اتباعِ قرآن مجید'' ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لیے اس طریق کار کی طرف بھی رہنمائی کردی گئی ہے جس پر کاربند ہو کر دعوت الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر، اس کے داعی، علمبردار اور پیغامبر بن کر ہمیں دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دُنیوی و اُخروی فوز و فلاح مضمر ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ○○

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں

ترتیب

قرآن مجید اور اُسوۂ رسولؐ میں ایک قدرِ مشترک	248
اُسوۂ حسنہ کی پیروی کا عملی نمونہ	252
غزوۂ احزاب کے تناظر میں اصل اُسوۂ رسولؐ	253
امتحان و آزمائش میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل	257
امتحان و آزمائش —— اللہ تعالیٰ کی سُنّتِ ثابتہ	259
غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی کی آمد	263
جواں مرد اہلِ ایمان کا ایفائے عہد	266
منافقین کے بارے میں تدریجی احکام	275
غزوۂ بنو قریظہ —— غزوۂ احزاب کا ضمیمہ و تتمہ	279
اہلِ ایمان کے خلاف مشرکینِ عرب اور یہود کی مشترکہ سازشیں	282
بنو قریظہ کی غداری اور نُعَیم بن مسعودؓ کی حکمت عملی	284
بنو قریظہ کے خلاف اقدام کا فیصلہ	285
حضرت سعدؓ بن معاذ کا تورات کے مطابق فیصلہ	288
غزوۂ بنو قریظہ پر قرآن کا تبصرہ	289
نبی اکرم ﷺ کی اجتماعی جدوجہد کی نوعیت	294
آنحضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے مراحل	298
نصرتِ الٰہی کا ظہور	306
آنحضور ﷺ کی اجتماعی جدوجہد میں قرآن کا مقام	308
تربیت و تزکیہ کا مسنون ذریعہ — قرآن حکیم	312
تنظیم کے لیے اُسوۂ رسولؐ سے راہنمائی	317
تنظیمِ نبویؐ کی نوعیت	319
مسنون ہیئت تنظیمی —— بیعت سمع و طاعت	321
خلاصۂ بحث	328
اہلِ ایمان سے مطلوب رویہ	330

اُسوۂ رسول ﷺ

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں ☆

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ﴿۲۱﴾ وَ لَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ ۙ قَالُوۡا ہٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ صَدَقَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۫ وَ مَا زَادَہُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّ تَسۡلِیۡمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاہَدُوا اللّٰہَ عَلَیۡہِ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَہٗ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ۫ۖ وَ مَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلًا ﴿ۙ۲۳﴾ لِّیَجۡزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیۡنَ بِصِدۡقِہِمۡ وَ یُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿ۚ۲۴﴾ وَ رَدَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِغَیۡظِہِمۡ لَمۡ یَنَالُوۡا خَیۡرًا ؕ وَ کَفَی اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الۡقِتَالَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیۡزًا ﴿ۚ۲۵﴾ وَ اَنۡزَلَ الَّذِیۡنَ ظَاہَرُوۡہُمۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ صَیَاصِیۡہِمۡ وَ قَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الرُّعۡبَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَ تَاۡسِرُوۡنَ فَرِیۡقًا ﴿ۚ۲۶﴾ وَ اَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَہُمۡ وَ دِیَارَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا ﴿٪۲۷﴾

☆ سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۱ تا ۲۷ پر مشتمل یہ درس محترم ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اپنے مسلسل درس قرآن کریم کے دوران جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں مئی ۱۹۷۹ء میں دیا۔

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد:

حضرات! ان آیات پر ہماری گفتگو دو حصوں میں ہو گی۔ ایک تو ان شاء اللہ ہم درس کی صورت میں اس رکوع کو ختم کریں گے۔ پھر اس رکوع میں اسوۂ حسنہ سے متعلق جو مضامین آئیں گے' ان کو ہم صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ اس رکوع کے مضامین کی جو تعلیم عملی انطباق (practicable application) سے متعلق ہے اور ہمارے لیے اس میں جو عملی سبق ہے اس کو میں بعد ازاں ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

''یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔''

اُسوہ کے لفظ کا مادہ ''ا س و'' ہے۔ اُسوہ اور اِسوہ دونوں اس کے تلفظ ہیں۔ جس طرح قُدوہ اور قِدوہ دونوں ہم معنی ہیں' اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں' اور اس کا معنی و مفہوم ہے کسی کا اتباع کرنا' اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا' خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت۔ چنانچہ کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت و راحت اور تکلیف و مضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اسوہ ہو گا۔ اردو میں جب اس لفظ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے گا تو ''نمونہ'' اس کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے' لیکن اس ترجمے سے ''اسوہ'' کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اصل میں ''اتباعِ سنت'' کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے اسی کی ایک نہایت حسین و جمیل تعبیر لفظ اسوہ میں موجود ہے۔

یہاں ''لَکُمْ'' (تمہارے لیے) عام ہے۔ گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں ہیں' بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے۔

قرآن مجید اور اُسوۂ رسولؐ میں ایک قدرِ مشترک

آگے فرمایا: ﴿لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾﴾ یہ

درحقیقت ''لَکُمْ'' کا بدل آ رہا ہے --- آیت کے اس ٹکڑے میں وہ دونوں مفاہیم جمع کر دیے گئے ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں دو مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ ہر نوعِ بشر کے لیے ہدایت کاملہ اور ہدایت تامہ ہے۔ اس میں تا قیامِ قیامت ہر دَور میں تمام نوعِ انسانی کے لیے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور یہ ہر اعتبار سے اکمل واتم ہے۔ چنانچہ قرآن کو ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' کہا گیا ہے۔ (البقرہ: ۱۸۵) یہ علی الاطلاق ہے' یعنی یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ لیکن سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں اس قرآن کو ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس ہدایت سے استفادہ کرنے کی ایک شرط ہے' اور وہ تقویٰ ہے۔ یعنی کچھ خدا ترسی ہو' کچھ اللہ کی طرف انابت ہو' نیکی اور بدی کا کوئی شعور بیدار ہو' انسان خیر و شر میں امتیاز کرتا ہو۔ چنانچہ تقویٰ کا اساسی سرمایہ اور بنیادی اثاثہ اگر موجود نہیں ہوگا تو انسان اس قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن اپنی جگہ ہدایتِ کاملہ و تامہ ہے' لیکن اس سے استفادے کے لیے جو شرط خود انسان کے باطن میں پوری ہونی چاہیے وہ شرط تقویٰ ہے' لہٰذا سورۃ البقرۃ کے آغاز میں ارشاد ہوا: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ اور آیت ۱۸۵ میں فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾

آپ میں سے شاید بعض حضرات کے علم میں ہو کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنامِ زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر جو اعتراضات کیے تھے ان میں پہلا اعتراض یہی تھا کہ یہ عجیب کتاب ہے جو کہتی ہے کہ یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ متقیوں کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں' فاسقوں اور فاجروں کو ہے۔ قرآن مجید کا سَرسَری مطالعہ کرنے والوں کو یہ اشکال پیش آ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ انسان بہت نیک ہو' بہت خدا ترس ہو' اور وہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے ہوئے ہو' یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں محتاط ہو۔ ایسے شخص کو ہم متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا ان

معانی میں جب لفظ تقویٰ سامنے آتا ہے تو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے بارے میں واقعتاً ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اشکال انتہائی بھونڈے طریقے پر اُس شخص نے پیش کیا۔ تو اِس کا حل یہی ہے کہ قرآن مجید درحقیقت ''ھُدًی لِّلنَّاسِ'' ہی ہے' لیکن اس سے استفادے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ تقویٰ کا کچھ نہ کچھ بنیادی اثاثہ موجود ہو۔ ایک شخص میں اگر نیکی اور بدی اور خیر وشر کی تمیز کی کچھ بھی پونجی باقی ہے تو گویا وہ بنیاد موجود ہے جس پر ہدایت کا دارومدار ہے۔ آج کل کی تعمیرات کی ٹیکنیک میں اسے starter کہتے ہیں —— یعنی اگر آپ کو عمارت کا کالم مزید اوپر لے جانا ہے تو کچھ سریئے باہر نکلتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ اوپر کے کالم کو چڑھاتے وقت اس کا جوڑ اُس کے ساتھ لگ جائے۔ پس جس طرح کسی عمارت کے کالم کو مزید اُوپر لے جانے کے لیے starter کا ہونا ضروری ہے' اسی طرح قرآن مجید سے استفادے کے لیے تقویٰ یعنی خیر وشر اور نیکی و بدی کی کچھ نہ کچھ تمیز انسان میں ہونی ضروری ہے۔

بعینہٖ یہی بات اسوۂ رسول ﷺ کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے بھی مجسّم ہدایت ہیں۔ آپؐ کے لیے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے' بایں معنی کہ آپؐ نورِ ہدایت' شمعِ ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید آپؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کتابِ متلو ہے اور نبی اکرم ﷺ قرآنِ مجسّم ہیں —— جیسا کہ آپؐ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ(۱) —— لیکن آپؐ کے اس اُسوہ' نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لیے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کرلے' لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں۔ ان شرائط کو یہاں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی: ۳۰/۱

﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾

''ہر اُس شخص کے لیے (نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اعلیٰ وارفع نمونہ ہے) جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔''

آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان بالآخرۃ۔ ہمارے دین کے تین بنیادی ایمانیات ہیں' جو گویا تین Pillars of Faith ہیں: (۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرہ یا معاد اور (۳) ایمان بالرسالت۔ ایمان بالرسالت سے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ یہ ایمانیاتِ ثلاثہ باہم گُتھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنے لیے نمونہ کیسے بنا لے گا! اور اگر اسے آخرت کا یقین نہیں تو پھر وہ آنحضرت ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کیسے کرے گا! یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا امکان پیدا ہو گا۔ یعنی وہ شخص جو اللہ سے غافل ہو یا کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو' اور جو اللہ سے ملاقات کی حقیقی امید دل میں نہ رکھتا ہو' اسی طرح جس شخص کو یوم آخرت اور محاسبۂ اُخروی کی کوئی توقع نہ ہو' گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو' اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کر سکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار بھی ہو اور جس کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے' جہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی بات پر ہو گا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویہ اللہ کے رسول ﷺ سے کس درجے قریب تر رہا ہے۔ لہٰذا بات صاف کر دی گئی کہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾

اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس شخص کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کر سکے گا اور وہی آپؐ کے نقشِ قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا

ہو۔ یہاں رجاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں طالب ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے' اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے' جس کی وضاحت ﴿وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ سے مزید ہوگئی۔ یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت' اللہ کی شفقت' اللہ کی نظرِ عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں۔ جیسے سورۃ الکہف کی آیت ۲۸ میں فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ﴾ ''وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام' اپنے ربّ کے چہرۂ انور کے طلبگار بن کر''—وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں۔

یہاں فرمایا: ﴿لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ ''جو اللہ کی رضا کا امیدوار ہے اور جو یومِ آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے۔'' گویا اسے یقین ہے کہ یہ دن آ کر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے۔ ﴿وَذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیْرًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ''۔ یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو۔ وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اسے یومِ آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دُنیوی زندگی کا حساب دینا ہے۔ یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اسوۂ محمدی علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہوگا۔

اُسوۂ حسنہ کی پیروی کا عملی نمونہ

اب چونکہ یہاں نبی اکرم ﷺ کے اتباع کا مضمون چلا ہے تو ضرورت تھی کہ مثال پیش کر کے بتایا جائے کہ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے! لیکن قرآن حکیم میں آپ کو یہ اسلوب عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسا اوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہیے۔ جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے اِس اسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرام ؓ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات کہے بغیر اس اسوۂ حسنہ کی

پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرما دیا گیا:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ ﴾

''اور حقیقی مؤمنوں کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس صورت حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔''

یہ بات گویا اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک عملی نمونہ اور مظاہرہ ہے۔

غزوۂ احزاب کے تناظر میں اصل اُسوۂ رسولؐ

یہ اسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے؟ اسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہوگا۔ یوں تو نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہر مسلمان کے لیے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے۔ ایک باپ کے لیے آپؐ بہترین نمونہ ہیں کہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ایک شوہر کے لیے آپؐ کامل نمونہ ہیں کہ اسے اپنے گھر میں اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ایک پڑوسی کے لیے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک مرشد و مزکّی، ہادی و داعی اور مبلّغ کے لیے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک حکمران اور سربراہِ ریاست کے لیے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک منصف اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے لیے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اکمل واتم نہ ہو۔

میں کئی مرتبہ سیرت کی تقاریر میں اپنے اس شدتِ تاثر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جاتا ہوں اور میرے قلب پر نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مطہرہ کا یہ گہرا تاثر ثبت ہوتا ہے کہ اس قدر جامع شخصیت تو ہمارے تصور میں بھی آنی ممکن نہیں۔ کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو اسوۂ حسنہ کے اعتبار سے نامکمل و نا تمام اور خالی نظر آتا ہو! ـــــ آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہر پہلو سے مصروف ترین اور گھمبیر

ترین تھی۔ ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ جو مسجد کا امام ہو وہ عموماً خطابت نہیں کرتا' خطیب علیحدہ ہونا چاہیے۔ جو خطیب صاحب ہیں وہ پانچ وقت کی نماز پڑھانے کی پابندی کیسے قبول کرلیں گے! گویا کہ امامت علیحدہ' خطابت علیحدہ۔ پھر مدرس علیحدہ مزید برآں جو صاحبِ درس کے فرائض انجام دے رہے ہوں' عام طور پر اُن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ یہ تزکیہ وتربیت بھی کریں گے۔ اس کے لیے کہیں اور جائیے۔ یہاں سے تو علم حاصل کر لیجیے' مدرسین قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ ﷺ پڑھا دیں گے' تزکیۂ نفس کے لیے عموماً کسی دوسرے مزکی و مرشد کی تلاش کرنی ہوگی' جن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہوگا —— پھر جو لوگ ان شعبوں سے متعلق ہیں ممکن نہیں کہ وہ آپ کو کہیں سپہ سالار بھی نظر آئیں! یا کم از کم کچھ انتظامی امور کی انجام دہی میں ہی مصروف ملیں! ایسے لوگ اگر لکھنے پڑھنے اور تدریس و تعلیم میں زندگی بھر لگے رہے یا دعوت و تبلیغ ہی میں پوری زندگی کھپا دی اور ان میدانوں میں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا تو عموماً ایسے لوگوں کا گھر گرہستی والا کھاتہ کورا نظر آئے گا۔ معلوم ہوگا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کی جب کہیں جا کر یہ کام انجام دیئے ہیں۔

جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں جو جامعیت ہے وہ پوری انسانی تاریخ حتیٰ کہ انبیاء و رُسل کی مقدس جماعت میں بھی کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ آپؐ مسجد نبوی کے پنج وقتہ امام بھی ہیں اور خطیب بھی ہیں' اصحابِ صُفّہ کے لیے مدرس و معلم بھی ہیں' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے آپ مزکّی و مربّی بھی ہیں۔ آپؐ ہی سپہ سالار بھی ہیں۔ صلح کی گفتگو ہو رہی ہے تو آپؐ ہی کر رہے ہیں۔ باہر سے جو وفود آ رہے ہیں تو ان سے آپؐ ہی معاملہ کر رہے ہیں۔ مقدمات و تنازعات ہیں تو وہ آپؐ کی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں۔ تصور تو کیجیے کہ کون سا میدان اور کون سا پہلو ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ ہمیں حضور ﷺ کی زندگی میں نمونہ نہیں مل سکتا؟ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ لیجیے —— بغیر کسی تنقیص کے میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں کسی نبی کی توہین کروں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک باپ کے لیے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں' ایک شوہر کے لیے

ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ کسی قاضی' کسی سپہ سالار' کسی فاتح اور کسی صدرِ ریاست کے لیے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ آنجنابؑ ایک درویش' ایک مبلّغ اور ایک مربی و مزکّی کی حیثیت سے تو ایک مکمل نمونہ ہیں' لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اور پہلو خالی نظر آرہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب و ذہن اور شعور و ادراک پر جس چیز کا گہرا تاثر ہے وہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی اسی جامعیت کا ہے۔ میں جب گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوں اور حالات کو خود اپنے اوپر وارد کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم ایک ذمہ داری کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے اور اسے نباہ نہیں پاتے' جبکہ وہاں کیا عالَم ہے! کون سی ذمہ داری ہے جو نہیں اٹھائی ہوئی ہے اور اس کو کما حقہٗ پورا نہیں کیا ہے! کون سی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو! الغرض نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہر اعتبار' ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل و اتم ہے —— حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا عظیم معجزہ خود نبی اکرم ﷺ کی اپنی ذات اور شخصیت ہے اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی یہ بھی خاصہ نبوت ہے اور یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب یہ لفظ ''اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' آیا ہے تو کس سیاق و سباق اور سلسلۂ عبارت (context) میں آیا ہے اور اس حوالے سے آپؐ کا اصل اور خصوصی اُسوہ کون سا ہے! —— یہ اسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے۔ وہ صبر و ثبات' اللہ کے دین کے لیے سرفروشی و جان فشانی کہ جاں نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہر مشقت میں آپؐ بھی شریک تھے۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپؐ نے نہ اٹھائی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو' جہاں قالین بچھا دیے گئے ہوں اور وہاں حضور ﷺ آرام فرما رہے ہوں اور مورچھل جھلے جا رہے ہوں' جبکہ صحابہ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خندق کھودنے کے لیے کُدالیں چلا رہے ہوں۔ بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپ ﷺ بھی شامل ہیں۔ کُدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرام ؓ بیک آواز کہہ رہے ہیں: ((اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ اور نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں: فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُھَاجِرَۃَ))(۱)۔ یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپؐ برابر کے شریک ہیں۔ اس خیال سے کہ بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے' صحابہ کرام ؓ نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ ایک صحابیؓ حضور ﷺ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں۔ اس پر سرورِ عالم' محبوبِ ربّ العالمین' خاتم النبیّین والمرسلین ﷺ اپنا کُرتا اٹھاتے ہیں تو اُن صحابیؓ کو شکم مبارک پر دو پتھر بندھے نظر آتے ہیں۔ محاصرے کے دوران آپ ﷺ ہر وقت وہاں موجود رہے اور جس طرح صحابہ کرام ؓ تکان سے چور ہو کر پتھر کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر کے لیے آرام کی خاطر لیٹ جاتے تھے' اسی طرح حضور ﷺ بھی وہیں کھلی زمین پر کچھ دیر کے لیے پتھر پر سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ نے استراحت کے لیے اپنے واسطے کوئی خصوصی اہتمام فرمایا ہو — بنی قریظہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے اہل وعیال مبتلا تھے' اسی سے آپؐ کے اہل بیت بھی دوچار تھے۔ اپنے لیے یا اپنے اہل وعیال کے لیے آپؐ نے حفاظت کا کوئی خصوصی انتظام نہیں کیا تھا۔

یہ ہے اصل صورتِ واقعہ اور صورتِ حال' جس میں فرمایا گیا کہ: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ — اور ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل پیرا ہیں! ویسے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی وقیع اور لائق اتباع ہے۔ لیکن اگر یہ چھوٹی سنتیں اس اصل اور بڑے اسوہ کے لیے اوٹ بن جائیں تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ ان چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے کے باعث کسی کو یہ مغالطہ اور فریب ہو سکتا ہے کہ ''میں بڑا متّبعِ سنت ہوں۔ میں

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب لا عیش الا عیش الآخرۃ' ح:٦٤١٤۔

نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے' لباس میں بھی میں سنت کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں نے یہ بھی اہتمام کر رکھا ہے اور وہ بھی اہتمام کر رکھا ہے"۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسوہ بھی زندگی میں ہے یا نہیں جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوا ہے! دعوت و تبلیغ اور اقامت و اظہارِ دینِ الحق کے لیے سرفروشی' جاں فشانی اور عملی جدوجہد اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات' تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا ـــــ اگر زندگی میں یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تو درحقیقت یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آڑ بن گئی ہیں۔ اس تل کے پیچھے پہاڑ اوٹ میں آ چکا ہے۔ اور ہمارا اِس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل ''اسوہ'' ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے (الا ماشاء اللہ) اور وہ اسوہ یہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور غزوۂ احزاب کے حالات کے بیان میں قرآن حکیم اس کی طرف مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصی طور پر مرتکز (focus) کرتا ہے۔

امتحان و آزمائش میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

پھر اس اسوۂ حسنہ کا جو ٹھپا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و کردار پر لگا ہے اور اس کی جو چھاپ ان کی زندگیوں میں آئی ہے وہ یہ ہے: ﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ جیسے کوئی مشین یا پریس ہو' اس میں لوہے کے ٹکڑے یا کاغذ رکھے ہوں تو جو ڈائی یا بلاک اس میں فٹ ہے' اسی کا نقش (impression) ان پر آتا چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ اس ''اُسوۂ حسنہ'' کا نقش ہے' جو صحابہ کرام ؓ نے قبول کیا ـــــ ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کا مجموعہ بنا کر اسے ہی کُل ''اُسوہ'' سمجھ بیٹھے ہیں اور ہمارا حال (الا ماشاء اللہ) یہ ہو گیا ہے کہ مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ تمثیل ہے' جو علمائے یہود کے اس طرزِ عمل پر حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی کہ مہماتِ دین اور مقتضیاتِ دین کی طرف سے تو انہوں نے آنکھیں بالکل پھیر لی تھیں یا بند کر رکھی تھیں اور جزئیات و فروعات کو وہ کُل دین سمجھ بیٹھے تھے اور اسی کی تدریس و تعلیم میں مصروف رہتے تھے اور اس ضمن میں ذرا سی کمی بیشی پر لوگوں کو سرزنش بھی کرتے تھے اور ان کی تکفیر بھی کرتے

تھے۔ حضرت مسیحؑ کی بیان کردہ یہ تمثیل دنیا کے ہر کلاسیکل ادب میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ضرب المثل بن گئی ہے ___ میں پھر عرض کردوں کہ خدارا میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تحقیر کر رہا ہوں یا ان کی اہمیت گھٹا رہا ہوں' معاذ اللہ! نبی اکرم ﷺ کی ہر سنت' چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو' واجب الاتباع ہے۔ ان سنتوں کا اہتمام والتزام اگر اس ''اُسوہ'' کے ساتھ ہو جو اِس سورۂ مبارکہ کے مطالعے کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے تو سونا ہے' اس کے بغیر ہو تو تانبا ہے' جس کی سونے کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس لیے کہ اگر نسبت و تناسب درست نہیں ہوگا تو صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہوگا! پھر تو وہی طرزِ عمل وجود میں آئے گا جو میں حضرت مسیحؑ کی تمثیل کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں۔

اس ''اُسوہ'' کی چھاپ صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر جو پڑی تو کیفیت یہ ہوگئی کہ جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جو اُمڈ کر اِدھر سے بھی آ رہے تھے اور اُدھر سے بھی آ رہے تھے تو وہ خوفزدہ نہیں ہوئے' بلکہ وہ کہنے لگے کہ یہ حالات تو پیش آنے والے تھے' جن کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ کیا تھا۔ خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے۔ مکہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے۔ مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے۔ آیت ۱۰ میں ان تمام حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آیت ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴿١١﴾﴾ ''یہ وہ وقت تھا جب اہل ایمان خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے''۔ یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صبر و ثبات کا۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی! سردی کا موسم تھا۔ پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر جمع ہو گئے تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان خندق کے اِس پار محصور تھے۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں بنوقریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے' وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تلے بیٹھے ہیں' اور کچھ

پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں‘ جہاں نہ صرف دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے۔ان حالات میں اہلِ ایمان کی کیفیات کیا تھیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے! یہ کہ:

﴿قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾

’’انہوں نے کہا کہ اسی کا تو وعدہ کیا تھا اللہ نے اور اس کے رسول (ﷺ) نے‘ اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔‘‘

امتحان و آزمائش ـــــ اللہ تعالیٰ کی سُنّتِ ثابتہ

تعین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مؤمنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کون سی آیت ان کے سامنے ہو گی ـــــ ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم اہل ایمان کا امتحان لیتے ہیں‘ ہم انہیں آزماتے ہیں‘ ہم ایمان کے دعوے داروں کو آزمائیں گے۔سورۃ العنکبوت‘ جو مکی سورت ہے‘ اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔فرمایا:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۝۳﴾

’’کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے‘ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!‘‘

پھر سورۃ البقرۃ جو مدنی سورت ہے‘ کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ﴾

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات کے ذریعے آزمائش وامتحان سے گزارنے کی اس سنت ثابتہ سے اہلِ ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو آزمائش وابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا جائے — البتہ میرے خیال میں ھٰذَا مَاوَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں سورۃ البقرۃ کی یہ آیات آتی ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿١٥٧﴾﴾

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف وخطر' تنگی' فاقہ کشی اور جان ومال اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے' انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی' اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی' اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعے اہلِ ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا۔ ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں یہ آیات بہت نمایاں ہیں۔ اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں' امتحانات اور ابتلاءات آنے والے ہیں۔

میں سیرتِ مطہرہ کی تقاریر میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر ''یومِ طائف'' نبی اکرم ﷺ کے لیے سب سے کٹھن اور سب سے سخت دن تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب دریافت کیا کہ آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں' مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یومِ طائف تھا''۔ چنانچہ شخصی اعتبار سے حضور کے لیے یوم طائف ابتلاء و آزمائش کا نقطہ عروج (climax) ہے' جبکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے لیے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے ــــ جس کا نقشہ پچھلے رکوع میں یوں کھینچا گیا ہے کہ: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ــــ غور کیجیے کہ یہاں بھی وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آخری امتحان یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے متعلق وارد ہوا ہے کہ ﴿وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾﴾ (الصّٰفّٰت) میں سمجھتا ہوں کہ ''شاباش'' کا اس سے بہتر اسلوب ممکن نہیں ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان فی الواقع سخت تھا۔ وہی انداز اور اسلوب یہاں ہے کہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ــــ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ ہم نے اہلِ یمان کا کٹھن امتحان لے لیا اور ان کو خوب جھنجوڑ لیا۔

جب اہل ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جو لشکر بادلوں کی طرح اُمڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں۔ غزوۂ احد میں تو ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے لیکن یہاں کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئیں اور تیر اندازی سے چند صحابہؓ شہید ہوئے جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں۔ اس غزوے میں باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت' دشمنانانِ اسلام کے لشکر کی تعداد' پھر سردی کا عالم اور سامانِ خورد و نوش کی قلت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' جس کا

نقشہ آیت ۱۰ میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے کہ: ﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ ''جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے''۔ تو اِن حالات میں مؤمنینِ صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر وثبات کا نقشہ اس آیت میں ہمارے سامنے یہ آیا کہ:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ ﴾

''اور حقیقی اہل ایمان کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس واقعہ نے ان کے ایمان اور تسلیم ورضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا۔''

اس کے برعکس منافقین اور وہ لوگ جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے' ان کا کیا حال تھا؟ فوری تقابل کے لیے ان کی دلی کیفیات سے متعلق آیات بھی دیکھ لیجیے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿۱۵﴾﴾

''اور یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے' پلٹ چلو۔ جب ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں' حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے' دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت

انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریکِ فتنہ ہونے میں کوئی تأمل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے' اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کی باز پُرس تو ہونی ہی تھی۔''

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مؤمنین صادقین علیحدہ علیحدہ نمایاں ہوگئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے تھے انہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے۔ غزوۂ خندق میں جب اُحد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کا پول کھل گیا اور واضح ہوگیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے۔

غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی کی آمد

جب امتحان مکمل ہوگیا اور مؤمنینِ صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہو گئے تو نصرتِ الٰہی آگئی اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی۔ مزید برآں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اِسی میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٩﴾﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہیں آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔''

رات کو پورا لشکر موجود تھا' صبح دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ رات کی شدید آندھی نے ان لشکروں کے خیموں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور نظر نہ آنے والی فوجوں نے کھلبلی مچا

دی، جس کے نتیجے میں تمام حملہ آور لشکر صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنا بوریا بستر گول کر کے کوچ کر گئے۔ ''نظر نہ آنے والی فوجوں'' سے مراد وہ مخفی قوتیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وہ فرشتے ہیں جو اِس کائنات کے نظام اور انسانی معاملات میں اللہ کے حکم سے کام کرتے رہتے ہیں اور انسان ان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ بہرحال اس تمام صورتِ حال کی غرض و غایت دراصل آزمائش و امتحان تھی، جس میں مخلص اہل ایمان پورے اترے اور انہوں نے منافقین کے قول ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ کے برعکس دلی یقین کے ساتھ یہ کہا کہ: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ ـــ اس ابتلاء سے نہ وہ ہراساں اور خوف زدہ ہوئے اور نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوئے، بلکہ ان کی کیفیات یہ تھیں کہ: ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾﴾ یعنی اس پوری صورتِ حال نے ان کے ایمان اور ان کی تسلیم و رضا کی کیفیات کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور وہ پورے قلبی اطمینان اور انبساطِ قلب کے ساتھ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں ''زَادَ'' کا فاعل دراصل وہ پوری صورت حال ہے جو غزوۂ احزاب میں پیش آئی۔

ایمان میں کمی بیشی ـــ امامِ اعظمؒ اور امام بخاریؒ کا موقف

اب دیکھئے کہ یہ آیت اس بات کے لیے بھی نص ہو گئی کہ ایمانِ حقیقی بڑھتا بھی ہے۔ یہاں کسی ابہام کے بغیر فرمایا گیا ہے کہ اس صورتِ واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤمنین صادقین کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان کی جو کیفیتِ تسلیم و رضا تھی، وہ بھی بڑھ گئی ـــ اور ان کا ردِ عمل یہ ہو گیا کہ ؏ ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔ ایمان میں اضافے کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں بھی غزوۂ اُحد پر تبصرے کے دوران آیا ہے کہ: ﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ ''(وہ مؤمنین صادقین) جن سے لوگوں (مراد ہیں منافقین) نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑا لشکر آیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا''۔

یہاں ''زَادَھُــــــــــــمْ'' ایمانِ حقیقی اور کامل سپردگی میں اضافے کے لیے آیا ہے۔ لہٰذا ازروئے قرآن ایمانِ حقیقی کے بڑھنے کی نصوص ہمارے سامنے آگئیں ـــــ اور جو چیز بڑھ سکتی ہے' وہ گھٹ بھی سکتی ہے۔

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کا موضوع ہمارے منتخب نصاب میں ایمانِ حقیقی کے مباحث کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ یہاں میں اجمالاً وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ درحقیقت ایک قانونی ایمان ہے جو اِس دنیا میں ہمارے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھے جانے کا سبب یا ذریعہ بنتا ہے۔ اس قانونی ایمان میں عمل سرے سے زیر بحث نہیں آتا' لہٰذا یہ قانونی ایمان نہ بڑھتا ہے' نہ گھٹتا ہے۔ اس کے بارے میں سید الفقہاء امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ ـــــ ''ایمان دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے' جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے''۔ اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے کہ کسی کے دل میں اتار کر دیکھ لیا جائے کہ ایمانِ حقیقی موجود ہے یا نہیں! اور کوئی جھوٹ موٹ کلمہ پڑھ رہا ہے یا سچ پڑھ رہا ہے؟ یہ قانونی ایمان کسی شخص کے اسلامی معاشرے کا فرد اور کسی اسلامی ریاست کا شہری بننے کی بنیاد بنتا ہے اور یہ ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ جبکہ ایک ہے ایمانِ قلبی' یعنی ''تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ'' والا ایمان' جو دل میں ہوتا ہے۔ قانون اس سے بحث نہیں کرتا' لیکن آخرت میں ساری بحث اسی سے ہوگی۔ اللہ کو کسی کے قانونی مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پرواہ نہیں ہے' یہ دُنیوی معاملہ ہے' دنیا میں اس بنیاد پر معاملات طے ہو چکے۔ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں پر ہے کہ یہاں ایمان ویقین ہے یا نہیں! ـــــ اس ضمن میں سورۃ الحجرات میں فرمایا کہ: ﴿وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ (آیت ۱۴) ''ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔ قلبی اور حقیقی ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ اس دل والے ایمان میں ''عمل'' ایک جزوِ لازم بن جائے گا۔ اس لیے کہ دل میں یقین ہوگا تو عمل میں اس کا ظہور لازماً ہوگا۔ اس اعتبار سے رئیس المحدثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول

صدفی صد درست ہے کہ: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ یَزِیْدُ بِالطَّاعَةِ وَیَنْقُصُ بِالْمَعْصِیَةِ۔ یعنی ایمان قول وعمل کے مجموعے کا نام ہے' جو کہ اطاعت سے بڑھتا ہے اور گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ یہ ضمنی بحث ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ﴿۲۲﴾﴾ کے ضمن میں آ گئی۔ ''اور اس چیز نے نہیں بڑھایا ان میں مگر ایمان اور تسلیم کو''۔

یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے جو ایک قلبی کیفیت ہے۔ اور ''تسلیم'' سے مراد ہے سپردگی وحوالگی۔ اسلام اور تسلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اسلام بابِ افعال ہے اور تسلیم باب تفعیل ہے۔ بابِ افعال کا خاصہ ہے کہ کوئی کام ایک دم ہو جائے' لہٰذا اسلام کا مطلب ہوگا فوری طور پر خود کو کسی کی سپردگی میں دے دینا اور باب تفعیل کسی کام کے پے در پے اور مسلسل ہونے کی خاصیت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کا مفہوم ہوگا ہر دم' ہر وقت اور مسلسل اس سپردگی کی کیفیت کو قائم و برقرار رکھنا۔ جیسے ہی کسی نے اقرار کیا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وہ دفعتہً کفر کی سرحد سے اسلام کی سرحد میں آ گیا۔ اس نے ایک پالے سے دوسرے پالے میں یکایک چھلانگ لگا دی اور وہ مسلمان ہو کر مسلم معاشرے کا فرد اور ایک مسلم ریاست کا شہری بن گیا۔ اس کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہو گئے۔ اور یہ بالکل برابر ہوں گے' ان میں کوئی کمی بیشی اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ اسلام کی اس کیفیت کو وثوق حاصل ہو جائے گا اور اس کے طرزِ عمل میں مسلسل اطاعت شعاری اور فرماں برداری اور سپردگی کا مظاہرہ ہوتا رہے گا۔ تو یہ تسلیم ہے۔ یہ مصرعہ اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اور فارسی کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا مصداق ہے کہ ۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

جواں مرد اہلِ ایمان کا ایفائے عہد

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ ﴾

''اہل ایمان میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی (اپنی باری آنے کا) منتظر ہے۔ اور انہوں نے (اپنے رویئے اور طرزِ عمل میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

کاش اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شامل فرمادے!

یہ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر غزوۂ احزاب کے پس منظر میں غور و تدبر کیا جائے ـــــ اللہ تعالیٰ ان اہلِ ایمان کی مدح و ستائش فرما رہا ہے کہ ان میں ایسے بھی جواں مرد اور باہمت لوگ ہیں جو اپنے عہد کو پورا کر چکے۔ یہاں رِجَالٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو رَجُلٌ کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین اس سے خارج ہو گئیں۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کو بالعموم مذکر کے صیغے میں خطاب کیا گیا ہے۔ ایسا بغرضِ تغلیب ہوتا ہے اور اس میں آپ سے آپ خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہاں لفظ ''رِجَال'' اپنی اس معنویت کے لیے آیا ہے کہ اس دنیا میں شیطانی وساوس سے بچ کر دین پر کاربند رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے' بلکہ بڑی ہمت اور جواں مردی کا کام ہے۔ یہی مضمون سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾ ﴾

''ان میں ایسے باہمت و جواں مرد بھی ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی۔''

اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ کیفیات عورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ خواتین میں صحابیات ہیں' اُمہات المؤمنین ہیں' رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین۔ پھر بڑی بڑی متقی' صالح'

صابر، عابد و زاہد اور مجاہد خواتین اُمت میں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ایک اللہ والی خاتون حضرت خنساء (رضی اللہ عنہا) بھی ہیں، جن کے چار جوان بیٹے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران کی جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے اور انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ ایک خاتون وہ بھی ہیں کہ جب غزوۂ اُحد میں عارضی ہزیمت ہوئی اور نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی افواہ مدینہ تک پہنچی تو وہ بے تابانہ میدانِ اُحد میں آتی ہیں۔ ان کو خبر دی جاتی ہے کہ تمہارے والد شہید ہو گئے، مگر وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا شوہر بھی شہید ہو گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ کوئی بات نہیں، مجھے یہ بتاؤ کہ حضور ﷺ کا کیا حال ہے؟ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا۔ وہ اللہ کی بندی کہتی ہیں کہ مجھے حضور ﷺ کے بارے میں بتاؤ۔ اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ بخیریت ہیں تو وہ کہتی ہیں: الحمد للہ! اس خوشخبری کے آگے سب کچھ ہیچ ہے —— باپ، شوہر اور بیٹا تو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر کامران و کامیاب ہو گئے۔ الغرض ہماری تاریخ میں ایسی خواتین کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ ؎

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد
نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد

چنانچہ اس بات کو اس مقام پر ذہن میں رکھئے کہ یہاں رجال سے جواں مرد و باہمت لوگ مراد ہیں، خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔

ان آیات سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ بندۂ مؤمن کی زندگی کے دو رُخ ہیں —— ایک طرف اللہ کے ساتھ دلی تعلق اور لگاؤ اور اس میں ثبات، اور دوسری طرف اللہ کے دین کے لیے جہاد و مجاہدہ اور اس میں صبر و ثبات اور استقلال و استقامت۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں، جو آیۂ بر کے نام سے ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے، بر و تقویٰ کی حقیقت کے ضمن میں ارشاد ہوا کہ اللہ کے نزدیک صادق اور نیک لوگ وہ ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جب کوئی عہد و معاہدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں، اور اللہ کی راہ

میں تنگی اور مصیبت نیز جہاد و قتال کے موقع پر انتہائی صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بندۂ مؤمن کی زندگی کے یہ دو رخ ہیں اور ان دونوں کے اعتبار سے انتہائی صبر و استقلال کی ضرورت ہے' لہٰذا یہاں فرمایا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ ''اہل ایمان میں وہ جواں مرد اور باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اس عہد کو جو انہوں نے اپنے اللہ سے کیا تھا۔''

اب غور کیجیے کہ یہ عہد کون سا ہے؟ اسلام خود ایک بہت بڑا عہد ہے۔ پھر ہم نماز کی ہر رکعت میں اس کا اقرار اور اس کی تجدید کرتے ہیں کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ اللہ کے ساتھ اس سے بڑا عہد ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھ ہی سے طالبِ اعانت و دستگیری ہیں اور رہیں گے۔ ہم نے اپنا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے حوالے کر دیا ہے۔ ع سپردم بہ تو مایۂ خویش را! از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''بلاشبہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں''۔ اب انہیں اس سودے میں پورے اتر کر دکھانا ہے۔ کہنے کو کہہ دیا' پڑھنے کو پڑھ لیا' سننے کو سن لیا' لیکن پورا اتر کر دکھانا قیامت ہے۔ کہنے کو تو شاعر نے بھی کہہ دیا کہ ؎

جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

لیکن اس پر پورا اترنا کوئی آسان بات نہیں —— پس یہاں ان اہل ایمان کی مدح و ستائش ہو رہی ہے جنہوں نے اس آزمائش و ابتلاء میں اپنے آپ کو پورا تول کر دکھا دیا۔ لہٰذا ان کی شان میں فرمایا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ آگے فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ ''پس ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے''، یعنی اللہ کی راہ میں جان دے کر سرخرو اور سبک دوش ہو گئے —— ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ ''اور ان میں وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں''۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ کب وہ

وقت آئے جب ہم اپنے اس عہد کو پورا کر کے سرخرو ہو جائیں اور اپنے شانوں پر رکھا ہوا بوجھ اتروا کر سبک دوش ہو جائیں ـــــ اگر گردن کٹ گئی تو شانوں کا بوجھ اتر گیا اور سبک دوشی حاصل ہو گئی۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ سَالَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهِ))(۱)

''جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت طلب کرتا رہے گا تو چاہے اس کی موت بستر پر واقع ہو اللہ تعالیٰ اسے شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا۔''

یہ اصل میں یَنْتَظِرُ والی کیفیت کی ایک طرح کی شرح ہے۔ البتہ اس انتظار کی کیفیات اور شرائط ہوں گی ـــ قتال کا مرحلہ کیسے آئے گا جبکہ آپ نے جہاد ہی کی کوشش شروع نہیں کی؟ اگر آپ نے دین کے لیے محنت و مشقت کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا' آپ اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والی کسی تنظیم و جماعت سے وابستہ ہی نہیں ہوئے تو پھر قتال کا مرحلہ کہاں سے آ جائے گا جو جہاد کی آخری اور چوٹی کی منزل ہے؟ یہ مرحلہ تو اُس وقت آ سکے گا جب آپ کسی ایسی منظّم دعوت اور تحریک سے عملاً وابستہ ہوں جو اقامتِ دین کے لیے کوشاں ہو۔ غور کیجیے ایسے صحابہ کرامؓ بھی تو ہیں جن کا ہجرت سے قبل انتقال ہو گیا' لیکن وہ دعوت و تبلیغ اور تکبیرِ ربّ میں نبی اکرم ﷺ کے دست و بازو رہے ہیں۔ اپنی جانیں' اپنا مال' اپنے اوقات' اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں لگاتے رہے ہیں' کھپاتے رہے ہیں۔ وہ اگر غزوۂ بدر یا اُحد تک پہنچ گئے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ ان کے قدم پیچھے ہٹ جاتے! اُن کا سابقہ طرزِ عمل ثابت کرے گا کہ وہ اپنے موقف میں کتنے ثابت قدم اور سرگرم عمل رہے ہیں۔ جو شخص قدم قدم پر پیچھے ہٹ رہا ہو اور پیسے پیسے کو سینت سینت کر رکھ رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اگر کبھی وقت کا تقاضا ہو تو وہ جان و مال کی بازی لگا دے گا؟ ـــ پس جو بندۂ مؤمن صدقِ دل سے شہادت کا

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب استحباب طلب الشهادة فی سبیل اللّٰہ تعالیٰ۔

طالب ہو اور اللہ کی راہ میں نذرِ جاں پیش کرنے کا آرزومند ہو اُس کی زندگی میں اس کے عملی مظاہرے آ کر رہیں گے۔ اگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے اور شہادت کا طلبگار بھی ہے تو وہ اس بات کی توقع رکھے کہ اگر بستر پر بھی اس کی موت آئے تو اسے مرتبۂ شہادت مل سکے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس نے کاغان کا سفر شروع کیا ہے تو اس کے لیے بابوسر پاس تک بھی پہنچنے کا امکان ہو گا۔ لیکن اگر کوئی بالاکوٹ سے آگے بڑھنے اور وادیٔ کاغان میں قدم رکھنے کے لیے ہی تیار نہیں تو بابوسر پاس کب آئے گا؟ بیٹھے بیٹھے بابوسر پاس کی تمنا کرتے رہنا تو سوائے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے اور کچھ نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ؎ خود را بہ فریبد کہ خدارا بہ فریبد ـــــ ایسا شخص خود اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے یا خدا کو فریب دے رہا ہے؟ ـــــ علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے کہ : ؎

خبر نہیں نام کیا ہے اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

تو اس دھوکے کے انداز میں شہادت کی تمنا نہ ہو بلکہ عمل کے ساتھ صدقِ دل سے یہ تمنا ہو تو بستر کی موت بھی ان شاء اللہ شہادت کی موت ہو گی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی موت بستر پر آئی ہے جن کی زندگی ہمیشہ جنگوں کے اندر بیتی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ آنجنابؓ کو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے ''سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ'' کا خطاب ملا تھا۔ لہٰذا ان کی شہادت گویا اللہ کی تلوار ٹوٹنے کے مترادف ہوتی۔ آپؓ کو شہادت کی موت کی بڑی تمنا تھی اور اسلام لانے کے بعد آپؓ کی زندگی جہاد و قتال میں گزری ہے۔ اگرچہ ان کی شہادت کی آرزو بظاہر پوری نہیں ہوئی لیکن نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا قولِ مبارک اور نوید کے مطابق ان کی بستر کی موت بھی شہادت کی موت ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾ ''انہوں نے اپنے رویے میں سرمو تبدیلی نہیں کی'' ـــــ ''تَبْدِيْلًا'' یہاں مفعولِ مطلق کے طور پر آیا ہے اور

اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ان اہلِ ایمان نے بالکلیہ اپنے عہد اور وعدے کو ایفاء کیا اور اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی' بلکہ اس کو پوری طرح نبھایا ___ اور یہ جان لیجیے کہ ہمارے اور اُس معاشرے میں بڑا بنیادی فرق یہی تھا۔ وہ عہد کے سچے تھے اور ہم عہد کرتے ہیں تو اس کا ایفاء نہیں کرتے' اس کو نبھاتے نہیں۔ ابھی عہد کریں گے اور ہاتھ میں ہاتھ دیں گے لیکن دو دن کے اندر اس کو توڑ دیں گے۔ یہ جو ہمارے کردار میں گھن لگ گیا ہے' اس کے سبب سے ہماری شخصیتیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ جبکہ اُس معاشرے کی کیفیت یہ تھی کہ ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے تو ہر چہ بادا باد' عہد کو بہر صورت ایفاء کرنا اور نبھانا ہے' پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ کردار اُس معاشرے میں ایامِ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ اُس دور کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ جیسے اُس معاشرے میں ظہورِ اسلام سے قبل سرے سے کوئی خیر تھا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے سے بہت سے اعتبارات سے وہ معاشرہ کہیں بہتر تھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی دشمن بھی مہمان کے طور پر مقیم ہو گیا' چاہے وہ باپ کا قاتل ہے' تو اس پر آنچ نہیں آئے گی اور اس حالت میں انتقام نہیں لیا جائے گا۔ جسے بھائی کہہ دیا اس کے لیے جان و مال سب حاضر ہے۔ جس کو پناہ دے دی ہے اس کے لیے پورے قبیلے کی مخالفت گوارا کر لی جائے گی اور اس کی مدافعت میں اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ وہاں حال یہ تھا کہ اگر کسی کی اطاعت قبول کر لی ہے تو اب اس اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کی جائے گی۔ یہ بنیادی کردار ہوتا ہے۔ ہم اِس وقت جن اسباب کی بنا پر دنیا میں ذلیل و رسوا اور پامال ہو رہے ہیں' ہمارا کوئی وقار نہیں ہے' کوئی باعزت مقام ہمیں حاصل نہیں ہے تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا کردار پست ہو چکا ہے اور ہم' الا ماشاء اللہ' بنیادی اخلاقیات سے بھی تہی دست ہو چکے ہیں۔ ہمارے کردار میں پختگی نہیں ہے' بلکہ انتہائی بودا پن موجود ہے۔ عہد کر کے نبھانے اور اس کو وفا کرنے کی خُو اور ارادہ نہیں ہے۔ جھوٹے وعدے ہم کرتے ہیں اور اچھے اچھے اور بڑے بڑے سمجھدار لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہیں۔ یہ

ہمارے کردار کی ناپختگی اور بودے پن کا بہت بڑا سبب ہے۔

ہمارے دین میں ایفاءِ عہد کی جو اہمیت ہے اس کا تفصیل سے ذکر ہمارے منتخب نصاب میں متعدد بار آتا ہے۔ جیسے آیۂ بِر (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷) کے درس میں اہلِ بر و تقویٰ کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ﴾ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کے درس میں بیان ہوتا ہے: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿۳۴﴾﴾ اسی طرح سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع کی آیت ۸ اور سورۃ المعارج کے پہلے رکوع کی آیت ۳۲ میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر امانت اور عہد کے متعلق مؤمنینِ صالحین کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۸﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پوری طرح حفاظت کرنے والے ہیں'' (وہی فلاح یافتہ ہیں) ـــــ یہ ہے کردار کی اہم ترین بنیاد کہ اہل ایمان اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار کو وفا کرنے والے اور ان کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں۔

ان مؤمنین صادقین کی اس استقامت و مصابرت کا جو نتیجہ نکلا اس کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ ''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے''۔ یہاں لام 'لامِ عاقبت' ہے' یعنی کسی کام کا جو نتیجہ نکلتا ہے' اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس صورت حال کے متعلق آپ کو بتایا تھا کہ یہ کڑا امتحان اس لیے لیا گیا تھا کہ جدا کر کے اور نمایاں کر کے دکھا دیا جائے کہ کون لوگ مؤمنین صادقین ہیں' کون لوگ ضعف ایمان میں مبتلا ہیں اور کون لوگ منافقین ہیں! یہی تو تمیز کرنی تھی' اور یہ تمیز اس لیے تھی کہ ﴿لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾

دین میں 'صدق' کا مقام و مرتبہ

یہاں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ہمارے دین میں صدق کا کیا مقام اور مرتبہ ہے۔ آیۂ بر میں نیکوکاروں کے متعدد اوصاف بیان کر کے آخر میں فرمایا گیا:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

''(حقیقی نیکوکار تو وہ لوگ ہیں) جو تنگی اور مصیبت کے وقت اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کرنے والے ہوں' یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں' اور یہی لوگ درحقیقت متقی ہیں۔''

سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔''

صدیقینؑ کے اوصاف میں سے چوٹی کے دو اوصاف یہ ہیں کہ وہ ہر حال میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے اور مصیبت و ابتلاء میں اور میدانِ قتال و وغا میں استقامت و مصابرت کا مظاہرہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لیے سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں مُنعَم علیہم کی فہرست میں نبیین کے بعد صدیقین ہی کا رتبہ اور مقام بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ﴾

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔''

اس صدق کی بنیاد یہی ہے کہ قول میں سچے ہوں' وعدوں میں سچے ہوں' عمل میں سچے ہوں ـــــ اگر راست گفتاری نہیں ہے' راست بازی نہیں ہے' راست کرداری نہیں ہے تو نہ تقویٰ ہے اور نہ نیکی ہے۔ اس کے بغیر دین کا ڈھانچہ بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ بے وقعت و بے روح ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے کے افراد صرف نمائشی پہلوان ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی دین محض بطورِ نمائش شامل ہے' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ معاشرہ صدق کی دولت سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ یہ پونجی اور یہ سرمایہ اس کے پاس سے نکل چکا ہے اور اس پہلو سے وہ بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ' کچھ لوگ ہوں گے جن کے پاس کچھ پونجی موجود ہو۔ حالانکہ ہمارے دین کا شدید ترین مطالبہ یہ ہے کہ جو کہہ

رہے ہو اُس کو عمل سے سچ کر دکھاؤ' جو تمہارے اندر ہے وہی باہر لاؤ۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں' جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے' دوٹوک انداز میں فرمادیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾

''اے اہلِ ایمان! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ حرکت سخت ناپسندیدہ اور بیزارکن (اور اس کے غضب کا باعث) ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق تمہارا عمل نہیں۔ اللہ کو تو وہ اہلِ ایمان محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر مقابلہ کرتے ہیں جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہ ہے دراصل صدق کی بنیاد —— صدق قول کا بھی ہے' صدق عمل کا بھی ہے' صدق انسان کی سیرت و کردار کا بھی ہے۔ صدق بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں نقد جان کا نذرانہ پیش کرنا بھی ہے۔ اب ان آیات میں صدق کی اہمیت دیکھئے۔ فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

''اہلِ ایمان میں وہ باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری کا منتظر ہے۔ (یہ اس لیے ہوا) تاکہ اللہ مؤمنین صادقین کو ان کی سچائی کی جزا دے۔ اور منافقین کو اگر چاہے تو سزا دے یا اگر چاہے تو (ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور) ان کی توبہ قبول فرمالے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔''

منافقین کے بارے میں تدریجی احکام

غزوۂ احزاب ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ زمانہ مدنی دور کا وسط ہے۔ منافقین کے

باب میں آپ کو قرآن مجید میں یہ تدریج نظر آئے گی کہ شروع میں یعنی سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران میں لفظ نفاق آیا ہی نہیں۔ صرف اس مرضِ نفاق کی علامات ظاہر کی گئیں۔ سورۃ النساء میں لفظ نفاق کے ساتھ سخت لہجہ اور اسلوب میں گفتگو شروع ہوتی ہے۔ یہاں یہ معاملہ ہے کہ منافقین کا کردار تو واضح اور نمایاں طور پر بیان کر دیا گیا ہے' لیکن ان کے رویے کے متعلق آخری فیصلہ ابھی نہیں سنایا گیا تاکہ اگر کسی کے اندر اصلاح پذیری کا کوئی مادہ اور رمق موجود ہے تو وہ اصلاح کر لے۔ کوئی اگر نفاق کی حالت سے لوٹ سکتا ہے تو لوٹ آئے۔ کوئی اگر ایمانِ حقیقی کی طرف رجوع کر سکتا ہے تو کر لے' دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ لیکن آگے جا کر اس ضمن میں آخری احکام اور فیصلے آئے ہیں' جن میں سے ایک فیصلہ تو سورۃ النساء میں شامل کیا گیا کہ: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ ''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے' اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے''۔ اور سورۃ التوبہ (البراءۃ) میں جو ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی' مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے ان منافقین کی اصل حقیقت کھول کر یہ فیصلے صادر فرما دیے گئے کہ:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ هِیَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۶۸﴾﴾

''منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لیے موزوں ٹھکانہ ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور اُن کے لیے قائم و دائم رہنے والا عذاب ہے۔''

آگے یہاں تک فرما دیا کہ:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۸۰﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) آپ خواہ ایسے لوگوں کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں' اگر

آپ ستّر بار بھی ان کو معاف کر دینے کی درخواست کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا' اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے' اور اللہ فاسقوں کو راہ یاب نہیں فرماتا۔''

حضور ﷺ کا اپنا مزاج ہے۔ آپؐ رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستّر سے زیادہ بار استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں کرتا —— نبی اکرم ﷺ کے اس قول کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ یہاں ستّر سے مراد عدد یا ہندسہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک استعارہ ہے۔ یہاں ستّر کا لفظ کثرت کے لیے آیا ہے کہ اب ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ ان کو بار بار متوجہ کیا گیا۔ تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان کو اصلاح کا پورا پورا موقع دیا گیا —— اس مقام پر ہی دیکھ لیجیے کتنے پیارے انداز میں فرمایا گیا: ﴿وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾﴾ مؤمنینِ صادقین کے لیے تو قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا: ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ لیکن منافقین کے لیے توبہ کرنے اور اپنے رویّے کی اصلاح کرنے کا موقع رکھا گیا اور ان کو مہلت دی گئی کہ ابھی ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلے کا وقت نہیں آیا ہے' ابھی ان کے لیے راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ ابھی کھلا رکھا گیا تھا لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت غفوریت اور رحمانیت کا بیان فرما دیا تا کہ منافقین بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ گویا ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ' لوٹو اور رجوع کرو ؎

باز آ باز آ آں ہرچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ!
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب آگے چلیے۔ فرمایا: ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ﴾ ''اور اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا اور وہ اپنے دل کی جلن اور غصہ و غیظ لیے یونہی پلٹ گئے اور ان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا''۔ غور کیجیے کہ ان کفار کو کن کن حسرتوں کا منہ دیکھنا پڑا

ہو گا۔ کیسے کیسے ساز و سامان کے ساتھ اور کیسی کیسی سازشوں کے نتیجے میں اتنی مختلف سمتوں سے لشکروں کا ایک جگہ آ کر جمع ہو جانا! اس کے لیے انہوں نے کیا کیا کھکھیڑ مول نہیں لیے ہوں گے؟ کتنی سفارتی بھاگ دوڑ اور چلت پھرت ہوئی ہو گی۔ کتنے ایلچی آئے اور گئے ہوں گے۔ کتنے پروگرام بنے ہوں گے! وہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن کا دور تو نہیں تھا۔ اُس زمانے کے عرب میں اس حملے کی تیاری اور پروگرام بنانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے گئے ہوں گے' ذرا ان کا تصور تو کیجیے! لیکن ان کے متحدہ محاذ اور اُن کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خیمے اکھاڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر ان کے دلوں میں غیظ وغضب کی جو آگ سلگ رہی تھی اس پر اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہا ہے: ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو اُن کے غیظ و غضب سمیت لوٹا دیا' اب وہ اس میں سلگیں اور جلیں' گویا ان کے دل آگ کی بھٹی بنا دیے گئے —— وہ کوئی خیر نہ پا سکے' کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بغیر اس کے کہ اپنے مقاصد میں سے کچھ بھی انہیں ملا ہوتا' وہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر لوٹا دیے گئے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا: ﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ﴾ ''اور اللہ کافی ہو گیا اہل ایمان کی طرف سے قتال کے لیے۔'' قتال کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ خندق میں جو کوئی بھی کودا مبارزت طلبی کے بعد واصل جہنم ہوا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا! سیرتِ مطہرہ کی کتب میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے پوری کوشش کی تھی لیکن انہیں خندق میں لشکر اتارنے کی ہمت نہیں ہوئی' کیونکہ مسلمان تیر اندازوں نے اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ان کو ہزیمت پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا اس غزوے میں دو بدو گھمسان کی جنگ' جیسے بدر اور اُحد میں ہوئی' کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ یہ جنگ تو اللہ نے مسلمانوں کے لیے جیت لی۔ اصل میں تو مسلمانوں کا امتحان مقصود تھا' وہ ہو گیا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو گیا' یعنی اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق جدا جدا ہو کر نمایاں اور ممیز ہو گئے۔ بس یہی مطلوب تھا۔ اب کفار کے لشکروں کے مُنہ موڑنے کے لیے اللہ کافی ہو گیا۔

یہ آیت مبارکہ اس پُرجلال و پُرہیبت اسلوب سے ختم ہوتی ہے کہ ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝٢٥ ﴾ ”اللہ بڑی قوت والا زبردست ہے“۔ اس سے پہلے کی آیت میں دریتو بہ وار کھا گیا تھا لہٰذا وہاں صفات کون سی آئیں؟ ﴿ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ آیات کے آخر میں بالعموم اللہ کی جو صفات یا اسماءِ حسنیٰ آتے ہیں‘ ان کا مضمون سے گہرا ربط و تعلق ہوتا ہے‘ ان پر سے سرسری طور پر گزرنا نہیں چاہیے۔ یہاں دو صفات کی وساطت سے بتایا جا رہا ہے کہ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔ اس کی ذاتِ والا صفات فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے‘ وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ پورے عرب کے مشرک قبائل اور یہود کے دو قبیلے متحدہ محاذ بنا کر اسلامی تحریک کو بالکلیہ نیست و نابود کرنے کے لیے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ لیکن تقریباً ایک ماہ کے طویل محاصرے کے بعد قدرتِ الٰہی کا کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی‘ کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آندھی نے دشمنوں کے خیمے تلپٹ کر دیئے تھے اور ان کے اندر شدید افراتفری مچ گئی تھی۔ مشرکینِ عرب کا یہ متحدہ محاذ قدرتِ الٰہی کا یہ کاری وار سہہ نہ سکا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا جس کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے تھے: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))(۱) ”اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔“

غزوۂ بنو قریظہ ___ غزوۂ احزاب کا ضمیمہ و تتمہ

آگے چلیے! غزوۂ احزاب کا جو ضمیمہ اور تتمہ ہے‘ یعنی غزوۂ بنی قریظہ‘ اس کا نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اس رکوع کی آخری دو آیات میں ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا جاتا ہے‘ لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر

(۱) تفسیر ابن کثیر۔

یہاں غزوۂ احزاب کے ضمن میں ایک Appendix کے طور پر کیا گیا ہے۔

ان دو آیات کے مطالعے سے قبل رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت مدینہ منورہ میں یہود کے جو تین قبائل آباد تھے ان کے متعلق تھوڑا سا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجیے۔ یہ قبیلے تھے بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ۔ نبی کریم ﷺ کا کمال تدبر یہ تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد آپؐ نے ان تینوں قبائل کو ایک معاہدے کا پابند کر لیا تھا۔ حضورؐ کی اس کمالِ فراست کو میں جو بھی خراجِ تحسین پیش کروں گا' وہ عقیدت میں شمار ہو سکتا ہے' لیکن اس تدبر و فراست پر مستشرقین کمال درجہ کا خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔ وہ ایچ جی ویلز ہوں' منٹگمری واٹ ہوں یا دوسرے مستشرقین ہوں' انہوں نے حضورؐ کے کمال تدبر اور پیش بینی کی جو مدح سرائی کی ہے' وہ کافی ہے۔ اصل تعریف وشہادت تو وہ ہے جو اَعداء دیں۔ مدینہ میں بسنے والے اوس وخزرج کے اکثر لوگ ایمان لے آئے تھے۔ یہی دو قبیلے اصلاً مدینہ کے رہنے والے تھے' جبکہ یہود باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اوس وخزرج کی دعوت پر ہی باذنِ الٰہی حضور ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اور یہاں تشریف آوری کے بعد آپؐ کی حیثیت مدینہ کے امیر' حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ کی ہوگئی۔ آپؐ نے ان یہودی قبائل کو اس معاہدے میں جکڑ لیا کہ اگر باہر سے مدینہ پر کوئی حملہ آور ہوا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا جو یہود کے گلے کا طوق بن گیا۔ یہ معاہدہ نہ ہوتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ واللہ اعلم!

اپنی جگہ پر ایک دوسری بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مسلمان قوم جب بگڑتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر ''وھن'' پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لفظ ''وھن'' کی حضور ﷺ نے تشریح یوں فرمائی ہے کہ: ((حُبُّ الدُّنیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ))(۱)۔ یعنی اس قوم میں دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ دشمن کے مقابلہ میں کمزور ہو جاتی ہے۔ یہود اُس وقت کی بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ ان کے اندر وہ ضعف تھا کہ سورۃ الحشر میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿ لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الملاحم' باب فی تداعی الامم علی الاسلام۔

﴿اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ ”(اے مسلمانو!) یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے‘ لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔“ ان یہودیوں کے برعکس مشرکین نے کھلے میدانوں میں آ کر جنگ کی ہے۔ ابو جہل نے غزوۂ بدر میں اپنے معبودانِ باطل اور اپنے اوہامِ باطلہ کے لیے دوبدو ہو کر میدانِ جنگ میں گردن کٹوائی۔ لیکن یہود کا معاملہ یہ ہے کہ جب لڑیں گے تو فصیلوں پر چڑھ کر عورتوں کی طرح پتھراؤ کریں گے۔ پھر یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں‘ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿بَاۡسُہُمۡ بَیۡنَہُمۡ شَدِیۡدٌ ؕ تَحۡسَبُہُمۡ جَمِیۡعًا وَّ قُلُوۡبُہُمۡ شَتّٰی ؕ﴾ (آیت ۱۴) تم ان کو اکٹھا سمجھتے ہو‘ حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تم ان سے گھبراؤ نہیں۔ بظاہر ان کی جمعیت بہت مرعوب کن ہے‘ یہ بہت پیسے والے ہیں‘ ساز و سامان بھی ان کے پاس وافر موجود ہے‘ اسلحہ بھی ان کے پاس بہت ہے‘ ان کے پاس گڑھیاں ہیں‘ قلعے ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ تھی کہ یہ اندر سے اتنے بودے تھے کہ ان میں میدان میں آ کر لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر ان تمام کمزوریوں کے علی الرغم نبی اکرم ﷺ نے ان کو معاہدے میں جکڑ لیا تھا۔

اب یہ ہوا کہ یہ مختلف مواقع پر اس معاہدے پر تلملاتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ شجاع بنوقینقاع تھے۔ آہن گری اور زرگری کے پیشے کے اعتبار سے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور سامانِ حرب اسلحہ وغیرہ بھی کافی تھا۔ غزوۂ بدر کے بعد سب سے پہلے ان کی طرف سے نقضِ عہد ہوا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی۔ حضور ﷺ نے فوراً اقدام فرمایا اور ان کو مدینہ بدر ہونا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ بڑی رعایت برتی‘ ان کو اپنا تمام ساز و سامان لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اونٹوں پر اپنا تمام اسباب لاد کر گاتے بجاتے ایک جشن کی صورت میں مدینہ سے نکلے۔ یہ پہلا معاملہ تو ۲ھ میں بدر کے بعد بنوقینقاع کے ساتھ ہو گیا۔ غزوۂ اُحد کے بعد یہی معاملہ بنونضیر کے ساتھ پیش آیا۔ اُحد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت سے ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور یہ قبیلہ دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس

نے خود نبی اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش تک کر ڈالی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس قبیلے کو بھی مدینہ بدر کر دیا اور یہ دونوں قبیلے خیبر کے آس پاس جا کر آباد ہو گئے' جہاں یہودی پہلے سے آباد تھے اور انہوں نے بڑی مضبوط قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں۔

اہلِ ایمان کے خلاف مشرکینِ عرب اور یہود کی مشترکہ سازشیں

ان دونوں قبیلوں کو اسلام اور حضور ﷺ سے دلی عداوت تو پہلے ہی سے تھی۔ مدینہ سے جلاوطنی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ قبیلے خیبر میں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف عرب کے مشرک قبائل کو بھڑکانے اور مدینہ پر چڑھائی کرنے پر اکسانے کے لیے مسلسل سازشیں کرتے رہے۔ ان کے سردار' ان کے شعراء اور ان کے خطیب مشرکین کے قبیلوں میں جا کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ چنانچہ ۵ھ میں غزوۂ احزاب میں ہر چہار سمت سے عرب کے مشرک قبائل نے مدینہ پر جو یلغار کی وہ انہی یہود کی سازش کا نتیجہ تھی اور اس یلغار کی نقشہ بندی میں بھی یہی یہودی پیش پیش تھے۔ اس موقع پر' جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' حملہ آور لشکریوں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اتنی بڑی جمعیت اس سے قبل کبھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ حملہ اچانک ہوتا تو سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہو سکتا تھا۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت کی برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ آپؐ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر دفاع کے لیے جبل اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ اسی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا' بقیہ سمتوں میں قدرتی رکاوٹیں موجود تھیں۔ کفار و مشرکین اس طریق دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرے کے لیے مجبور ہونا پڑا' جس کے لیے وہ تیار ہو کر اپنے ٹھکانوں سے نہیں آئے تھے۔

اب ان کے لیے ایک ہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ بنو قُریظہ کے یہودی قبیلے کو مدینہ منورہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ کرنے پر آمادہ کریں۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ طے تھا کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے

ساتھ مل کر مدافعت کریں گے لہٰذا اس طرف سے بے فکر ہو کر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس سمت میں دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا بلکہ اپنی عورتیں اور بچے بھی ان گڑھیوں میں بھجوا دیئے تھے جو بنو قریظہ کی جانب تھیں۔ کفار نے مسلمانوں کے دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا اور انہوں نے بنو قریظہ کے سرداروں کے پاس سفارت بھیج کر ان کو غدّاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اوّل تو وہ ہچکچائے کہ ہمارا محمد (ﷺ) سے معاہدہ ہے اور ہم کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ابتداء میں ان کا موقف یہی تھا' لیکن اس کے بعد حُیَیّ بن اَخطب نے ان کو مزید دلائل دیئے کہ ''دیکھو میں عرب کی متحدہ قوت کو محمدؐ پر چڑھا لایا ہوں' اسلام کو ختم کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اتنے بڑے لشکر آئندہ کبھی جمع نہیں ہو سکیں گے اور پھر ساری عمر ہم سب کو کفِ افسوس ملنا پڑے گا' کیونکہ پھر محمد (ﷺ) کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا''۔ ابن اخطب کی ان باتوں سے بنو قریظہ پر بھی معاہدے کی پاسداری اور اخلاقی اقدار کے لحاظ پر اسلام دشمنی غالب آ گئی اور وہ نقضِ عہد پر آمادہ ہو گئے۔

نبی اکرم ﷺ اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ آپ ﷺ کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ آپؐ نے انصار کے سرداروں میں سے حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نیز دو اور حضرات (رضی اللہ عنہم) کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا کہ جا کر تحقیق کر کے آئیں کہ صورتِ حال کیا ہے! ادھر خود اہلِ ایمان کے لشکر میں منافقین کا ففتھ کالمسٹ عنصر موجود تھا۔ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے خبریں پھیلا رہے تھے کہ اب بنو قریظہ کی جانب سے بھی حملہ ہوا چاہتا ہے' لہٰذا ہوش کے ناخن لو اور اپنے گھروں کی خبر لو جو جنوب مشرقی گوشے سے بنو قریظہ کی براہِ راست زد میں ہیں۔ آیت ۱۳ میں منافقین کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾ ''اے یثرب کے لوگو! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے' پس پلٹ چلو''۔ نبی اکرم ﷺ نے جن سرداروں کو بنی قریظہ سے گفت و شنید کے لیے بھیجا تھا' ان کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ بنو قریظہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو تم آ کر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان خوش

خبری دینا کہ یہ محض افواہ ہے' اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے' لیکن اگر وہ نقضِ عہد کا فیصلہ کر چکے ہیں تو صرف مجھے اشارۃً اس کی اطلاع دینا' عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا' کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے حوصلے مزید پست ہو جائیں۔ ان حضرات نے واپس آ کر حضور ﷺ کو اشارہ و کنایہ میں بنو قریظہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے کہ بنو قریظہ کے سرداروں نے ان انصار سے برملا کہہ دیا تھا کہ لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ ''ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔''

بنو قریظہ کی غداری اور نُعیمؓ بن مسعود کی حکمتِ عملی

غزوۂ احزاب میں سب سے زیادہ تشویشناک صورت بنو قریظہ کی اس غداری سے بنی تھی۔ اس لیے کہ نہ صرف اسلامی لشکر کا عقب محفوظ نہیں رہا تھا بلکہ وہ گڑھیاں اور مدینہ منورہ کا شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے جہاں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کی شاخ اشجع سے ایک صاحب نُعیم بن مسعودؓ مسلمان ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرے اسلام قبول کرنے کا ابھی کسی کو علم نہیں ہے' آپؐ اِس وقت جو چاہیں مجھ سے خدمت لے سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم جا کر ان اَحزاب اور بنو قریظہ میں پھوٹ ڈالنے اور عدم اعتماد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ وہ پہلے بنو قریظہ کے پاس گئے جہاں ان کا پہلے ہی سے آنا جانا تھا اور وہ وہاں متعارف تھے اور ان کے سرداروں سے کہا کہ ''قریش اور غطفان کے قبائل تو محاصرے کی طوالت سے تنگ آ کر بغیر لڑے بھڑے واپس بھی جا سکتے ہیں' ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا' لیکن تم کو یہیں رہنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں تمہارا کیا حشر ہوگا؟ اس کو بھی سوچ لو۔ میری رائے ہے کہ تم اُس وقت تک کوئی اقدام نہ کرنا جب تک باہر سے آئے ہوئے ان قبائل کے چند سربرآوردہ لوگ تمہارے پاس بطور یرغمال نہ ہوں''۔ بنو قریظہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یہ مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ''میں بنو قریظہ کے پاس

سے آ رہا ہوں' وہ کچھ متذبذب معلوم ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ تم سے یرغمال کے طور پر چند آدمی طلب کریں اور پھر انہیں محمد (ﷺ) کے حوالے کر کے ان کے ساتھ ازسرنو اپنا معاملہ استوار کر لیں' اس لیے ان کے ساتھ ہوشیاری سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ سردارانِ لشکر یہ بات سن کر ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے بنوقریظہ کو کہلا بھیجا کہ ہم اس طویل محاصرے سے تنگ آ گئے ہیں' اب ایک فیصلہ کن معرکہ ہونا ضروری ہے۔ کل تم اپنی سمت سے بھرپور حملہ کرو' ادھر سے ہم یکبارگی مسلمانوں پر یلغار کر دیں گے۔ بنوقریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک آپ اپنے چند چیدہ آدمی بطورِ یرغمال ہمارے حوالے نہیں کریں گے' ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ انہوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نُعَیم کی بات سچی تھی۔ نتیجتاً نُعَیم بن مسعودؓ کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور دشمنوں کے کیمپ میں بداعتمادی اور پھوٹ پڑ گئی۔

بنوقریظہ کے خلاف اقدام کا فیصلہ

بنوقریظہ نے اگرچہ عملاً غزوۂ احزاب میں کوئی حصہ نہیں لیا —— لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ فسخ کر چکے تھے اور انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ "لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ"۔ لہٰذا اب جب کہ غزوۂ احزاب اس معنی میں ختم ہوا کہ مشرکین عرب کے تمام لشکر محاذ چھوڑ کر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے تو نبی اکرم ﷺ اپنے ہتھیار اتار رہے تھے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جا کر بنوقریظہ کا محاصرہ فرمائیے"۔ چنانچہ اسی وقت حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز بنوقریظہ کی بستی میں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

اصحابُ الرّائے اور اصحابُ الحدیث کے مابین اختلاف کی حقیقت

اب یہاں ایک اہم بات بھی لگے ہاتھوں بیان کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں جو دو مکاتیب فکر ہیں' یعنی اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث' ان کے مابین اصل

اختلاف کیا ہے! وہ نوٹ کر لیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ معنی کیا تھے؟ یہ کہ جلد سے جلد پہنچو! اللہ کا حکم ہے' حضرت جبریلؑ نے آ کر بتایا ہے۔ پس جلد پہنچنے کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ عصر سے پہلے پہلے پہنچ جاؤ تا کہ ان کا معاملہ چکا دیا جائے۔ اب راستے میں صورت یہ پیش آ گئی کہ ایک ٹکڑی ابھی بنو قریظہ تک نہ پہنچ پائی تھی کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ لشکر مختلف ٹکڑیوں میں منزل کی جانب بڑھ رہا تھا' کئی میل کا سفر تھا۔ جس ٹکڑی کو راستہ ہی میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو نماز قضا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ ایک فریق نے کہا کہ حضورؐ کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہاں پہنچے بغیر عصر مت پڑھو' بلکہ منشا یہ تھا کہ ہم عصر سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ لیکن اگر کسی وجہ اور مجبوری سے درمیان ہی میں عصر کا وقت ہو گیا ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیے۔ لیکن دوسرے فریق نے کہا کہ نہیں' جو حضور ﷺ نے فرمایا ہے ہم تو اسی کے مطابق عمل کریں گے۔ حضور ﷺ نے تو ''منشا'' بیان نہیں فرمایا' لہٰذا ہم تو رسول اللہ ﷺ کے الفاظ کی پیروی کریں گے اور عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی تک پہنچنے سے قبل نہیں پڑھیں گے' چاہے نماز قضا ہو جائے۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کر لیا۔ جب حضور ﷺ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں نے صحیح عمل کیا۔

اب یہ ہے وہ حکمت جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہمیں تعلیم فرما گئے ہیں۔ لہٰذا خدارا بات کو کھلے دل سے سمجھئے اور خواہ مخواہ رائے' تعبیر اور اجتہاد کے اختلاف پر مستقل طور پر من دیگرم تو دیگری کا رویہ اختیار نہ کیجیے۔ یہ تفرقہ وحدتِ اُمت کے لیے سمِ قاتل ہے۔

ایک رویہ یہ ہے کہ حدیث کے جو الفاظ (letters) ہیں' ہم تو بالکل حرف بہ حرف' ہو بہو literally اُس پر عمل کریں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ علت کیا ہے' اور حکمت کیا ہے؟ وہ اللہ جانے اور اس کا رسولؐ جانے۔ اگر مسواک کا لفظ حدیث میں آیا ہے تو ہم تو مسواک ہی استعمال کریں گے۔ جبکہ دوسرا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ مسواک کرنے کی اصل غایت و علت دانت صاف رکھنا ہے' اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش سے دانت صاف کر لیے تو مقصد

پورا ہو گیا۔ اس طرح یہ دو مکاتیبِ فکر ہیں۔ ایک اصحابِ حدیث جو حدیث کے الفاظ کو جوں کا توں اختیار کرنے کو صحیح اور اقرب الی السنۃ سمجھتے ہیں اور اسی طرزِ عمل میں عافیت خیال کرتے ہیں۔ دوسرے اصحاب الرائے ہیں جو غور وتدبر کرتے ہیں کہ کسی حدیث کی اصل حکمت کیا ہے' اس کی غرض وغایت کیا ہے! نبی اکرم ﷺ نے دونوں قسم کے طرزِ عمل کی تصویب فرمائی ـــــ یہ اللہ کا شکر اور اس کا کرم وفضل ہے کہ اس معاملے میں اس نے اپنے رسول ﷺ سے دونوں طرزِ عمل کی تائید کرادی۔ اس لیے کہ دونوں کی نیت دراصل تعمیل حکم اور اتباع تھا۔ پس ہم کو بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ دونوں attitudes کے لیے اپنے دل میں کشادگی پیدا کریں۔ عمل تو ایک ہی پر ہو گا' اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یا آپ الفاظِ ظاہر پر عمل کریں گے یا اس کی حکمت وعلت معلوم کر کے اسے اختیار کریں گے۔ اجتہاد کی بنیاد بھی تو یہی ہے کہ اہلِ علم احکامِ شرعیہ کی علت تلاش کریں اور دیکھیں کہ درپیش مسئلہ میں علت کس درجہ کی مشترک ہے' اسی کے مطابق قیاس کر کے مسئلہ کا حل نکال لیا جائے ـــــ تو یہ طریق تھا اصحابِ فقہ کا' جن کو اصحاب الرائے بھی کہا گیا ہے اور اوّل الذکر طریقہ تھا اصحابِ حدیث کا۔ لیکن حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے دونوں مسلک حق ہیں' اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ میں دونوں فریقوں کی تصویب فرمائی۔ یہ واقعہ اسی غزوہ کے دوران پیش آیا تھا تو میں نے چاہا کہ اسے بھی آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر واقعہ میں ہمارے لیے رہنمائی ہے اور یہی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے اکمل واتم ہونے کی دلیل ہے ـــــ بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی جو درمیان میں آگئی۔ اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیجیے۔

بنوقریظہ کا محاصرہ

بنوقریظہ کی گڑھیوں پر سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بطور مقدمۃ الجیش پہنچا۔ بنوقریظہ یہ سمجھے کہ یہ ہمیں محض دھمکانے آئے ہیں۔ وہ اُس وقت تک تو بڑے طنطنے میں تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی اکرم ﷺ اور

مسلمانوں کی شان میں گستاخیوں کی بوچھاڑ کردی۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں پورے اسلامی لشکر نے وہاں پہنچ کر ان کی بستی کا محاصرہ کرلیا تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ انہوں نے عین آڑے وقت اور پرخطر حالات میں معاہدہ توڑ ڈالا تھا اور مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت خیز خطرے میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے پشت سے خنجر گھونپنے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ یہ تو حضرت نُعیم کی جنگی چال اور حکمت عملی تھی، جس سے وہ مات کھا گئے۔ ان کا جرم کسی طور پر بھی قابلِ عفو نہیں تھا اور ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے تھی۔

جب محاصرے کی شدت، جو دو تین ہفتے جاری رہی، ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تو انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ قبیلۂ اَوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حَکَم بنایا جائے، وہ ان کے متعلق جو بھی فیصلہ کریں وہ فریقین تسلیم کرلیں۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس توقع پر حَکَم بنانے کی تجویز رکھی تھی کہ اَوس اور بنوقریظہ کے مابین مدتوں سے حلیفانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ ان کو امید تھی کہ وہ ان کا لحاظ کریں گے اور بنوقینقاع اور بنونضیر کی طرح ان کو بھی اپنے ساز و سامان اور مال و اسباب کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکل جانے کا فیصلہ کریں گے۔ حضرت سعدؓ کو خندق میں دشمنوں کا ایک تیر لگ گیا تھا اور وہ شدید زخمی تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے علاج معالجہ کے لیے مسجد نبویؐ میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا۔ حضور ﷺ خود ان کی تیمارداری فرما رہے تھے اور آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ان کے زخم کو داغا تھا۔ حضور ﷺ کو حضرت سعدؓ سے بہت محبت تھی۔ انصار میں دو سعد تھے۔ ایک سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے رئیس تھے اور دوسرے سعدؓ بن عبادہ جو قبیلۂ خزرج کے رئیس تھے۔ خود حضرت سعدؓ بن معاذ کو بھی نبی اکرم ﷺ سے انتہائی محبت تھی۔ ان کی بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح فدویت کی کیفیت تھی۔

حضرت سعدؓ بن معاذ کا تورات کے مطابق فیصلہ

حضرت سعدؓ بن معاذ ایک ڈولی میں بنوقریظہ کی بستی میں لائے گئے۔ حضرت سعدؓ

نے جو فیصلہ کیا وہ عین یہود کی شریعت کے مطابق تھا' کہ بنوقریظہ کے تمام جنگ کے قابل مَردوں کو قتل کر دیا جائے' عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے میں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ حضرت سعدؓ اس غزوہ میں دیکھ چکے تھے کہ بنوقینقاع اور بنونضیر کو مدینہ سے نکل جانے دیا گیا تو وہ گرد وپیش کے سارے قبائل کو بھڑکا کر قریش کی سرکردگی میں تقریباً بارہ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے۔ چنانچہ حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہوا ہے جو بنوقریظہ کے ساتھ ہوا۔ اگر یہ نبی اکرم ﷺ کو حَکم تسلیم کر لیتے جو انتہائی رؤف اور رحیم تھے تو وہ شاید اس انجامِ بد سے بچ جاتے' لیکن مشیتِ الٰہی یہی تھی' اس لیے ان کی مَت ماری گئی اور انہوں نے حضور ﷺ پر عدم اعتماد کیا —— جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' حضرت سعدؓ بن معاذ نے یہ فیصلہ عین تورات کے مطابق کیا تھا۔ بنوقریظہ اسی انجام کے مستوجب تھے' کیونکہ انہوں نے اس وقت جبکہ مسلمانوں کے لیے انتہائی کٹھن وقت تھا' عقب سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمان بنوقریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو اِن کو پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غداروں نے پندرہ سو تلواریں' تین سو زرہیں' دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید شاملِ حال نہ ہوتی تو ایک طرف مشرکین یکبارگی خندق عبور کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے اور دوسری طرف یہ سارا جنگی سامان عین عقب سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے بنوقریظہ استعمال کرتے۔

غزوۂ بنوقریظہ پر قرآن کا تبصرہ

زیرِ درس رکوع کی بقیہ دو آیات کا تعلق اسی بنوقریظہ کے واقعہ سے ہے' اس لیے میں نے قدرے تفصیل سے صورتِ حال واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو ان آیات کے پس منظر سے براہِ راست متعلق ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کیجیے۔ فرمایا:

﴿وَاَنۡزَلَ الَّذِیۡنَ ظَاهَرُوۡهُمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مِنۡ صَیَاصِیۡهِمۡ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَتَاۡسِرُوۡنَ فَرِیۡقًا ﴿۲۶﴾﴾

''اور اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا (یعنی بنو قریظہ) تو اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے کو قید کر رہے ہو۔''

بنو قریظہ پہلے تو محاصرے کی حالت میں اپنے قلعوں پر چڑھے رہے لیکن دو تین ہفتوں سے زیادہ سہار نہ سکے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار لایا۔ یہاں ظَاهَرُوْهُمْ کا لفظ قابل توجہ ہے۔ اس کی اصل ظَهَرَ ہے۔ باب مفاعلہ میں اس سے مُظَاهِرَة بنتا ہے۔ ظهر پیٹھ کو کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں آخری مقابلہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ہوتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی سی نفری کسی بڑی نفری کے گھیرے میں آ جاتی تھی تو چھوٹی نفری والے باہم پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا مفہوم ہوگا کسی مقصد کے غلبہ کے لیے یک جان ہو کر کام کرنا —— اس لیے میں نے اس آیت کی ترجمانی میں ''حملہ آوروں کا ساتھ دینا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ''صِیْصٌ'' کی لغوی بحث کو بھی سمجھ لیجیے۔ صِیْصٌ مرغ کے پنجے کو کہتے ہیں' اس کی جمع ''صَیَاصِی'' ہے۔ چونکہ مرغ اپنے پنجوں سے دفاع کرتا ہے' لہٰذا عرب اس لفظ کو استعارتاً دفاعی قلعوں اور گڑھیوں کے لیے استعمال کرنے لگے —— بنو قریظہ نہ تو حملہ آوروں کا ساتھ دے سکے اور نہ ان کے قلعے ان کو پناہ دے سکے اور وہ ان سے نیچے اترنے اور باہر نکل کر خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ غور کیجیے کہ اگر وہ ڈٹ کر لڑنے کا فیصلہ کرتے تو ان کے جو چھ سات سو مرد قتل ہوئے تھے' یہ سو دو سو مسلمانوں کو بھی شہید کر سکتے تھے۔ انہوں نے جو ساز و سامان جمع کر رکھا تھا' اس کی تفصیل میں بیان کر چکا ہوں' لیکن اسلحہ استعمال کرنے کے لیے ہمت اور جوش و ولولہ درکار ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کو ''وَهْن'' کی بیماری لگ جاتی ہے' یعنی حُبِّ دُنیا اور موت کا خوف' تو یہ حال بھی ہوتا ہے کہ میزائل تک دھرے رہ جاتے ہیں اور فوج کو اُن کے بٹن دبانے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ جان بچانے کے لیے اپنی

جوتیاں چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ یہ معاملہ کئی مواقع پر مسلمانوں کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ صحرائے سینا سے مصری فوج اسرائیل کے حملے کے وقت بھاگ گئی تھی۔ اسی طرح فتنہ تاتار کے دور میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ بغداد کے بازاروں میں سو مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور ایک تاتاری آ کر اُن سے کہتا تھا کہ میرے پاس اس وقت تلوار نہیں ہے' میں یہ لے کر آتا ہوں' خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے ـــــ اور وہ تلوار لے کر آتا تھا اور ایک ایک کی گردن مارتا تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بنو قریظہ میں جرأت و ہمت ہوتی تو حضرت سعدؓ کے فیصلے کے بعد بھی یہ کر سکتے تھے کہ یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں کہ ہمیں تو مرنا ہی ہے' سو پچاس کو ساتھ لے کر مریں گے' لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ ان کے مرد قتل کیے گئے اور ان کی عورتیں' بچے اور بچیاں غلام اور لونڈیاں بنائی گئیں۔

اس پوری صورت حال پر صرف ایک آیت میں تبصرہ فرما دیا گیا:

﴿وَاَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَہُمۡ وَدِیَارَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡہَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا ﴿۲۷﴾﴾

''اور اللہ نے تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دے دیا جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

بنو قریظہ ایک بڑا یہودی قبیلہ تھا' بہت مالدار اور سرمایہ دار ـــــ ان کے بڑے بڑے باغات اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں' بے شمار مال و متاع تھا ـــــ یہ پورا علاقہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بغیر لڑے بھڑے عطا کر دیا۔ جنگ تو ہوئی ہی نہیں۔ صرف محاصرے کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہاتھ آ گیا۔ اس زمین پر گھوڑے دوڑے ہی نہیں کہ وہ پامال ہوتی۔

اس رکوع کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا ﴿۲۷﴾﴾ اور واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کا اس سے جامع اختتام ممکن ہی نہیں تھا۔ غزوۂ احزاب کی پوری صورتِ واقعہ اور بنو قریظہ کا خاتمہ' یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ

کی شان کے مظاہر ہی تو تھے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○﴾ ''اللہ غالب ہے' وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔'' اگر لوگوں کو یہ یقین قلبی ہو جائے تو اسی سے مانگیں' اسی سے جڑیں' اسی کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔ انہیں تو اُن وسائل اور اسباب پر یقین و توکّل ہوتا ہے جو ان کی دسترس میں ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ))(۱)

''دنیا میں زہد اس چیز کا نام نہیں ہے کہ تم حلال کو اپنے اوپر حرام کر لو اور مال کو ضائع کرو' بلکہ دراصل زہد یہ ہے کہ اللہ پر تمہارا اعتماد و توکّل اس سے زیادہ ہو جو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے''۔

اگر تم اپنے وسائل' اپنے ذرائع' اپنی صلاحیتوں' اپنی ذہانت اور اپنی قوت کو مقدم رکھو گے اور ان پر تکیہ کرو گے تو تم کو زہد چھو کر بھی نہیں گیا۔ لیکن اگر تم کو اللہ کی توفیق' اللہ کی تائید' اللہ کی نصرت اور اللہ کی قدرت پر ہی اعتماد و توکّل اور بھروسہ ہو جائے تو یہ اصل زہد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ہم نے آج اس رکوع کا مطالعہ ختم کر لیا۔ جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ ہم اس رکوع کے مطالعہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں آپؐ کے اُس ''اسوۂ حسنہ'' کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے جو غزوۂ احزاب کے پس منظر میں اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔ پورے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' کا تذکرہ اسی ایک مقام پر کیا گیا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر تو نبی اکرم ﷺ پر خود آپؐ کے ارشاد کے مطابق سب سے سخت دن ''یومِ طائف'' گزرا ہے' لیکن بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر سب سے زیادہ ابتلاء و آزمائش کا مرحلہ یہ غزوۂ احزاب ہے' جس میں جانی نقصان تو اگرچہ بہت کم ہوا لیکن اس محاصرے کے دوران' جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کو جن شدائد و مصائب اور تکالیف سے سابقہ پیش

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزهد' باب ما جاء فی الزهادة فی الدنیا۔

آیا ان کو بجا طور پر ابتلاء کا نقطہ عروج کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ دی ہے: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا﴾

آج کا یہ درس ان لوگوں کے لیے انتہائی سبق آموز ہے جو بفضلہٖ تعالیٰ شعوری طور پر یہ بات جان چکے ہیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ، اظہارِ دینِ الحق اور اقامتِ دین، نبی اکرم ﷺ کے ہر اُمتی پر فرض ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی تقریر میں حضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے مختلف پہلو اُجاگر کروں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

أَقُولُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی روشنی میں

ہماری دینی ذمہ داریاں

احمدہ واُصلی علی رسولہ الکریم ـــــ اما بعد

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾﴾ (الاحزاب) صدق اللہ العظیم

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی!

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کے درس کی تکمیل کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اس نشست میں آپ نبی اکرم ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' کے بارے میں چند اور باتیں سلسلہ وار ایک' دو' تین کی طرح نوٹ کرلیں اور اپنے ذہن میں بٹھالیں۔

نبی اکرم ﷺ کی اجتماعی جِدّوجُہد کی نوعیت

میں دورانِ درس یہ عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ہر ایک اعتبار سے اسوہ ہے۔ ''اُسوہ'' کا اصل مفہوم اتباع اور پیروی ہے۔ لیکن سورۃ الاحزاب کے درس کے دوران آنحضور ﷺ کا جو اُسوہ ہمارے سامنے آتا ہے' اس کو پیش نظر رکھے اور پہلے ایک سوال کا جواب آپ خود اپنے طور پر دینے کی کوشش کیجیے کہ آنحضور ﷺ کی جو اجتماعی جدو جہد ہے' وہ کیا ہے؟

آنحضور ﷺ کے بعض کام خالص انفرادی ہیں اور وہ ایسے بھی ہیں کہ ہم ان کا

اتباع نہیں کر سکتے ___ مثلاً نبی اکرم ﷺ صومِ وصال رکھتے تھے۔ یعنی آپ بغیر افطار کے ایک کے بعد دوسرا' پھر تیسرا روزہ' بلکہ اس سے بھی زیادہ رکھا کرتے تھے' لیکن آپ نے اُمت کو اس سے روک دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا بھی کہ آپ ہمیں کیوں منع فرماتے ہیں؟ ___ جواب میں ارشاد ہوا: ((وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ؟)) ''تم میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہو؟'' ((اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ))(۱) ''میں تو اس حال میں رات بسر کرتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔ معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ کی انفرادی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہو سکتے ہیں جن کے لیے ہم اتباع کے مکلف نہیں ہیں ___ وہ خصوصیات ہیں جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ___ حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے۔ اس اعتبار سے اوّلیت جس اسوہ کو حاصل ہے' وہ اُسوہ آپ کی اجتماعی زندگی کا نقشہ ہے۔ اس کا ہر ہر قدم واجب الاتباع ہے۔ اسی اعتبار سے یہ فرمایا گیا ہے کہ: ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ ___ اس لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں یہ سوال لائیے کہ نبی اکرم ﷺ کی جو اجتماعی جدوجہد ہے' وہ کس نوعیت کے کام سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے! مثلاً ایک نوعیت ہوتی ہے رفاہِ عامہ کے کاموں کی ___ لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ پھر خدمتِ خلق کے بے شمار میدان ہیں' جن کے لیے انجمنیں بنتی ہیں' ادارے وجود میں آتے ہیں۔

دوسرے کچھ محدود پیمانے کے تبلیغی کام ہوتے ہیں۔ دنیا میں بے شمار مشنریز (Missionaries) ہیں جو تبلیغ کے کام میں مصروف ہیں۔ یہودیوں کی تبلیغ ہے' عیسائیوں کی تبلیغ ہے۔ بدھ مت کے بھکشو ہیں جو تبلیغ کرتے ہیں۔ آریہ سماجی بھی یہ کام کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک اجتماعی نوعیت کا کام ہے۔ یہ وہ تبلیغ ہے جس میں تلوار کبھی ہاتھ میں نظر نہیں آئے گی ___ اس تبلیغ کا معاملہ کبھی جہاد و قتال تک نہیں جائے گا۔ وہ ساری عمر

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔

تبلیغ ہی رہے گی اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

ذہن میں تیسرا خانہ بنایئے تعلیمی اور تحقیقی کام کا —— اس کے لیے بھی انجمنیں بنتی ہیں' ادارے بنتے ہیں —— تعلیم کو عام کرنے کی عملی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ مکتب' اسکول' کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوتی ہیں۔ ریسرچ کے لیے ادارے اور فاؤنڈیشنز قائم ہوتی ہیں جن کے تحت یہ کام ہوتا ہے۔ کسی خاص فکر کو پھیلانے اور promote کرنے کے لیے اکیڈمیاں بنتی ہیں' جیسے ''اقبال اکیڈمی'' جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فکر کو پھیلانے کے کام میں مصروف ہے۔ سقراط نے بھی ایک اکیڈمی بنائی تھی' جس میں وہ اپنے فکر کے مطابق کچھ ذہین لوگوں کو تیار کرتا تھا۔

چوتھا کام سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھی جماعتیں' جمعیتیں اور پارٹیاں بنتی ہیں' تحریکیں اٹھتی ہیں' سیاسی میدان میں کام ہوتا ہے' الیکشن ہوتے ہیں۔ اس سیاسی کام کی اصل نوعیت عموماً یہ ہوتی ہے کہ جس جگہ جو نظام قائم ہوتا ہے اصولی اعتبار سے اُس سے اختلاف نہیں ہوتا۔ صرف تفصیلات میں اور انتظامی اعتبارات سے ایک جماعت کا منشور (Manifesto) کچھ اور ہوتا ہے اور دوسری جماعت کا کچھ اور۔ مثلاً امریکہ میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن پارٹیاں ہیں' انگلینڈ میں لیبر پارٹی' کنزرویٹو پارٹی اور لبرل پارٹی ہے' تو امریکہ یا انگلستان میں جو بنیادی دستور موجود ہے اور جو نظام رائج ہے یعنی جمہوریت کا نظام' وہ سب پارٹیوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جا کر چند پالیسیوں کے بارے میں اختلافات ہوتے ہیں اور اس ضمن میں پارٹیوں کے منشور اختلافات کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر پارٹی اس اعلان کے ساتھ الیکشن کے میدان میں اترتی ہے کہ اگر ہمیں زیادہ ووٹ ملیں گے اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو ہم یہ اور یہ کام کریں گے جس سے ملک اور عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ ہوتی ہے سیاسی کام کی حقیقی نوعیت۔

اسی طرح کئی دیگر نوعیتوں کے کام بھی ہو سکتے ہیں' لیکن آپ ان چار انواع کے کاموں کو ذہن میں رکھ کر اب پانچویں نوعیت کے کام پر غور کیجیے' اور وہ ہے انقلابی

کام ـــــ انقلاب یہ ہوتا ہے کہ کسی جگہ پر جو نظام قائم ہے اس کو جڑ سے اکھیڑنا ہے' بنیادی تبدیلی لانی ہے اور پورے نقشے کو بدلنا ہے ۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
تو می دانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند!

یہ انقلابی کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ رائج الوقت نظام کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ دوسرا نظام نہ لایا جائے۔

اب ان پانچ انواع کے کاموں کو ذہن میں بٹھا لیجیے: ۱۔ رفاہی کام' ۲۔ تبلیغی کام' ۳۔ تعلیمی' علمی اور تحقیقی کام' ۴۔ سیاسی کام' اور ۵۔ انقلابی کام ـــــ ان میں سے ہر ایک کے اپنے تقاضے اور اپنی connotations ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کا نقشہ جدا بنے گا' ہر ایک کے لوازم جدا ہوں گے۔

اب آپ میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ان پانچ کاموں میں سے کس کام سے مشابہت رکھتا ہے؟

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ وہ انقلابی کام ہے؟ یعنی نظام کی تبدیلی اور وہ بھی جزوی نہیں' بلکہ پورے نظام کی تبدیلی۔ وہ صرف تبلیغی کام نہیں تھا' صرف علمی کام نہیں تھا' صرف سیاسی کام نہیں تھا' صرف رفاہی کام نہیں تھا ـــــ بلکہ اجتماعی پیمانے پر رفاہی کام تو ہمیں نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے درمیان نظر ہی نہیں آتے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں اجرائے وحی سے قبل بالکل انفرادی سطح پر خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ کا کام اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے' لیکن نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضور ﷺ کی پوری زندگی ایک انقلابی جدوجہد کا نقشہ پیش کرتی ہے ـــــ جزوی نہیں' بلکہ مکمل انقلابی جدوجہد ـــ گویا ؏

نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!

سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر اپنی متعدد تقاریر میں مَیں اس انقلابی جدوجہد کے نقشے کو اپنی امکانی حد تک بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اس موقع پر میں چاہوں گا کہ

اختصار کے ساتھ اس جدوجہد کے اہم خصائص اور اصول ومبادی آپ کے سامنے اس طرح پیش کروں کہ آپ ان کو ترتیب وار ذہن نشین کرلیں۔

آنحضورﷺ کی انقلابی جدّوجُہد کے مراحل

اس انقلابی جدوجہد کے ضمن میں آپ کو سیرتِ مطہرہ میں سب سے اوّل اور نمایاں چیز یہ نظر آئے گی کہ یہ ساری جدوجہد خالص انسانی سطح (human level) پر کی گئی ہے۔ کسی بھی انقلاب میں جو مراحل آتے ہیں' وہ سب کے سب انقلابِ محمدیؐ میں بھی آئے ہر انقلابی دعوت کو تین مراحل سے لازماً سابقہ پیش آتا ہے:

پہلا مرحلہ ہے ''دعوت وتربیت''۔ خالص دینی اصطلاحات کے اعتبار سے یہ بات اس طرح کہی جائے گی کہ ''دعوتِ ایمان اور تزکیہ''۔ یعنی لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا اور قبول کرنے والوں کا تزکیہ کرنا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۱) عام دُنیوی لحاظ سے اس کی تشریح یوں ہوگی کہ کوئی انقلابی فکر' کوئی نظریہ' کوئی فلسفہ اور کوئی نقطۂ نظر ہوگا' اس کو پہلے پھیلایا جائے گا۔ جو اس دعوت کو قبول کریں گے تو اس دعوت کے اعتبار سے پھر ان کی تربیت کی جائے گی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو!

پختہ ہوئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ البتہ واضح رہے کہ انقلابی کارکنوں کی تربیت دعوت کے لحاظ سے ہوگی —— مثلاً جو لوگ کمیونزم کے نظریئے کو قبول کرلیں گے' ان کی تربیت کے لیے کوئی اور نظام ہوگا —— اس میں یہ نہیں ہوگا کہ نماز پڑھو' روزہ رکھو' زکوٰۃ ادا کرو' حج کرو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات واحکام کے تابع رکھو۔ نہ اس میں یہ ہوگا کہ اپنی نظر اور دل کو پاک صاف رکھو۔ کھلی آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہو اپنی تسکین ہوس کا سامان کرلو۔ جاؤ عیش کرو' شادی کا کیا سوال ہے' اس کے بغیر بھی جنسی ضرورت کو کامریڈ مرد اور کامریڈ عورتیں مل جل کر پوری کریں۔ ان کی

تربیت میں طبقاتی نفرت وعداوت پیدا کی جائے گی۔ مزدور اور سرمایہ دار کا امتیاز اُجاگر کر کے ان کو آپس میں لڑانے کی سبیل پیدا کی جائے گی۔ ان کو تخریب کاری کی ٹریننگ دی جائے گی۔ تربیت کا نظام ہر انقلابی دعوت میں ہوتا ہے لیکن اس کا حدود اربعہ مختلف ہوتا ہے' اس کے صُغریٰ کُبریٰ اور متعلقات جدا ہوتے ہیں۔ وہ اس نقطہ نظر کے مطابق ہوں گے کہ اصل کام کیا کرنا ہے اور کون سا انقلاب لانا پیش نظر ہے۔ سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت وہ گی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اسلامی انقلاب لانا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت دوسرے انقلابات کی تربیت کے معاملے میں بالکل جداگانہ نوعیت کی ہوگی۔ اس میں اللہ پر' توحید کے التزام اور شرک سے اجتناب کے ساتھ' ایمان لانا ہوگا۔ اس میں یوم آخرت پر' اس کی کُل جزئیات کے ساتھ' ایمان لانا ہوگا۔ اس میں رسالت پر' اطاعت ومحبتِ کُلی کے ساتھ' ایمان لانا ہوگا —— بہرحال ''دعوت اور تربیت'' ان دونوں الفاظ کو ایک جوڑے کی حیثیت سے بریکٹ کر لیجیے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی یہ دونوں کام کیے اور بھرپور طریقے پر کیے۔

دوسرا مرحلہ ہے ''تنظیم'' —— اور اسی کے ساتھ جڑا ہوا لفظ ہے ''ہجرت'' —— یعنی آپس میں جڑو اور دوسروں سے کٹو۔ اگر کسی سے کٹو گے تو کسی سے جڑو گے بھی —— جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے جڑو گے تو ظاہر ہے کہ اپنے گھر والوں سے کٹو گے۔ سیدھی سادھی بات ہے' اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ یہاں یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ دونوں رشتے ساتھ چل سکیں۔ یہاں credit ہوگا تو debit بھی ہوگا۔ اگر کسی سے کٹنے کو تیار نہیں تو پھر کسی اور سے جڑ بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ آپ ان دو الفاظ ''تنظیم'' اور ''ہجرت'' کو اپنے ذہن میں یکجا کر لیجیے۔

تیسرا مرحلہ ہے جہاد اور قتال —— جہاد کو میں یہاں Passive Resistance کے معنی میں لے رہا ہوں۔ جدوجہد ہے' دعوت وتبلیغ ہے' مشرکانہ عقائد پر تنقید ہے۔ اس کے ردِّعمل میں مشرکین کی طرف سے جوروستم ہے' ایذا رسانی ہے' تعدی ہے' مصائب ہیں —— لیکن ابھی ہاتھ نہیں اٹھ رہا۔ حکم ہے کہ ماریں کھاؤ مگر مدافعت میں بھی اپنا ہاتھ نہ

اٹھاؤ۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے تو بھی برداشت کرو اور جھیلو۔ تمہیں تپتی ہوئی زمین پر اس حال میں لٹا دیا جائے کہ اوپر سے مکہ جیسے گرم علاقے کا سورج آگ برسا رہا ہو' پھر تمہارے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جائے' تمہاری ٹانگوں میں رسی باندھ کر کھینچا جائے' تو بھی جھیلو اور برداشت کرو' retaliate نہیں کر سکتے۔ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ایسے حالات میں اگر آدمی desperate ہو جائے' اپنی جان سے ناامید ہو کر مشتعل ہو جائے تو ایک آدمی دس کو مار کر مرے گا۔ لیکن نہیں! —— کیا حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کسی کو نہ مار سکتے تھے جب ان کی نگاہوں کے سامنے ان کی اہلیہ محترمہ سُمیہ (رضی اللہ عنہا) کو ابوجہل نے اس طرح برچھی ماری کہ پشت کے پار ہو گئی! پھر وہ خود یعنی حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کس طرح مظلومانہ اور بہیمانہ طور پر شہید ہو گئے' لیکن اُف تک نہ کی —— اس لیے کہ ایمان لانے کی وجہ سے اس خاندان پر ظلم وستم کے پہاڑ بہت پہلے سے توڑے جا رہے تھے اور جب کسی ایسے موقع پر نبی اکرم ﷺ کا گزر ہوتا تو آپؐ فرماتے: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ ''اے یاسرؓ کے گھر والو! صبر کرو' تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔'' گویا انہیں شہادت اور جنت کی خوشخبری پیشگی دے دی گئی تھی —— حضرت خُباب بن ارت رضی اللہ عنہ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ اوپر نگرانی کے لیے آدمی کھڑا ہوا ہے۔ حکم ہے جھیلو! پیٹھ کی چربی پگھلتی ہے اور آگ سرد پڑ جاتی ہے۔

پھر خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اَقدسؐ پر کیا کچھ ستم روا نہیں رکھا گیا۔ آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں جس سے آپ کے پاؤں مبارک زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ کام رات کے اندھیرے میں کیا جاتا ہے' کیونکہ آپؐ علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں نماز کے لیے باہر نکلا کرتے تھے۔ آپؐ کے مکان میں گندگی پھینکنے کو معمول بنا لیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں کام کرنے والے کون ہوتے ہیں! —— آپؐ کے پڑوسی اور رشتے میں آپؐ کے سگے چچا اور چچی یعنی ابولہب اور اُس کی بیوی اُمِّ جمیل —— چادر گردن میں ڈال کر اسے اس طرح بل دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں اُبل پڑتی ہیں —— سجدے کی حالت میں رحمۃ للعالمین ﷺ کے مقدس کاندھوں پر اونٹ کی نجاست بھری اوجھری رکھ دی

جاتی ہے۔ تمسخر، استہزاء، طعن و تشنیع اور فقرے چست کرنا روز کا معمول بن جاتا ہے۔ قلب مبارک پر جو بیتتی ہوگی، وہ بیتتی ہوگی، مؤمنین صادقین کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی کہ ان کے پیارے اور محبوب رسول اللہ ﷺ پر کتنے مصائب ڈھائے اور ستم توڑے جارہے ہیں! مگر وہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ کو حکم تھا کہ جھیلو، برداشت کرو، صبر کرو ـــــ اور آپ ﷺ کی وساطت سے یہی حکم تمام اہل ایمان کے لیے تھا۔

اس سے اگلا مرحلہ قتال کا ہے۔ جب دعوت منظم ہو جاتی ہے اور یثرب کو دارالہجرۃ بننے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ مدینۃ النبیؐ بن جاتا ہے اور مسلمان بالفعل ہجرت یعنی ترکِ وطن کر کے وہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ایک Base مہیا ہو جاتی ہے اور ایک چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست قائم ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر قتال کا مرحلہ آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں بایں الفاظ قتال کی اجازت مل جاتی ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿۳۹﴾﴾

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔''

سورۃ النساء میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جب ان سے کہا گیا تھا کہ ﴿کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ﴾ ''اپنے ہاتھ بندھے رکھو'' تو کہتے تھے کہ ہمیں بھی جنگ کی اجازت ہونی چاہیے، ہم بھی لڑیں، ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ اب جبکہ لڑائی کا حکم آگیا ہے تو لڑائی بڑی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ تو وہاں یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

﴿ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَخۡشَوۡنَ النَّاسَ کَخَشۡیَۃِ اللّٰہِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡیَۃً ۚ﴾ (آیت ۷۷)

''اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں ایک فریق ایسا بھی ہے کہ (جس کا دل ڈول رہا ہے اور) وہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہا ہے کہ جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔''

کسی انقلابی دعوت کے مذکورہ بالا تین مراحل ہوتے ہیں۔ مرحلے تین ہیں لیکن الفاظ چھ ہیں۔ گویا ہر مرحلے کے دو پہلو ہوتے ہیں ـــــ پہلا مرحلہ ہے دعوت و تربیت۔

دوسرا مرحلہ ہے تنظیم و ہجرت اور تیسرا اور آخری مرحلہ ہے جہاد و قتال۔ ان مراحل سے گزرے بغیر دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں آیا ہے ـــــ عیسائی طرز کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔ تبلیغ کا کام آپ بھی کیجیے' کرتے چلے جائیے۔ اس سے اگلا مرحلہ نہیں آئے گا۔ وہی کام نسلاً بعد نسلٍ ہوتا رہے گا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا کام اگر آپ دیکھیں گے تو وہ نہ رفاہی کام ہے' نہ تبلیغی کام' نہ تعلیمی و علمی کام ـــــ یہ سارے کام اس انقلابی کام میں جزو کی حیثیت سے تو شامل ہیں' لیکن کُل کام خالصتاً انقلابی کام کے مشابہ ہے ـــــ پھر یہ انقلابی جدوجہد مکمل اور بھرپور انقلابی جدوجہد ہے۔ نیز یہ پوری انقلابی جدوجہد انسانی سطح (Human Level) پر ہوئی ہے۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار!

تین سال کی قید شعب بنی ہاشم ہے ـــــ جس میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ گھاٹی کی جھاڑیوں کے پتے سب کے سب کھا لیے گئے تھے اور بھوک اور پیاس کے مارے بنی ہاشم کے بچوں کی زبانیں خشک ہو گئی تھیں' جن کو تر رکھنے کے لیے سوکھے چمڑے ابال ابال کر ان کے حلق میں بوندیں ٹپکائی جاتی تھیں۔ بنی ہاشم کا پورا قبیلہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہی اس گھاٹی میں قید کر دیا گیا تھا ـــــ اور ع ''رسوا سرِ بازارے آں شوخ ستمگارے'' کا نقشہ دیکھنا ہو تو وہ یوم طائف دیکھ لیجیے کہ جہاں ایک دن میں وہ کچھ بیت گیا جو مکہ میں دس سال میں نہیں بیتا تھا۔ طائف کے سرداروں نے دعوتِ حق اور دعوتِ توحید کو حقارت اور استہزاء کے انداز میں ٹھکرا دیا اور آپ ﷺ سے جو کچھ انہوں نے کہا اس کو سننے کے لیے بھی بڑے جگرے کی ضرورت ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد ـــــ ایک سردار نے کہا کہ ''اللہ کو تم جیسے مفلس و قلاش کے سوا رسول بنانے کے لیے کوئی اور نہیں ملا؟ اس طرح تو وہ گویا خود کعبے کے غلاف کو چاک کر رہا ہے''۔ ایک سردار نے کہا کہ ''میں تم سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں' اس لیے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور عذابِ الٰہی کا

نوالہ بن جاؤں' اور اگر تم جھوٹے ہو تو کسی جھوٹے سے کلام کرنا میری شان کے خلاف ہے"۔ ایسے ہی اور جملے ان سرداروں میں سے ہر ایک نے کہے۔ پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب نبی اکرم ﷺ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو کچھ غنڈوں کو اشارہ کر دیا۔ اوباش لوگ آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر وہ نقشہ جما ہے کہ جس پر آسمان و زمین لرز گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ ان اوباشوں نے محبوبِ ربّ العالمین سیّد الاولین و الآخرین ﷺ پر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے' تالیاں پیٹی جا رہی ہیں۔ حضور ﷺ کا جسدِ اطہر لہولہان ہو گیا ہے۔ نعلین شریف خون سے بھر گئی ہیں اور پیر جم گئے ہیں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ ضعف کے مارے ذرا بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آپ کو کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا یہ نقطہ عروج (climax) ہے۔ شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے' سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

"اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی ــــ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی۔"

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟

"اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟"

اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ!

"پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں' مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔" (ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!)

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

"اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات

بھی منور ہو جاتے ہیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یومِ اُحد کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ ''یارسول اللہ! کیا اس سے زیادہ سخت دن بھی آپؐ کی زندگی میں آیا ہے؟'' تو آپؐ نے جواب میں فرمایا تھا: ''ہاں! یومِ طائف میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن تھا'' یہ تمام مصائب و مشکلات کے ادوار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی آئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی اس میں ایک نکتے کی بات ہے' اس پر غور کیجیے۔ وہ یہ کہ ہمارا صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدُ ولدِ آدم اور محبوبِ ربّ العالمین ہیں۔ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو اپنی انقلابی جدوجہد میں بدترین مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں کو جوڑیے۔ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھا کہ انقلاب بھی آ جاتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کانٹا بھی نہ چبھتا؟ یہ ہو سکتا تھا' لیکن ہوا نہیں! سوچئے کیوں نہیں ہوا؟

> اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو مجھ پر اور آپ پر حجت قائم نہ ہوتی۔ انقلاب صرف عرب میں لانا مقصود نہیں تھا' اسے پوری دنیا میں لانا تھا اور وہ انسانوں کے ہاتھوں آنا تھا۔ معجزے تو رسولوں کے لیے ہیں' عام انسانوں کے لیے تو نہیں ہیں۔ آگے جو کام کرنا تھا' اس کے لیے اُسوہ کیسے بنتا اگر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوتی؟

اس لفظ اُسوہ کو یہاں سمجھئے۔ اللہ کر سکتا تھا' لیکن اس نے نہیں کیا — اس کا حکم تو یہی تھا کہ ''اے محمدؐ! جھیلو' برداشت کرو'' — اللہ کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس لیے صرف بطورِ تفہیم بہت ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے احساسات پر قیاس کریں تو کیا بیتی ہو گی اللہ پر! جب طائف میں اس کا محبوب پتھروں کی زد میں تھا — جب تالیاں پٹ رہی تھیں — لیکن اُس کا فیصلہ یہی تھا کہ اے محمدؐ! صبر کرو' جھیلو' برداشت کرو۔ وہی بات جو آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہہ رہے ہیں۔ جیسا کہ آلِ یاسر پر ظلم و ستم کے واقعے کے دوران ذکر ہوا۔ اسی طرح مکی دور میں مصائب و

شدائد' ایذا رسانی' جور و تعدی اور طنز و استہزاء کے مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ کو بھی وحی الٰہی کے ذریعے یہ ہدایات مل رہی ہیں کہ: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ — ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا﴾ — ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ — مختلف اسالیب سے صبر کی ہدایت اور تلقین ہو رہی ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ''جیسے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے ویسے آپ بھی صبر کیجیے'' — ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ ''صبر کیجیے اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے''۔ یعنی صبر کے لیے بھی کوئی سہارا چاہیے تو آپ کا سہارا ہم خود ہیں — ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ ''پس صبر کیجیے اور اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجیے اور کہیں مچھلی والے کی طرح جلدی نہ کر لیجیے گا'' — ﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾ ''اور صبر کیجیے' اللہ محسنین یعنی خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس کو جانئے اور سمجھئے۔ یہ اس لیے ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس ﷺ کو ہمارے لیے اسوہ بننا تھا۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آپؐ کی ذاتِ گرامی ہمارے لیے اُسوہ کیسے بنتی! — یہ مجھ پر حجت ہے' آپ پر حجت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ کیا' وہ خالص انسانی سطح (human level) پر کیا ہے' سارے دکھ اٹھا کر کیا ہے' فاقے جھیل کر کیا ہے' پتھراؤ برداشت کر کے کیا ہے' قید و بند کی تکالیف اٹھا کر کیا ہے' اپنے دندانِ مبارک شہید کروا کر کیا ہے' اپنے عزیزوں اور جاں نثاروں کے لاشے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کیا ہے' پیٹ پر ایک نہیں دو دو پتھر باندھ کر کیا ہے — یہ سارے مصائب جھیلے ہیں' تب انقلاب برپا ہوا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا سب سے زیادہ نمایاں اُسوہ کیا ہوا؟ یہ ساری گفتگو ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کے تحت ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے پہلا اُسوہ تو یہ ہوا کہ بحیثیت مجموعی نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد خالصتاً انقلابی جدوجہد کے مشابہ ہے۔ جبکہ دوسرا اُسوہ یہ ہے کہ یہ ساری جدوجہد انسانی سطح (human level) پر قدم بقدم مصائب و تکالیف' جور و تعدی اور ظلم و ستم جھیل کر ہوئی ہے۔

نصرتِ الٰہی کا ظہور

اس موقع پر مبادا کوئی اشکال پیدا ہو جائے یا مغالطہ لاحق ہو جائے‘ لہٰذا عرض کردوں کہ اس میں شک نہیں کہ اس جدوجہد میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید بھی آئی ہے۔اور اس نصرت و تائید کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

لیکن یہ نصرت و تائید کب آئی ہے؟ یہ اُس وقت آئی ہے جب مؤمنین صادقین جو کچھ کرسکتے تھے وہ سب کر گزرے۔اس سے پہلے نصرتِ الٰہی نہیں آیا کرتی۔اس نصرت کی لازمی شرط یہ ہے کہ:﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝۷﴾ (محمد) ”اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔“ غزوۂ بدر کے موقع پر جنگ سے ایک رات قبل نبی اکرم ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ ”اے اللہ! میں نے پندرہ برس کی کمائی لا کر میدان میں ڈال دی ہے۔ اگر کل یہ شہید ہو گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا‘ اس لیے کہ میں آخری رسول ہوں اور میری پندرہ برس کی کمائی یہ ہے کہ جو دین کی سربلندی کے لیے میں نے میدان میں لا ڈالی ہے ـــــ“ چنانچہ بدر کے معرکہ میں اللہ کی نصرت آئی اور ۳۱۳ بے سروسامان مؤمنین صادقین کے ہاتھوں کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار لشکر کو شکست نصیب ہوئی ـــــ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ بچ بچ کر اور تحفظ کا خیال رکھ رکھ کر اور اپنی جیبوں کو سکیڑ سکیڑ کر رکھنے کے ساتھ ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ کی تائید و نصرت ہمیں حاصل ہو جائے تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔اپنے حلوے مانڈے میں ہم کوئی کمی کرنے کے لیے آمادہ نہیں‘ کاروبار میں سود شامل ہے تو اس کو چھوڑنے کے لیے ہم تیار نہیں‘ کیونکہ اس طرح تو کاروبار سمٹ اور سکڑ جائے گا۔دین کے کام کے لیے وقت لگائیں تو پھر ہمارا یہ معیار اور status کیسے برقرار رہے گا! ہم تو بچ بچ کر آرام سے گھروں میں بیٹھے رہیں اور یہ چاہیں کہ اللہ اپنی نصرت و تائید لیے ہمارے پیچھے پیچھے آئے کہ لیجیے میری نصرت و تائید

قبول فرما لیجیے' تو یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ ع ایں خیال است و محال است وجنوں! یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ محبوبِ ربّ العالمین ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ نہیں ہوا تو ہمارے سر پر کون سا سُرخاب کا پَر لگا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ ہو جائے گا؟ کبھی نہیں ہو سکتا! ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہوتا۔ اس معاملے میں استثناء (exception) اگر ہوتا تو اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ آپ ﷺ ہی ہو سکتے تھے۔

نصرت و تائید کے ضمن میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ یومِ طائف کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو دعا کی تھی اس کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ع ''اجابت از درِحق بہرِ استقبال می آید'' —— چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں کی دیکھ بھال کے لیے مامور ہے' حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ ''حضور! اللہ نے مجھے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں طائف کا شہر واقع ہے تاکہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں'' —— اس پر رحمۃ للعالمین ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''میں لوگوں کے عذاب کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لائے لیکن کیا عجب کہ ان کی آئندہ نسلوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرمائے!'' —— دیکھ لیجیے کہ جس موقع پر غیبی نصرت بھیجی گئی وہ کون سا موقع تھا؟ یہ وہ موقع تھا کہ جس سے سخت دن خود حضور ﷺ کے بقول آپؐ کی زندگی میں کوئی اور نہیں گزرا —— اس سے پہلے بھی خفی اور غیبی امداد و نصرت ہوئی ہے۔ لیکن نصرتِ الٰہی کا اصل ظہور ہوتا ہے یوم طائف کے بعد۔ چنانچہ فوری طور پر تو ملک الجبال کی حاضری ہے۔ لیکن اب ٹھنڈی ہوائیں یثرب کی طرف سے آنے لگیں۔ آپ ﷺ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے' لیکن نصرت و حکمتِ الٰہی نے مدینہ منورہ کی طرف سے کھڑکی کھول دی —— یومِ طائف کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب ''النبی الخاتم ﷺ'' میں بہت ہی عمدہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''یوم طائف نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا turning piont تھا۔ اُس

دن تک اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کو دشمن کے حوالے کیا ہوا تھا کہ جس طرح چاہو ہمارے رسولؐ کے صبر کا امتحان لے لو' جس طرح چاہو اُن کی استقامت کو جانچ پرکھ لو' ہمارے رسولؐ کی سیرت و کردار کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لو ــــــ اُس دن کے بعد نبی اکرم ﷺ کے لیے خصوصی نصرت اور تائید کا ظہور شروع ہوتا ہے۔''

آنحضور ﷺ کی اجتماعی جِدّوجہد میں قرآن کا مقام

اب میں سیرتِ مطہرہ اور خاص طور سے اس اسوۂ حسنہ کے ان تین مراحل کے اعتبار سے ایک تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا میں نے آغاز میں ذکر کیا تھا ــــ اس کے بعد میں نے اُسوۂ حسنہ کے ضمن میں دو باتیں بحیثیت مجموعی بیان کی ہیں کہ محض آرزو یا مرثیہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا ــــ دین کا دل میں درد ہے تو ہمیں اُسوۂ حسنہ کے مطابق انقلابی جدوجہد کرنا ہوگی۔ ہمیں مرثیہ پڑھنا اور رونا بہت آتا ہے۔ لیکن اگر یہ رونا نبی اکرم ﷺ کے اجتماعی اُسوۂ حسنہ کے ساتھ ہو تو یہ سونا ہے' اس کے مطابق عمل نہیں ہے تو یہ ٹسوے ہیں' جو عورتیں بہایا کرتی ہیں' جن کی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اب ذرا ان تین اجزاء کو لیجیے' جن کو میں نے دو دو لفظوں کے جوڑوں کے ساتھ تین مراحل کے عنوانات کے تحت آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ ''دعوت و تربیت'' کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ یہ ہے کہ ان دونوں کاموں کا مرکز' منبع' مدار اور محور قرآن اور صرف قرآن رہا ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا تھا کہ لوگوں کو ایمان کی دعوت دو قرآن کے ذریعے ــــ تذکیر کرو قرآن کے ذریعے ــــ انذار کرو قرآن کے ذریعے ــــ تبشیر کرو قرآن کے ذریعے ــــ نصیحت اور موعظت کرو قرآن کے ذریعے بحث و مباحثہ اور جدال و محاجہ کرو اس قرآن کے ذریعے ــــ تبلیغ کرو قرآن کی ــــ! دعوت کی مختلف سطحوں کے لیے یہی الفاظ آتے ہیں۔

اب ذرا ان الفاظ کے مطابق وہ ہدایاتِ الٰہی سنئے جو قرآن حکیم میں نازل ہوئی

ہیں ــــ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾ (ق) ''پس یاددہانی کراؤ بذریعہ قرآن ہر اُس شخص کو جو میری پکڑ اور سزا سے ڈرتا ہو'' ــــ ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:19) ''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی خبردار کردوں اور اُن کو بھی جن کو یہ (قرآن) پہنچے'' ــــ ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ (مریم) ''پس (اے نبی ﷺ!) ہم نے اس کتاب کو آپ کی زبان میں اس لیے آسان بنایا ہے کہ آپ اس کے ذریعے خداترسوں کو بشارت پہنچادیں اور جھگڑالو قوم کو اس کے برے انجام سے آگاہ اور خبردار کردیں'' ــــ اس آیت میں خاص بات نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ لِتُبَشِّرَ کے ساتھ بھی ''بِهٖ'' اور ''تُنْذِرَ'' کے ساتھ بھی ''بِهٖ'' آیا ہے ــــ یعنی دونوں کام بشارت وانذار اسی کتاب ''قرآن'' کے ذریعے ہوں گے ــــ مزید فرمایا: ﴿يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''اے ہمارے رسول! پہنچائیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپؐ کے ربّ کی جانب سے'' ــــ تبلیغ کس کی؟ قرآن کی! ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿٩﴾ (بنی اسرائیل) ''بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور بشارت دیتا ہے ان اہلِ ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے''۔ بشارت دینے والا کون؟ قرآن! ــــ اس انذار اور تبشیر بالقرآن کا ذکر سورۃ الکہف کے آغاز ہی میں بڑے مہتم بالشان انداز میں ہوا۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ﴿١﴾ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿٢﴾

''شکر اور تعریف کے لائق ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کجی نہیں رکھی، بالکل سیدھی اور ہموار و استوار تاکہ وہ

لوگوں کو اپنی جانب سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو' جو نیک عمل کر رہے ہیں' اس بات کی خوشخبری سنا دے کہ ان کے لیے بہت اچھا اجر ہے۔"

میں نے جو آیات آپ کو سنائیں ان سب کا حاصل یہ نکلا کہ:

دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مرکز ومحور اور مبنیٰ و مدار صرف اور صرف قرآن ہے۔ انذار ہو یا تبشیر' تبلیغ ہو یا تذکیر' مباحثہ ہو یا مجادلہ' موعظہ ہو یا نصیحت' یہ تمام کام صرف قرآن مجید ہی کے ذریعے سرانجام دیئے جائیں گے۔

"دعوت" کا لفظ ہمارے دین کی غالباً سب سے جامع اصطلاح ہے' جس کے لیے سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵ سے استشہاد کیا جا سکتا ہے' جس میں دعوت کے ضمن میں یہ جامع ومانع ہدایت دی گئی ہے کہ: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ﴾ "(اے نبی ﷺ!) دعوت دو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ ومجادلہ کرو اس طور سے جو نہایت ہی عمدہ ہو"۔ یہ ہے اسوہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا ـــــ سیرتِ مطہرہ میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ کہیں نبی اکرم ﷺ نے طویل تقریر وخطاب فرمایا ہو۔ جہاں تشریف لے گئے تو یہی فرمایا کہ "لوگو! میرے اوپر اللہ کی طرف سے ایک کلام نازل ہوا ہے اسے سن لو!" ـــــ معلوم ہوا کہ فلاں وادی میں کوئی قافلہ آکر اترا ہے تو وہاں تشریف لے گئے اور فرمایا تو یہ فرمایا کہ "لوگو! میرے پاس اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے' وہ میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں"۔ مجمعوں میں آپؐ قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ہمیں تو قرآن کا ترجمہ کر کے اس کا مطلب اور مفہوم سمجھانا پڑتا ہے' جبکہ وہاں معاملہ یہ تھا کہ از دِل خیزد بر دِل ریزد۔ وہاں تو حال یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن سنا اور سعید روح کے قلب وذہن اور رگ وپے میں سرایت کر گیا۔

بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن اور محض قرآن سن کر مشرف

باسلام ہوئے۔ عمر بن الخطاب کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کس نے بنایا؟ قرآن نے! یہ سورۂ طٰہٰ کی معجز نمائی تھی جس نے عمرؓ کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ــــ ع دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را!
ابوذر غفاریؓ جو ڈکیتی کا پیشہ رکھنے والے ایک قبیلے کے فرد تھے' انہیں اس مقام تک کس نے پہنچایا کہ ع ''رہزنان از حفظ اُو رہبر شدند!'' جن کے متعلق نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جس نے زہدِ عیسیٰ علیہ السلام دیکھنا ہو تو وہ میرے ساتھی ابوذرؓ کو دیکھ لے!''
لبیدؓ شعرائے سبعہ معلقہ کے سلسلے کے آخری شاعر ہیں' ان کے ایک شعر پر سوقِ عُکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا تھا ــــ وہ ایمان لے آئے تو قرآن کے ذریعے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ اب شعر نہیں کہتے؟ تو جواب ملا: أَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟ یعنی قرآن کے نزول کے بعد میری کیا مجال کہ میں شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کروں ــــ طفیلؓ دوسی یمن کے رہنے والے قادر الکلام شاعر تھے۔ جب مکہ آئے تو قریش کے بہکانے پر کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ مبادا کانوں میں کلام اللہ پڑ جائے۔ لیکن ایک دن خود ہی رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن سننے کی فرمائش کرتے ہیں اور جیسے ہی کچھ حصہ سنتے ہیں' بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا' بے شک یہ وحی الٰہی ہے ــــ اور اُسی وقت مسلمان ہو جاتے ہیں ــــ الغرض اس کتابِ ہدایت کے طفیل' جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے' جو اُمّی تھے' اَن پڑھ تھے وہ دنیا کے لیے معلّم بن گئے' جو زانی و شرابی تھے' وہ عصمتوں کے محافظ اور مکارمِ اخلاق کے علمبردار بن گئے۔ یہ سب کچھ قرآن کی معجز نمائی تھی۔

میری اس گفتگو کا نتیجہ بھی یہ نکلا کہ دعوت و انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہج عمل پورے کا پورا قرآن مجید کے گرد گھومتا ہے ــــ یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم! اس بات کو مولانا حالی مرحوم نے تو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں یوں بیان کیا کہ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ــــ اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ ــــ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

اور علامہ اقبال مرحوم نے اسی بات کو یوں الفاظ کا جامہ پہنایا۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید!

پھر علامہ مرحوم نے حد درجہ پُرشکوہ الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن!
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمت اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
مثلِ حق پنہاں وہم پیدا است ایں — زندہ و پائندہ و گویا است ایں!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اگر کوئی دعوت اس قرآن سے پرے پرے دی گئی ہو' قرآن کو bypass کر کے دی گئی ہو' قرآن کے بجائے کسی شخصیت کے لٹریچر کے بل پر چل رہی ہو' کسی اور کی تصانیف پر چل رہی ہو' وطنیت وقومیت کے نام پر چل رہی ہو تو وہ دعوت اُسوۂ رسول ﷺ سے ہٹی ہوئی ہے ـــــ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہتا ـــــ اُسوۂ رسولؐ تو یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ' انذار وتبشیر' تلقین ونصیحت' ان سب کا مبنیٰ' مدار اور مرکز ومحور صرف اور صرف قرآن ہوگا۔

تربیت وتزکیہ کا مسنون ذریعہ ـــــ قرآن حکیم

اب آیئے چوتھی بات کی طرف وہ ہے تربیت۔ یہ معاملہ اس اعتبار سے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ تربیت اور تزکیۂ نفس کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید اس کے لیے تو یہ قرآن مفید ہے ہی نہیں' کتاب اللہ اس کام کے لیے مؤثر ہی نہیں ہے' لہٰذا ذکر کے کچھ اور طریقے ایجاد کرنے پڑیں گے' تربیت کا کوئی دوسرا نظام بنانا پڑے گا ـــــ گویا نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ اس کے لیے مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضور ﷺ کی شخصیت کا جو اثر ہوتا تھا وہ اب ہمارے لیے ممکن نہیں ہے' کیونکہ آپ ﷺ کا وجودِ اقدس ہمارے درمیان موجود نہیں۔ تصوف کے حلقوں میں جو

دیانت دار اور خدا ترس لوگ ہیں' وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تربیت' تزکیہ اور سلوک کے جو طریقے رائج ہیں' وہ مسنون بہر حال نہیں ہیں۔ دیانت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اس کو تسلیم کریں۔ ضربیں لگانے کے طریقے کو مسنون ٹھہرانے کے لیے کہاں سے دلیل لائیں گے؟ یہ بات نہ تو کسی حدیث سے ثابت ہے نہ کسی صحابی سے اور نہ ہی کسی تابعی سے۔ جو حضرات اس کے قائل ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ عذر و معذرت یا Plea لاتے ہیں کہ ان طریقوں کو انہوں نے اپنے تجربات میں مفید پایا ہے ـــــ ٹھیک ہے' مجھے اس سے انکار نہیں ـــــ ایسا ممکن ہے کہ یہ طریقے مفید ہوں ـــــ لیکن یہ مانئے اور اس کا اعلان بھی کیجیے کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں۔ یہ طریقے اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کیا ایسے حضرات کا یہ خیال ہے کہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے تزکیہ نہیں کیا؟ قرآن حکیم میں تین مقامات پر تلاوت کے بعد تزکیہ ہی کا ذکر آتا ہے ـــــ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ ـــــ

اس تزکیہ کا ذریعہ کیا ہے؟ دعوت و تبلیغ کا مدار اور انذار و تبشیر کا مرکز و محور تو قرآن ہے اور تذکیر و نصیحت کا مبنیٰ بھی قرآن ہی ہے' اس بات کو ہم نے قرآن کی آیات ہی سے سمجھ لیا۔ اس کے سمجھنے کا معاملہ آسان ہے' البتہ تزکیہ کا معاملہ تھوڑا سا باریک ہے۔ تزکیہ و تربیت کے لیے بھی ہمیں ہر حال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آیئے اس بات کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۂ یونس میں فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

چنانچہ دل کے تمام امراضِ دینیہ و اخلاقیہ کے لیے شفاء یہ قرآن مجید ہے۔ ذکر' یہ قرآن ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٩﴾﴾ (الحجر) جو اس ذکر کو bypass

کرے گا اس کے متعلق کم سے کم یہ بات کہی جائے گی کہ وہ غیر مسنون طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ امراضِ قلبیہ وصدریہ کا علاج جو اس سے علیحدہ کیا جائے گا وہ اسوۂ رسول ﷺ نہیں ہوگا۔ اپنی جگہ مؤثر ہوا کرے ـــــ اسوۂ رسولؐ کے نقشے سے وہ ہٹا ہوا ہے۔

دیکھیے ہمارے ہاں ایک ہے "وعظ"۔ آج یہ وعظ ہمارے ہاں گالی بن گیا ہے۔ لوگ پھبتی چست کرتے ہیں کہ لو جی وعظ کر رہے ہیں۔ گویا بہت گھٹیا سی بات کہی جا رہی ہے۔ یہ ہر دَور کی ایک چھاپ ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ایسے وعظ ہوا کرتے تھے جو بہت مؤثر ہوتے تھے۔ سامعین ان سے اپنے قلوب میں گداز اور ایک روشنی محسوس کرتے تھے' ان کے جذبات کو جلا ملتی تھی۔ لیکن ہمارے ہاں' میری یادداشت کے مطابق' جو "وعظ" ہوا کرتے تھے ان میں بھی قرآن نہیں ہوتا تھا (اِلّا ماشاء اللہ) اکثر وعظ "مثنویٔ مولویٔ معنوی" کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ اس کی بھی ایک تاثیر تھی' اس سے انکار نہیں۔ اکثر ہوتا یہی تھا کہ ایک خاص ترنم آمیز لہجے میں مثنوی کو پڑھا جاتا تھا۔ میرے ہوش کے زمانے میں اکثر وعظوں کی یہی نوعیت ہوتی تھی جو میں نے خود سنے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ موعظہ حسنہ اور نصیحت یہ قرآن ہی ہے۔ دلوں میں اترنے والی چیز یہ قرآن ہے' جذبات کو جلا بخشنے والی چیز یہ قرآن ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اشعار میں بہت سے قرآنی حقائق کی نہایت عمدہ اور اعلیٰ وارفع ترجمانی اور وضاحت کی ہے ـــــ چنانچہ روایتی واعظوں کے متعلق وہ کہتے ہیں ؏ "معنیٔ او پست وحرفِ او بلند" یعنی الفاظ بڑے بھاری بھرکم اور معنی تلاش کرو تو ہیں ہی نہیں ـــــ دھواں دھار بات ہے لیکن معنی سے بالکل خالی ـــــ علامہ مزید کہتے ہیں۔

از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

یعنی اپنے وعظوں کے لیے حدیث لائیں گے تو کوئی بہت ہی ضعیف یا شاذ حدیث لائیں گے۔ واعظوں کی یہ بڑی کمزوری شمار کی گئی ہے کہ ان کے وعظ میں اکثر و بیشتر کمزور و ضعیف حدیثیں ہوتی ہیں۔ امام غزالیؒ اس سے نہ بچ سکے۔ "احیاء العلوم" جیسی کتاب

بھی اس سے مبرا نہیں۔ وہ کسی موضوع پر سات آٹھ صحیح حدیثیں درج کرنے کے بعد دو تین ضعیف حدیثیں بھی شامل کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا! شاید ان کا جی بھرتا نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ دو تین دلیلیں اور دے دی جائیں۔ حالانکہ ایک بات صحیح حدیث سے ثابت ہو جاتی ہو تو پھر اس کے لیے ضعیف احادیث سے استدلال کی کیا ضرورت ہے! ہمارے ہاں جو عام واعظین ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ساری گفتگو اور وعظ کا مرکز و محور صرف ضعیف احادیث ہوں گی ___ الّا ماشاء اللہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز سے ہمارے واعظین کو اعتناء نہیں ہے تو وہ یہ قرآن ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے والد مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُرتاثیر اشعار حواشیٔ ترجمہ قرآن میں درج کئے ہیں ۔

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو
کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی
پارہ جس کے لحن سے طورِ ہدیٰ ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اُس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو
کوہ جس سے خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا ہونے کو ہے!

میں کہا کرتا ہوں کہ ایک محفل سماع جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بھی ہوتی تھی' لیکن اس میں کیا سنا جاتا تھا؟ قرآن ___ ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (الاعراف: ۲۰۴) ''اور جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔'' بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمائش کر کے قرآن کریم سننا چاہا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کو سناؤں! آپؐ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ آنجناب ﷺ نے فرمایا کہ ہاں سناؤ' مجھے دوسروں سے سن کر حظ اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی اور جب اکتالیسویں آیت پر آئے تو

حضورﷺ نے فرمایا: حَسْبُكَ حَسْبُكَ ''بس کرو' بس کرو!'' حضورﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جب حضرت عبداللہؓ نے یہ آیت پڑھی: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝﴾ ''پس سوچو کہ اُس وقت کیا ہو گا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر (اے محمدؐ) آپ کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے''۔ یہ ہے سماع جناب محمدؐ رسول اللہﷺ کا!

وعظ کا مقصد کیا ہے؟ جذبات کے اندر ایک حرارت پیدا کرنا ——— کیا یہ حرارت قرآن سے پیدا نہیں ہوتی؟ گویا تزکیہ نفس کے لیے تو غالباً یہ دنیا کی ناکام ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کی سب سے زیادہ ناقدری اس کوچے میں آ کر ہوئی ہے۔ اس کا مرثیہ بھی اقبال نے کہا ہے ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش!

عراقی' جامی یا رُومی کا شعر سنیں گے تو وجد میں آ جائیں گے' لیکن قرآن سنیں گے تو کوئی اثر ہی نہیں ہو گا' بلکہ قرآن ان کی محفلوں میں جگہ ہی نہیں پاتا۔ حالانکہ اگر جذبات کی جلا' ان میں حرارت اور سوز و گداز اور کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو اس مقصد کے لیے بھی یہ قرآن ہے جو جناب محمدؐ رسول اللہﷺ پر اُترا۔ ان کے لیے بھی سب سے بڑا منبع وسرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔

اُسوۂ حسنہ کے ضمن میں اب تک قدرے تفصیل کے ساتھ میں نے جو اُسوے گنوائے ہیں' انہیں پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ پہلا اسوہ ہے دعوت و تبلیغ' انذار و تبشیر اور موعظہ و تذکیر' ان سب کو جمع کر لیجیے' ان سب کا مرکز و محور اور مبنیٰ و مدار ہے قرآن۔ دوسرا اُسوہ ہے تزکیہ و تربیت' اس کی اساس' جڑ اور بنیاد بھی قرآن ہی ہے۔ ذکر قرآن سے ——— محفلِ سماع قرآن سے ——— وعظ قرآن سے ——— تطہیر فکر قرآن سے

ہوگی' اور فکر کی تطہیر ہوگی تو اعمال خود بخود درست ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت فکر و عمل کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں' بایں معنی کہ ''گندم از گندم بروید' جوز جو'' کے مصداق غلط فکر' غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لیے صحیح فکر ناگزیر ہے۔ گویا اگر کسی انسان کی فکر کی تطہیر ہو جائے اور غلط افکار و نظریات اور فاسد خیالات اس کے قلب و ذہن سے پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں تو اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (phenomenon) کو قرآن حکیم ''یُکَفِّرُ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ'' بھی قرار دیتا ہے اور یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ بھی ــــ اور یہی ربط و تعلق ہے اس میں کہ تلاوتِ آیات کے متصلاً بعد تزکیہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے: یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ ــــ واللہ اعلم!

تنظیم کے لیے اُسوۂ رسولؐ سے رہنمائی

اب آیئے دوسرے مرحلے کی طرف' یعنی تنظیم و ہجرت ــــ تنظیم کے ضمن میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا کیا اسوہ رہا ہے! اب اس مسئلہ کو ہمیں سمجھنا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تنظیم کے بغیر کوئی بھی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ آپ کو لوگوں کی جیبیں کاٹنی ہوں تو بھی ایک تنظیم قائم کرنی پڑتی ہے۔ گرہ کٹوں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالنا ہو تو گینگ بنانا ہوگا۔ سوشلزم لانا ہو تو آپ کو تنظیم بنانی ہوگی اور اگر اسلام کے لیے کوئی کام کرنا ہے تو بھی تنظیم سے مفر نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ[1]۔ یعنی جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کا تو حکم ہے کہ:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))[2]

(۱) سنن الدارمی' المقدمۃ' باب فی ذھاب العلم۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب الامثال' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ ورواہ احمد فی المسند' ح: ۱٦٥٤٢' واللفظ لہ۔

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں' مجھے اللہ نے ان کا حکم دیا ہے: (i) جماعت کا' (ii) سننے کا' (iii) اطاعت کرنے کا' (iv) ہجرت کا' اور (v) اللہ کے راستے میں جہاد کا۔''

ہمارا آج کا مزاج اس سے کافی دور چلا گیا ہے۔ بڑے بڑے اہل دانش و بینش اور صاحبِ علم و فضل کہتے ہیں ''اجی جماعت کی کیا ضرورت ہے؟ کام تو ہم بھی کر ہی رہے ہیں' نماز روزہ تو ہو ہی رہا ہے' کسی کی کوئی خدمت بھی کر دی جاتی ہے۔'' اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے' اگر اسوۂ محمدیؐ پیش نظر ہے اور انقلابِ محمدیؐ کو دنیا میں دوبارہ لانے کی سعی و جُہد کرنی ہے تب تنظیم سے رستگاری نہیں ہو سکتی' تنظیم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ آج کے دور کا سب سے کٹھن کام یہی ہے ــــــ دیکھئے قرآن مجید (سورۂ مریم) میں عرب کے لوگوں کو قَوْمًا لُّدًّا کہا گیا ہے کہ یہ بڑی جھگڑالو قوم ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر فرعونِ بے ساماں ہے' کون کسی کی سنے گا! کون کسی کے سامنے سر جھکائے گا! آج کا دور بھی ایسا ہی دور ہے کہ سب سقراط و بقراط ہیں' کون کسی کی سنے گا! لوگوں کے اپنے اپنے نظریات اور خیالات ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اس دور میں کسی نظم کا پابند ہونا سب سے کٹھن کام ہے۔ کسی کی بات مانی جائے' کسی کا حکم مانا جائے' خود کو کسی ڈسپلن میں دے دیا جائے' سمع و طاعت کا نظم قبول کیا جائے' یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔

میرے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانیوں میں سب سے بڑا ایثار یہی تھا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کی کامل نفی کر کے اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں گم کر دیا تھا ــــــ حالانکہ بہت سے دُنیوی اعتبارات سے آپؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ کوئی نہیں تھا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنٰى ﴿٨﴾﴾ (الضحیٰ) ''اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا''۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جب غنی کیا ہے تو سرمایہ اہلیہ محترمہ کا تھا۔ نقل کفر کفر نہ باشد' طائف والوں نے یہی طعنے تو دیئے تھے کہ اللہ کو ایک مفلس و قلاش کے سوا اپنا نبی بنانے کے لیے کوئی اور نہیں ملا تھا؟ مکہ والے بھی کہا کرتے تھے کہ اللہ کو نبی بنانا تھا تو دو عظیم شہروں

(مکہ اور طائف) میں سے کسی صاحبِ ثروت سردار کو بناتا۔ حضور ﷺ کے پاس قریش کے اس قبائلی نظام کا کوئی منصب نہیں تھا' جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سب سے زیادہ نازک اور حساس ذمہ داری تھی ـــــ یعنی دیت کا فیصلہ کرنا۔ آپؓ کے اختیار میں تھا کہ کسی مقتول کا کتنا خون بہا دیا جائے گا ـــــ گویا اس معاشرے میں کسی کی معاشرتی حیثیت (social status) کے تعین کرنے کا کام آپ کے سپرد تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیں کہ اس معاشرے کے قبائلی نظام میں حضرت ابوبکرؓ کو کیا مقام حاصل تھا! لیکن انہوں نے اپنی شخصیت کی ایسی نفی کی ہے اور اپنے آپ کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اس طرح گم کیا ہے کہ "ابوبکر" تو نظر ہی نہیں آتے۔ نظر تو وہ آیا کرتا ہے جو اختلاف کرتا ہے۔ ایسے شخص کی شخصیت علیحدہ اور جدا نظر آئے گی جو کسی درجے میں اپنی بات کرتا ہو۔ لیکن جس کی اپنی کوئی بات ہی نہیں ہے' جو خود کو گم کر چکا ہو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں' وہ کہاں نظر آئے گا! ـــــ یہ ہے حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی قربانی۔

آج جو سب سے بڑا خناس ہمارے دماغوں میں بیٹھا ہوا ہے وہ یہی انانیت ہے۔ کوئی نظم ہوگا اور کوئی تنظیم ہوگی تو بہرحال اس کے امیر اور اس کے نظام العمل کی پابندی بھی کرنی ہوگی ـــــ لہٰذا اپنے آپ کو اس "کھکھیڑ" سے بچانے کے لیے یہ فلسفہ تراش لیا جاتا ہے کہ اجی کسی جماعت یا تنظیم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دین کا کام کسی نہ کسی درجے میں ہم بھی کر ہی رہے ہیں ـــــ جماعتیں اور تنظیمیں تو عموماً فتنہ بن جایا کرتی ہیں ـــــ اس لیے اس سے حذر ہی بہتر ہے۔ ان حیلوں سے دل کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ لوگ سڑک پر چلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں' لیکن اس کے باوجود باہر نکلنا ترک نہیں کرتے۔ دل میں اصل چور یہی ہے کہ میں کیوں کسی کی مانوں؟ لیکن یہ جان لیجیے کہ تنظیم و جماعت کے بغیر دنیا میں کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

تنظیمِ نبویؐ کی نوعیت

اب رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مجھے تنظیم و ہجرت کے بارے میں

کچھ عرض کرنا ہے ـــــ نبی اکرم ﷺ کی تنظیمیں دو نوعیتوں کی تھیں۔ ایک تنظیم کی نوعیت تو یہ تھی کہ آپ ﷺ کے بربنائے نبی و رسول ہونے کے' جو شخص آپؐ پر ایمان لے آیا' اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا' تو وہ خود بخود بحیثیت مؤمن آپ کا مطیع و فرماں بردار ہو گیا اور آپ سے آپ اس بڑی تنظیم میں شامل ہو گیا جس کو اُمتِ مسلمہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب کسی دوسری تنظیم کی حاجت ہی نہیں۔ وہ حضور ﷺ کے احکام کا پابند ہے۔ آپ ﷺ کی اطاعت سے سرموانحراف کرے گا تو اس کا ایمان ہی سلامت نہیں رہے گا۔ اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا دنیا میں وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا میں ہر شخص کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے' لیکن رسول اللہ ﷺ سے تو اختلاف ممکن نہیں۔ اختلاف کیا تو ایمان کی خیر نہیں ـــــ اختلاف کرنا تو دور رہا' بات مان بھی لی لیکن اگر دل میں کوئی اضطراب یا تنگی رہ گئی تو بھی ایمان کی خیر نہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝٦٥﴾ (النساء)

''نہیں (اے محمد ﷺ!) آپ کے ربّ کی قسم یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ آپؐ فیصلہ کریں اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں۔''

آپ نے دیکھا کہ آنجناب ﷺ کے حکم کو تسلیم نہ کرنے پر ہی نہیں بلکہ آپ کے فیصلوں کو خوش دلی سے قبول نہ کرنے پر بھی ایمان کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھا کر نفی فرما رہے ہیں ـــــ پھر دیکھئے سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝٢﴾

''اے اہل ایمان! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ہی ان سے اونچی آواز میں بات کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے بلند آوازی اختیار کرتے ہو' مبادا تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں (تمہاری ساری نیکیاں اکارت جائیں' تمہارے اب تک کئے کرائے پر پانی پھر

جائے) اور تمہیں شعور واحساس تک نہ ہو''۔

شعور واحساس تو تب ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے ___ غور کیجیے کہ یہاں نافرمانی‘ حکم عدولی اور معصیتِ رسولؐ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا‘ بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے اعمال کے حبط ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

آگے چلیے اور دیکھئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اطاعت رسول کے لیے کتنا محکم اور غیر مبہم ضابطہ وقانون بیان فرمادیا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی'' ___ اسی ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ کا قول بھی سن لیجیے: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))(۱) ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں''۔ قرآن وحدیث کی یہ تعلیمات وہدایات پیش نظر رکھئے اور غور کیجیے کہ اس سے زیادہ مضبوط کسی اور تنظیم کا آپ تصور کر سکتے ہیں؟

مسنون ہیئت تنظیمی ___ بیعت سمع وطاعت

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس مسئلہ پر کافی طویل عرصے تک بہت غور کیا ہے اور آپ کو بھی غور وفکر کی دعوت دیتا ہوں کہ آنحضور ﷺ نے مختلف مواقع اور اوقات میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو بیعتیں لی ہیں‘ ان کی کیا ضرورت تھی؟ نبی اکرم ﷺ تو اپنی ذات میں خود مطاع ہیں‘ پھر بیعت کی ضرورت کیا ہے؟ غزوۂ بدر سے پہلے جو مشاورت ہوئی ہے کہ آیا قافلے کا رُخ کیا جائے جس میں صرف پچاس نفوس ہیں یا اُس لشکر کا جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس اور ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ہے‘ تو اسی موقع پر ہی تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے‘ جو قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے تھے‘ یہ بات کہی تھی کہ: اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ یعنی حضور! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے‘ آپ کی بحیثیت رسول اللہ تصدیق

---

(۱) رواہ فی شرح السُّنة‘ بحوالہ مشکاۃ المصابیح۔

کر چکے' اب کوئی Option ہمارے لیے کہاں رہ گیا ہے؟ — انہوں نے مزید عرض کیا کہ آپ ہمیں ساحل کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیجیے' ہم تعمیل کریں گے — آپ ہمیں برک الغماد تک (جو یمن کا ایک دور دراز علاقہ ہے) چلنے کا حکم دیجیے' ہم چلیں گے' چاہے ہماری اونٹنیاں لاغر ہو جائیں — لیکن اس کے باوجود مختلف مراحل پر آپ ؐ نے بیعتیں کیوں لیں؟ — اس سوال کے جواب کو اس وضاحت سے سمجھیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ عرب میں انقلاب بھی آ جاتا اور اپنے محبوب ﷺ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی نہ چبھتا۔ اللہ نے ایسا نہیں کیا — کیوں نہیں کیا؟ اس لیے نہیں کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی اسلامی انقلاب کی انسانی سطح پر جدوجہد ہمارے لیے نمونہ بنے۔ اسی طرح صحابہ کرام ؓ سے حضور ﷺ کو کسی بھی موقع پر بیعت لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی — لیکن بایں ہمہ آپ ؐ نے بیعتیں لیں تاکہ اُمت کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی نظم جماعت کی بنیاد بیعت ہے۔

حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر پہنچتی ہے تو نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام ؓ کو دعوت دیتے ہیں کہ کون عثمان ؓ کے خون کا قصاص لینے کے لیے میرے ہاتھ پر سرفروشی کی بیعت کرتا ہے! اس پکار پر چودہ سو جان نثار صحابہ کرام ؓ لبیک کہتے ہیں۔ وہ تو حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر ہی غلط نکلی ورنہ صحابہ کرام ؓ نے تو جان فروشی کے لیے خود کو پیش کر ہی دیا تھا۔ اسی بیعت کا نام ''بیعت رضوان'' ہے' جس کا ذکر سورۃ الفتح میں بڑے مہتم بالشان طریقے سے دو جگہ آیا ہے۔ آیت ۱۰ میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ۚ﴾

''(اے نبی ﷺ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے تھے' وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے' ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔''

آگے آیت ۱۸ میں ان بیعت کرنے والوں کو بایں الفاظ بشارت دی جاتی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿۱۸﴾﴾

''اللہ ان مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے (اے نبی!) آپ
سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اسی لیے اس نے
ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو قریبی فتح بخشی۔''

بیعتِ عقبہ ثانیہ ہو رہی ہے کہ آپ سے عرض کیا جاتا ہے کہ حضور آپ مدینہ تشریف لے آیئے، ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے بال بچوں کی کرتے ہیں۔ بیعت کرنے والے وہ ہیں جو پہلے ہی سے ایمان لا چکے ہیں ـــــ قول و قرار کے لیے بیعت ہو رہی ہے ـــــ معاہدے ہو رہے ہیں۔ احادیث میں مختلف بیعتوں کا ذکر ہے۔ میں یہاں صرف ایک حدیث بیان کر رہا ہوں جس کے راوی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں اور جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اپنی اپنی ''صحیح'' میں لائے ہیں۔ گویا یہ حدیث متفق علیہ ہے جو حدیث کا سب سے بلند مقام و مرتبہ ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا: ((فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ)) (۱)

''ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ہم جب رسول اللہ ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے کہ ''جس چیز کی تم طاقت رکھو۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف اوقات میں مختلف کاموں کے لیے بیعت لیا کرتے تھے۔

بیعت کا یہ نظام جو ہمیں تعلیم دیا گیا ہے یہ درحقیقت اس تنظیم کی اساس و بنیاد ہے کہ جو اس کام کو کرنے کے لیے منظم ہو جو نبی اکرم ﷺ اُمت کے حوالے کر گئے ہیں۔ یعنی عالمی سطح پر انقلابِ محمدیؐ کا بول بالا کرنا۔ اس کام کے لیے طریق تنظیم یہ بیعت کا نظام ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ جب آگے آئے اور پکارے کہ ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ'' تو آپ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں اور سمع و طاعت کی بیعت کریں۔ فرق یہ ہو گا کہ نبی اکرم ﷺ سے جو بیعت کی جاتی تھی، وہ مطلق ہوتی تھی کہ جو حکم آپؐ دیں گے وہ واجب

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب البیعۃ علی السمع والطاعۃ فیما استطاع۔

الا طاعت ہوگا۔ اس لیے کہ ؏ ''گفتۂ او گفتۂ اللہ بود''۔ ان کا فرمان اللہ کا فرمایا ہوا تھا۔ اور ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ اب جو بیعت ہوگی' وہ مشروط ہوگی۔ یہ اطاعت ''فی المعروف'' کی شرط کے ساتھ مشروط ہوگی۔ پس نبی اکرم ﷺ کا تیسرا اسوہ ہے کسی تنظیم کے قیام کے لیے نظامِ بیعت۔

احیائے دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے دستوری تنظیموں اور الیکشنوں کے ذریعے قائم ہونے والی تنظیموں اور امیر اور شوریٰ یا انتظامیہ کے لیے دو سال یا پانچ سال کے بعد الیکشن اور ان کے درمیان فرائض و اختیارات اور حقوق کا توازن قائم کرنے کے طریقہ کار کو میں کفر یا قطعی طور پر خلافِ اسلام نہیں کہتا' لیکن پورے شرحِ صدر کے ساتھ یہ ضرور کہتا ہوں کہ یہ طریقِ تنظیم اسوۂ رسول کے مطابق نہیں ہے۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کو تو بیعت لینے کی احتیاج ہی نہ تھی۔ حضورؐ نے مختلف اوقات میں جو بیعتیں لیں وہ میرے نزدیک اس لیے تھیں کہ آئندہ کے لیے ہمیں روشنی ملے اور حضور ﷺ کا طرزِ عمل ہمارے لیے اُسوہ بنے۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا نصب ہو رہا ہے تو بیعت کی بنیاد پر۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت سے۔ حضرت عثمان غنیؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت پر۔ حضرت علیؓ کا نصبِ خلافت بھی بیعت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اس کے بعد بیعتیں تقسیم ہوگئیں۔ یہاں تک تو بیعت ایک تھی۔ وہ دینی بیعت بھی' سیاسی بیعت بھی اور انتظامی بیعت بھی تھی' لیکن خلافت راشدہ کے بعد یہ وحدت ختم ہوگئی۔ اس دور میں نظامِ حکومت کا عنوان تو خلافت ہی رہا لیکن اصلاً وہ ملوکیت میں تبدیل ہوگیا اور خلفاء تقویٰ کے لحاظ سے اس معیارِ مطلوب کے مطابق نہ رہے جو خلفائے راشدین میں نظر آتا تھا' لہٰذا بیعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ چنانچہ ایک سیاسی بیعت یعنی خلیفہ وقت کی اطاعت کے لیے ہوتی تھی جو بتدریج ایک معروف کا درجہ حاصل کر گئی جو دورِ بنی اُمیہ' بنو عباس اور دورِ عثمانیہ تک ہمیں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی ہے ___ اور دوسری بیعت ''بیعتِ ارشاد'' کسی بزرگ' خدا ترس' متقی' متدین'

مزکّی و مربّی اور مرشد کے ہاتھ پر ہونے لگی۔ پھر اس بیعت ارشاد کے بھی کئی سلاسل وجود میں آ گئے۔ جیسے فقہی مسائل میں چار مسالک فقہ مشہور ہوئے اسی طرح انفرادی رشد و ہدایت اور تزکیہ و تربیت نفس کے لیے بھی چار سلاسل مشہور ہیں۔

اس بات کو بھی سمجھ لیجیے کہ یہ دو بیعتیں اُس وقت تک رائج رہیں جب تک شریعت اور قانونِ اسلام کا ڈھانچہ قائم (intact) رہا۔ تا آنکہ وہ دور شروع ہوا جب ایک طرف وحدتِ ملی پارہ پارہ ہوئی اور دوسری طرف متعدد مسلم ممالک براہ راست سیاسی طور پر مغربی استعمار کے استیلاء کے پنجے میں گرفتار ہو کر سیاسی طور پر غلامی سے دوچار ہوئے اور ہمارے دین کا برائے نام ڈھانچہ بھی برقرار نہ رہا اور پوری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ شریعت اور اسلامی قانون مختلف ممالک میں مختلف ادوار میں منسوخ کر دیا گیا اور قاضیوں کی عدالتیں برطرف کر دی گئیں۔ ان حالات میں تجدید و احیائے دین کی تحریکیں اور تنظیمیں ابھرنے لگیں —— اور پھر ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ دونوں بیعتیں یکجا جمع ہو گئیں۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی ابھرے۔ طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی تحریک اور نجد میں محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک اٹھی (جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے)۔ یہ تمام تحریکیں بیعت کے نظام پر سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کے لیے بپا ہوئیں۔ اس طرح ہمیں ان تحریکوں میں اس سنتِ بیعت کی تجدید نظر آتی ہے۔

سید احمد بریلویؒ کی تحریک میں عجب شان نظر آتی ہے۔ وہ مسلک کے اعتبار سے حنفی ہیں، مستند عالمِ دین بھی نہیں، لیکن ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خانوادے کے چشم و چراغ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی شامل ہیں، جو اہلِ حدیث ہیں۔ آج برعظیم پاک و ہند میں جو اہلِ حدیثیت ہمیں نظر آتی ہے وہ کُل کی کُل ان ہی کی مساعی کا ظہور ہے۔ لیکن وہ بیعت جہاد ایک حنفی کے ہاتھ پر کر رہے ہیں۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے بیعت ارشاد لی، پھر بیعتِ جہاد لی۔ اس طرح ایک ہی شخصیت میں دونوں بیعتیں جمع ہو گئیں۔ یہ تو بیسویں صدی میں مغرب کے سیاسی استیلاء کے ساتھ ذہنی مرعوبیت کے پیش نظر دستوری اور قانونی تنظیمیں قائم ہونی شروع ہو گئیں،

ورنہ اس سے قبل اس قسم کی کسی تنظیم اور جماعت کی تشکیل کا کوئی سراغ ہمیں اپنی تاریخ میں نہیں ملتا۔ صحابہؓ و تابعین کے دور میں صدارتی نظام کہیں نظر نہیں آتا کہ اتنے سال کے بعد صدر ہٹ جائے اور پھر دوبارہ انتخاب ہو۔ وہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ جس کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی وہ تاحینِ حیات ہوتی تھی۔ آپ کو ایک مقصد پورا کرنا ہے' جب امیر وہ مقصد پورا کر رہا ہے تو آخر کس دلیل سے آپ اس کو الیکشن کے ذریعے بدلنا چاہیں گے؟ ہاں اگر وہ مقصد سے ہٹ گیا ہے تو آپ اپنا راستہ علیحدہ کر لیں' بیعت فسخ کریں اور اپنے طور پر کام شروع کریں۔ کوئی اور ایسا نظر آئے جس پر اطمینان ہو کہ وہ بہتر کام کر رہا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ تجدید و احیائے دین کے لیے کام کرنے کا جو طریقہ سنت نبویؐ اور تعامل سلف صالحین سے ثابت ہے وہ بیعت کا نظام ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں' وہ اسوۂ رسول اور سنت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

یہ باتیں کہتے ہوئے دل روتا ہے کہ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں ''وعظ'' گالی بن گیا ہے' جو قرآن کی اصطلاح ہے' اسی طرح ''بیعت'' کے ساتھ' جو خالصتاً قرآن و سنت کی اصطلاح ہے' ذہن میں فوراً دکانداری کا تصور آتا ہے۔ قبے' عمامے' جبے اور ایک خاص اندازِ نشست و برخاست اور ایک خاص اندازِ گفتار کے ساتھ کسی شخصیت کا نقشہ ذہن میں اُبھرتا ہے' جن کے ساتھ مریدین کا ایک حلقہ' خدام ادب کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر بہت ہو گا تو یہ کہ کچھ ذکر کے حلقے ہو جائیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا ــــ اس سے آگے ان کی کوئی دعوت نہیں۔ اس طرح ہم نے اس بیعت کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے ــــ ہم نے کس چیز کو بدنام نہیں کیا ہے؟ بقول اقبال۔

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

ہم نے ہر چیز بیچ کھائی ہے۔ دکان دار ہم ہیں۔ بدنام ہم نے دین کو کیا ہے ــــ حج اور عمرے کے مواقع پر اسمگلنگ ہم کرتے ہیں لیکن بدنام حج ہوتا ہے۔ صوم و صلوٰۃ کے ساتھ

سودی لین دین‘ بلیک مارکیٹنگ‘ ذخیرہ اندوزی‘ ملاوٹ اور بہت سی بدمعاملگیاں ہم کرتے ہیں اور بدنام دین ہوتا ہے ____ لیکن بایں ہمہ اگر ہم چاہتے ہیں اسوۂ رسول کی پیروی کریں تو بیعت خواہ کتنی ہی بدنام ہو چکی ہو ہمیں تو اسی پر چلنا ہے۔ اگر وعظ گالی بن گیا ہے تو بنا کرے ہمارے لیے تو قرآن ہی وعظ ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ لٹریچروں سے دعوتیں چلتی ہوں تو چلا کریں‘ ہمارا لٹریچر تو قرآن ہے۔ اسی کو پڑھو اور پڑھاؤ۔ اسی کو سمجھو اور سمجھاؤ۔ اسی کی شرح و وضاحت کرو‘ تحریر سے بھی‘ تقریر سے بھی۔ ہر ایک کی اساس قرآن ہو۔ بفحوائے ارشادِ ربانی: ﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (المائدۃ: ٦٧) اور بموجب فرمانِ نبوی: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً))(۱)

آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ میں قرآن حکیم کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔ قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جو بات مجھ پر منکشف ہوئی ہے اس پر الحمد للہ عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد کوئی اضافی نیکی نہیں بلکہ میرا اور ہر مسلمان کا فرض عین ہے ____ اس کے لیے تنظیم کا قیام لازم ہے اور اس تنظیم کی ہیئت تشکیلی بیعت کے نظام پر ہونی عین سنت کا تقاضا ہے۔ میں اگر محض درس قرآن ہی دیتا رہتا اور سیرتِ مطہرہ کا بیان ہی کرتا رہتا لیکن قرآن حکیم اور سیرتِ مبارکہ سے جو پیغام اور تعلیم مجھے ملتی‘ اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہ کرتا تو مجھ سے بڑا ڈھو کے باز کوئی اور نہ ہوتا۔ میں درس قرآن‘ سیرتِ مطہرہ کے بیان اور وعظ کہنے کی حیثیت سے بہت مشہور (popular) ہو گیا ہوں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ میرے درسِ قرآن کو پاکستان ہی میں نہیں بہت سے بیرونی ممالک میں بھی انتہائی قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔ میں یہی کام کرتا رہتا اور کبھی عمل کی دعوت نہ دیتا تو میرا خیال ہے کہ اس وقت اگر یہاں چار پانچ سو کی حاضری ہے تو ایسی صورت میں یہ حاضری ہزاروں سے متجاوز

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الانبیاء‘ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ وسنن الترمذی‘ ابواب العلم‘ باب ما جاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل۔

ہوتی۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں صرف ''سننے'' کا انتہائی ذوق وشوق ہے۔ اس اعتبار سے ہم واقعتاً سُنّی ہیں اور خالص ''سُنّی'' ہیں۔ یہ جو بار بار عمل کی دعوت دی جاتی ہے اور غلط کاموں پر جو ڈانٹ پڑتی ہے' اسے آدمی ایک دفعہ سن لے گا' دو مرتبہ سن لے گا' بار بار کون سننے آئے گا؟ میرے چند قریبی واقف کار میرے پیچھے جمعہ پڑھنا چھوڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ تمہاری تقریر بہت سخت ہوتی ہے۔ تم کاروبار میں سود کی آمیزش پر قرآن و حدیث کے حوالے سے تنقیدیں کرتے ہو اور وعیدیں سناتے ہو۔ تم متعدد غیر اسلامی معتقدات اور رسوم و رواج پر شدید گرفت اور نکیر کرتے ہو۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اور جن حالات سے گزر رہے ہیں' ان میں ان کا ترک کرنا ہمارے لیے مشکل ہی نہیں محال ہے۔ تمہاری تقریریں سن کر ہمارا ضمیر ملامت گر ہمیں سرزنش کرتا ہے۔ اس کشمکش سے بچنے کے لیے ہم نے تمہارے پیچھے جمعہ پڑھنا اور تمہارے درس میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اگر مجھے صرف درسِ قرآن اور محض علمی نکات ہی کو بیان کرنا ہوتا تو موجودہ حاضری سے دس گنا زیادہ حاضری ہو سکتی تھی۔ لیکن میں قرآن کا عملی پیغام پیش کرتا ہوں' صرف علمی نکات پیش کرنا اور اس میدان میں موشگافیاں کرنا ذہنی عیاشی بن جائے گی۔ میرا قلب و ذہن مجھ سے پوچھتا ہے کہ اگر تم نے صرف یہی کچھ کیا تو اللہ کے ہاں کیا جواب دو گے؟ تم نے سب کچھ ہضم کر لیا ہے' اگر اس قرآن کو بھی ہضم کر گئے تو ﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰﴾ (المرسلٰت)

''پس اس کے بعد کون سی بات ہے جس پر تم ایمان لاؤ گے؟''

خلاصۂ بحث

یہ چند باتیں بطورِ جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آ گئیں۔ اب خوب توجہ سے میری آج کی تقریر کا خلاصہ پھر سن لیجیے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اپنے فہم کی حد تک قرآن کا جو پیغام سمجھا ہے' وہی پیغام ہمیں احادیث میں ملتا ہے اور وہی پیغام ہمیں سیرتِ مطہرہ سے ملتا ہے ـــــ اسی بات کو میں نے آج اسوۂ حسنہ کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھا ہے ـــــ اور وہ اُسوۂ حسنہ یہ ہے:

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوت ایمان باللہ ٗ ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت کسی تبلیغی ٗ رفاہی ٗ اصلاحی ٗ علمی وتحقیقی اور سیاسی نوعیت کی نہیں تھی ٗ بلکہ خالص انقلابی نوعیت کی دعوت تھی ۔ یہ تمام کام اس میں بطور اجزاء شامل تھے ۔ چنانچہ اس دعوت کے نتیجے میں جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا ہوا ٗ اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی ۔ عقائد و نظریات ٗ سیرت وکردار ٗ نظامِ حکومت وسیاست ٗ علوم وفنون ٗ قانون واخلاق ٗ تہذیب و تمدن اور معاشرت ومعیشت ٗ الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا ۔

یہ انقلابی جدوجہد خالص انسانی سطح (human level) پر قدم بقدم چل کر کی گئی اور ایک انقلابی جدوجہد کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ٗ وہ سب مراحل نبی اکرم ﷺ کی اس انقلابی دعوت کو بھی پیش آئے ___ اللہ کی نصرت وتائید بھی حاصل ہوئی لیکن اُس وقت جب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جان نثار صحابہ کرام ؓ نے اپنی امکانی حد تک اس جدّوجُہد میں مثالی قربانی اور ایثار پیش کیا ۔

آپؐ کی جدوجہد جن مراحل سے گزری ان کو دو دو الفاظ کے جوڑوں کے ساتھ میں نے تین حصوں میں منقسم کر کے قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے ۔

☆ پہلا مرحلہ : دعوت وتربیت

☆ دوسرا مرحلہ : تنظیم وہجرت

☆ تیسرا مرحلہ : جہاد وقتال

اس مختصر وقت میں ٗ میں نے کوشش کی ہے کہ دعوت وتربیت اور تنظیم وہجرت کے ضمن میں ضروری نکات آپ کے سامنے پیش کر دوں ۔ دعوت وتربیت کے مرحلے کے متعلق میں نے آپ کے سامنے چند اہم نکات اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بیان کر دیئے ہیں ۔ دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کی تنظیم تو آپ سے آپ ہو جاتی تھی ٗ کیونکہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور آپ کو رسول اللہ تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ تمام اہل ایمان ٗ ایک تنظیم ٗ ایک جماعت اور ایک اُمت بن جائیں اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بے چون وچرا تسلیم ورضا کی کیفیات کے ساتھ پیروی کریں ۔ پھر ہجرت تو

تنظیم کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کچھ اختیار کرو گے تو کچھ ترک بھی کرنا پڑے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی ہے تو ہر اُس چیز کو چھوڑنا ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے۔ کسی سے جڑو گے تو کسی سے کٹو گے بھی۔ سیدھی سیدھی بات ہے۔ دین پر عمل کرنے کے باعث آج اپنے دوست سے کٹے تو کل اپنے بھائی سے کٹو گے۔ ہوسکتا ہے کہ بیوی سے بھی کٹنا پڑ جائے۔ ہوسکتا ہے وہ وقت بھی آ جائے کہ ہر ایک چیز سے کٹنا پڑ جائے۔ تو جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر پختہ یقین رکھتے ہیں' وہ کٹ جایا کرتے ہیں۔ وہ گھر بار کو حتیٰ کہ وطن کو بھی چھوڑ کر ایسے نکل جاتے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ ہمارا وطن تھا۔ لیکن جو کسی اصول کی خاطر ایک دوست اور ایک بھائی سے نہ کٹ سکا وہ اللہ اور اس کے دین کے لیے اپنا وطن کیسے چھوڑ دے گا؟ جو ایک پیسے میں امین ثابت نہ ہو کیا وہ لاکھ روپے میں امین ثابت ہوگا؟ جو چھوٹا سا وعدہ پورا نہ کر سکے' وہ بڑے بڑے وعدے پورے کرے گا؟ یہ باتیں ناممکنات میں سے ہیں ___ ہجرت تنظیم کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک ہے۔

پھر جہاد ہے۔ ''جہاد'' دراصل اس جدوجہد کا نام ہے جس میں ایک بندۂ مؤمن باطن میں اپنے نفس سے اس کو اللہ اور رسول کا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے کشمکش کرتا ہے' اور ظاہر میں دعوتِ حق کی تبلیغ کے لیے بھاگ دوڑ' سعی و کوشش اور اس کے قیام کے لیے محنت و مشقت بھی اسی جہاد میں شامل ہوتی ہے ___ پھر قتال ہے۔ جب بھی اس کا مرحلہ آ جائے تو ایک بندۂ مؤمن اس کے لیے تیار بھی رہے اور اس کی تمنا کی دل میں پرورش بھی کرتا رہے۔ حضورﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شخص نے نہ تو اللہ کے راستے میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی تمنا پیدا ہوئی اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی''۔

اہلِ ایمان سے مطلوب رویہ

سورۃ الاحزاب میں زیر درس آیت ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کے بعد کی دو آیات یہ ہیں:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۫ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾﴾

''اور سچے مؤمنوں کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے (غزوۂ احزاب کے موقع پر) حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا(1) اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے (یعنی وہ صبر وثبات سے ڈٹے بھی رہے) اور ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا (یعنی اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا) اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے۔ اور انہوں نے اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

اس آیت میں ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ'' خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ایک مؤمن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ بڑے ذوق وشوق اور اشتیاق کے ساتھ اس بات کا منتظر رہے کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر سرخرو ہو۔ اس لیے کہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ کی رو سے اہلِ ایمان اللہ سے سودا کر چکے ہیں اور جنت کے عوض اپنا مال اور اپنی جان اس کے ہاتھ بیچ چکے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾﴾ (التوبۃ)

''یقیناً اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پھر قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کے اس طرزِ عمل پر پختہ وعدہ ہے تورات میں بھی'

(۱) اشارہ ہے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۵ کی طرف۔

انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو! پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت شریفہ میں لفظ ''بیع'' جس سے ''بیعت'' بنا ہے' پوری جامعیت کے ساتھ قول وقرار اور عہد وپیمان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کی رو سے مؤمنین تو اپنے مال اور اپنی جان اللہ کے ہاتھ بیچ چکے۔ اب جب بھی یہ مرحلہ آئے تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کی یہ امانت اسے لوٹانے کے لیے میدانِ کارزار میں نکلیں گے۔ لیکن اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مرحلہ کب آئے گا۔ آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ پتہ نہیں کہ کب کیا مرحلہ آ جائے اور کیا صورت حال پیدا ہو جائے! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص دعوت دیتا رہے اور اسی میں اس کی زندگی تمام ہو جائے اور اس کو ایک ساتھی بھی نہ ملے۔ نبیوں کے باب میں بھی ایسا ہوا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ تمکن عطا فرما دے۔ اس کا دارومدار ہماری سوچ پر نہیں ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے۔ مدینہ کی کھڑکی تو اللہ نے خود کھولی۔ مکہ میں اہلِ یثرب کے چھ اشخاص ایمان لے آئے۔ اگلے سال بارہ آدمی آ گئے اور اس سے اگلے سال پچھتر آ گئے اور بیعت عقبہ ثانیہ منعقد ہوئی۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے قدم مبارک ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں تھے کہ مدینہ کو دار الہجرت بننے کی سعادت حاصل ہو گئی اور وہاں حضور ﷺ کی تشریف آوری کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار ہونے لگا اور استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جبکہ مکہ جہاں حضور ﷺ بہ نفس نفیس تیرہ برس سے دعوت دے رہے ہیں' وہ خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔ کون سے حساب کتاب میں یہ چیز آتی ہے؟ یہ مشیتِ الٰہی ہے۔ آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی لال بجھکڑ بن کر کہے کہ یوں ہوگا تو اس کی بات درخورِ اعتناء نہیں ہوگی۔ ہم اُسوۂ رسول ﷺ کے راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اخلاص ہمارے شاملِ حال رہا تو اس راہ میں پوری زندگی کھپا کر یا سر کٹا کر دُنیوی اعتبار

سے ناکام ہو جانا بھی ہمارے لیے کامیابی ہے' اور کامیاب ہو گئے تو پھر تو کامیاب ہیں ہی۔ اسی کو قرآن ''اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ'' سے تعبیر کرتا ہے۔ اس راہ میں آخرت کے اعتبار سے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ بالاکوٹ کے میدان میں راہ حق میں سر کٹانے والے کیا ناکام ہوئے؟ ہرگز نہیں! ان کی کامیابی پر تو فرشتے رشک کرتے ہوں گے۔ وہ تو شہادت کے مرتبے پر فائز ہیں' جو انبیاء اور صدیقین کے بعد آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔

ہم نے اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں ''تنظیم اسلامی'' سمع و طاعت کی بیعت کی بنیاد پر بنائی ہے۔ اگرچہ ہم بہت کچے ہیں' تعداد کے لحاظ سے بھی قافلہ بہت ہی چھوٹا ہے اور اب تک جو ساتھی ملے ہیں وہ معیارِ مطلوب سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن میں اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس معاشرے میں سے مجھے جو ساتھی ملے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ میں اللہ کے ہاں اپنا جواب تیار کر رہا ہوں کہ اے میرے ربّ! میں نے کچھ اور نہیں کیا۔ مجھے تو نے جو صلاحیت' طاقت' توانائی اور استعداد عطا فرمائی تھی میں نے اسے تیری کتاب مبین کے پیغام اور اسوۂ رسول ﷺ کی طرف دعوت دینے میں لگایا اور کھپایا ہے۔ میں نے مداہنت نہیں کی ہے میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند! میں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ یہ کہوں گا تو اہلِ حدیث ناراض ہو جائیں گے اور وہ کہوں گا تو احناف مجھ سے خفا ہو جائیں گے یا لوگ میرے دروس و خطابات میں آنا چھوڑ دیں گے۔ میں نے جس بات کو قرآن و سنت کے مطابق حق سمجھا ہے اسے ڈنکے کی چوٹ کہا ہے' برملا کہا ہے' بغیر خوف لَوْمَةَ لَائِم کہا ہے' صرف اللہ کے خوف اور اس بات کو پیشِ نظر رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴿١٨﴾﴾ (ق) ''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران نہ ہو''۔ اور آج میں نے اسوۂ رسولؐ کے حوالے سے اپنی استعداد کی حد تک ساری بات آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب آپ سوچیے کہ آپ کس مقام پر کھڑے ہیں؟ فیصلہ آپ کا ہے۔ ذمہ داری آپ کی ہے۔ جواب دہی آپ کو کرنی ہے۔ بات پوری سامنے

آ چکی ہے۔ لیکن اگر کوئی تنظیم اسلامی کی دعوت کو مزید سمجھنا چاہتا ہو تو میں اس کو دعوت دوں گا کہ وہ تنظیم کے کتابچوں کا مطالعہ کر لے پھر فیصلہ کرے۔ میں آپ کو یہ حدیث نبویؐ سنا چکا ہوں کہ: ((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ :بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعت کا اور سمع و طاعت کا اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا'' ـــــ چنانچہ جماعت کے بغیر زندگی بسر کرنا خلافِ سنت زندگی ہے۔ کوئی اپنی جگہ بڑے سے بڑا سنت کا پرچارک بنا ہوا ہو اور خود کو متبع سنت سمجھتا ہو' اگر وہ نظم جماعت کے بغیر زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی پوری زندگی خلافِ سنت ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ۔ رضائے الٰہی اور اسوۂ رسول کی پیروی کے لیے جب تک اپنے آپ کو ایسی جماعت کے حوالے نہ کر دیا جائے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے قائم ہو' زندگی بحیثیت مجموعی سنت کے مطابق نہیں ہوگی اور بات وہی ہوگی جو حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی تھی کہ مچھر چھانے جائیں گے اور سموچے اونٹ نگلے جائیں گے۔

اسوۂ رسول ﷺ سے میں نے دین کے انقلابی پیغام کے لیے دعوت و تربیت' تنظیم و ہجرت اور جہاد و قتال کے مراحل اور اس کام کے لیے ایک ''تنظیم'' کی ضرورت کے دلائل آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ یہ بات قرآن حکیم سے سمجھنا چاہیں تو تھوڑے سے غور و تدبر کے بعد اِن شاء اللہ سورۂ آل عمران کی یہ آیت مبارکہ تنظیم کی دعوت کو سمجھنے کے لیے کفایت کرے گی:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ١٠٤﴾

''تم میں سے ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے' بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکتی رہے۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اور

اس کے تقاضے

ترتیب

- حُبِّ رسول کا تقاضا: اتباعِ رسول 339
- اتباعِ رسولؐ کا ایک اہم پہلو 340
- رسولِ اکرم ﷺ کی سعی و جُہد کا ہدف! 341
- ہدف کی تعیین کی اہمیت 341
- رسولوں کو بھیجنے کا مقصد 349
- نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت: غلبۂ دین 352
- انقلابِ اسلامی کے لیے حضور ﷺ کا طریقِ کار 355
- مراحلِ انقلاب 357
- دورِ حاضر میں انقلابِ اسلامی کا طریقِ کار 364
- حاصلِ کلام 370

اسلامی جمعیت طلبہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور کی دعوت پر محترم ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کیمپس میں کالج کے ہاسٹل کی مسجد میں ۱۴ نومبر ۸۷ء کو یہ خطاب ارشاد فرمایا تھا جسے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے ٹیپ کی ریل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔

الحمد للّٰہ و کفی والصّلاۃُ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ افضلھم و خاتم النّبیین محمد الامین و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔ اما بعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید)

و قال تبارک و تعالیٰ:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ (الفتح)

و قال اللہ عزوجل:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (آل عمران) ...... صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ

ان آیات کی تلاوت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے درودِ ابراہیمی پڑھا اور ارشاد فرمایا:

عزیز طلبہ! مجھے ابھی یہ بتایا گیا ہے کہ اس وقت کی میری گفتگو کا موضوع ’’حب رسولؐ اور اس کے تقاضے‘‘ رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ بات میرے علم میں نہیں آئی تھی‘ بلکہ مجھے عمومی انداز میں کہا گیا تھا کہ مجھے سیرتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر گفتگو کرنی ہوگی ـــــ بہرحال ان دونوں چیزوں کے مابین کوئی زیادہ فرق اور

بعد نہیں ہے' ان کو آسانی سے باہم جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن میری آج کی گفتگو زیادہ تر جس تناظر میں ہوگی وہ سورۃ الحدید کی وہ آیتِ مبارکہ ہے جس پر میں ابھی قرآن اکیڈمی میں مفصل درس دے کر آ رہا ہوں۔ میں نے آج کے اس اجتماع میں حاضری سے اسی بنیاد پر معذرت کی تھی کہ ہفتہ کو بعد نمازِ مغرب قرآن اکیڈمی میں میرا درسِ قرآن ہوتا ہے۔ ہم وہاں گزشتہ آٹھ ہفتوں سے سورۃ الحدید کا سلسلہ وار مطالعہ کر رہے ہیں اور آج کی نشست میں اس سورۂ مبارکہ کی پچیسویں آیت زیرِ درس تھی' جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی ہے۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کی نگاہوں سے شاید آج اخبارات میں وہ اشتہار بھی گزرا ہو جس میں اس درس سے متعلق میں نے تین سوالات معیّن کیے تھے۔ پہلا یہ کہ ''اسلام صرف تبلیغی مذہب ہے یا انقلابی دین؟'' دوسرے یہ کہ ''اسلامی انقلاب کا اصل ہدف کیا ہے؟'' اور تیسرا یہ کہ ''کیا اسلامی انقلاب کے لیے طاقت کا استعمال جائز ہے؟'' —— انہی تین سوالات کے حوالے سے میں اس وقت سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں کچھ عرض کروں گا۔ باقی جہاں تک آپ کے مقرر کردہ موضوع کا تعلق ہے' اس سے اس کا بالکل واضح تعلق یہ ہے کہ حُبِّ رسولؐ کا اصل تقاضا ہے اتباعِ رسول ﷺ —— اپنی اس بات کی تاکید و تائید کے لیے میں نے آغاز میں سورۂ آل عمران کی آیت ۳۱ بھی تلاوت کی تھی جس سے ہمارے دین میں اتباعِ رسول کی جو اہمیت ہے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۳۱﴾

''اے نبی (ﷺ! اہل ایمان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو (میری راہ پر چلو) تا کہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے' اور اللہ ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا۔''

حُبِ رسول کا تقاضا: اِتباعِ رسول

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دو اہم الفاظ ایسے ہیں جو اللہ کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی۔ پہلا لفظ ہے اطاعت اور دوسرا ہے محبت۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ —— اسی طرح محبت کا لفظ اللہ کے لیے بھی آتا ہے اور رسولؐ کے لیے بھی۔ جیسے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

"(اے نبی ﷺ! ان مدعیانِ ایمان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور جمع کیے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جو تم نے بڑی مشقت سے جمائے ہیں اور جس میں تمہیں کساد کا اور مندے کا خوف رہتا ہے اور اپنی وہ بلڈنگیں جو تم نے بڑے ارمانوں کے ساتھ تعمیر کی ہیں جو تمہیں بڑی بھلی لگتی ہیں' اگر یہ چیزیں تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے' اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

تو یہاں اللہ کی محبت کے ساتھ ہی رسول کی محبت کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی جہاد فی سبیل اللہ کی محبت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

اب میری بات کو غور سے سماعت فرمایئے۔ جب اللہ کی اطاعت اور اللہ کی محبت دونوں کو جمع کریں گے تو اس کا جو حاصل جمع ہوگا اس کا نام "عبادت" ہے۔ عبادت صرف اللہ کی ہے' رسول کی نہیں ہے۔ اور جب رسول کی اطاعت اور رسول کی محبت کو جمع کریں گے تو اس کے حاصل جمع کو عبادت نہیں کہا جائے گا بلکہ "اتباع" کہا جائے گا۔

عبادت کا اصل مفہوم ہے: ''انتہائی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ کی بندگی اور پرستش کرنا'' اور اتباع کا مفہوم ہے: ''محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر پیروی کرنا''۔ اطاعت اور اتباع میں کیا فرق ہے' اس کو بھی سمجھ لیجیے۔ اطاعت کی جاتی ہے کسی کے حکم کی' جبکہ اتباع یہ ہے کہ کسی ہستی سے اتنی محبت ہو جائے کہ چاہے اس نے حکم نہ دیا ہو لیکن اس ہستی کے ہر عمل اور فعل کی پیروی کرنا۔ گویا بقول شاعر ؎

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں!

تو اتباع کا درجہ اطاعت سے بہت بلند ہے اور اس کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ اطاعت میں صرف حکم پیشِ نظر ہوگا اور اتباع میں نبی اکرم ﷺ کے ہر ہر عمل اور فعل کو بلکہ ہر ہر اَدا کی پیروی کو سعادت سمجھا جائے گا چاہے آپؐ نے اس کا حکم نہ دیا ہو۔

حاصل گفتگو یہ کہ حُبِّ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تقاضا ہے اتباعِ رسول ﷺ۔

اتباعِ رسولؐ کا ایک اہم پہلو

اسی اتباعِ رسول کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ بحیثیت مجموعی حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا رُخ کیا تھا! آپؐ نے کس کام کے لیے محنت کی! آپؐ کو کیا فکر دامن گیر تھی! آپؐ نے اپنی دن رات کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت کا ہدف کیا معین فرمایا! — اس دنیا میں ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لیے کوئی نہ کوئی ہدف معین کرتا ہے' پھر اس کی ساری محنت اور بھاگ دوڑ اسی رخ پر ہوتی ہے۔ کوئی اپنے پیشے (profession) میں اعلیٰ سے اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کے لیے اور اپنا مقام بنانے کے لیے محنت اور سعی و جہد کرتا ہے۔ کوئی سیاست دان ہے' اس کا بھی ایک ہدف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو' اقتدار اس کے ہاتھ میں یا اس کی پارٹی کے ہاتھ میں آئے۔ کاروباری آدمی ہے تو اس کا بھی ایک ہدف ہے' وہ محنت کر رہا ہے' مشقت کر رہا ہے' راتوں کو جاگ رہا ہے' کہاں کہاں سے سامانِ تجارت منگاتا اور کہاں کہاں بھیجتا ہے! دنیا بھر کی مارکیٹوں میں چیزوں کے نرخوں کے اتار چڑھاؤ' کی بیشی کی خبر رکھتا ہے۔ یہ ساری سوچ اس کے ہدف کے تابع ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کی سعی و جُہد کا ہدف!

اب سوال یہ ہے کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو انتہائی جاں گسل محنت و مشقت کی زندگی بسر کی تو اس کا ہدف کیا تھا؟ جو شخص سیرتِ مطہرہ کا سرسری سا بھی مطالعہ کرتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے مشن کے لیے کتنی محنت کی ہے اور کتنی مشقت جھیلی ہے۔ ہم اگر حضور ﷺ کا اتباع کرنے کے خواہشمند ہیں تو ہمارے لیے سب سے اہم بات یہ طے کرنے کی ہوگی کہ حضور ﷺ کی زندگی کا رُخ کیا تھا! آپ کے سامنے کیا مقصد تھا! کس ہدف کے حصول کے لیے آپؐ نے سعی و جہد فرمائی تھی! اس کے ضمن میں ایک اور بات بھی سامنے رکھئے کہ اگر خود آپ کا ایک مقصد معین ہے تو اس کے حصول کے لیے آپ کو کئی کام کرنے پڑتے ہیں۔ آپ اگر ان کئی کاموں کو علیحدہ علیحدہ (isolate) کر کے دیکھیں گے تو وہ آپ کو مختلف نظر آئیں گے' ان میں بظاہر ربط نظر نہیں آتا' لیکن دراصل ان کو باہم مربوط کرنے والا ''ایک مقصد'' ہوتا ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھیں تو وہ تمام افعال جو بظاہر مختلف اور متضاد معلوم ہوتے ہیں' وہ سب کے سب مربوط نظر آئیں گے اور درحقیقت ان کا باہمی ربط اس وقت تک قائم کرنا مشکل ہوگا جب تک واضح طور پر ''مقصد'' سامنے نہ ہو۔ ان بظاہر مختلف و متضاد افعال میں باہمی ربط و توافق تب ہی نظر آئے گا اور قائم ہو سکے گا جب مقصد معین طور پر سامنے موجود ہوگا۔

ہدف کی تعیین کی اہمیت

اس مسئلہ کی اہمیت میں آپ حضرات کے سامنے واضح کر دوں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں بعض پہلو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں' اور یہ تضادات اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں جب حضور ﷺ کی زندگی کا ہدف اور مشن ہمارے سامنے ہو۔ دشمنانِ اسلام خاص طور پر مستشرقین نے ان پر اعتراضات بھی کیے ہیں اور حملے بھی۔ میں ان میں سے چند کا بطور مثال ذکر کرتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ مکہ میں نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم سخت ترین مصیبتیں جھیل رہے ہیں' حضورؐ کے ساتھیوں کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے' مکہ کی سنگلاخ اور تپتی ہوئی زمین پر گردن میں رسی ڈال کر جانوروں کی لاش کی طرح گھسیٹا جا رہا ہے۔ ایک مؤمنہ کو نہایت بہیمانہ ہی نہیں بلکہ انتہائی کمینگی سے شہید کیا جا رہا ہے۔ ایک مؤمن کے ہاتھ پاؤں چار اونٹوں سے باندھ کر ان اونٹوں کو چار سمت میں ہانک دیا جاتا ہے کہ جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں' لیکن جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے۔ مکہ میں بارہ برس تک حضور ﷺ کے کسی جاں نثار نے مشرکینِ مکہ کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی' کوئی بدلہ نہیں لیا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کا فرمان تھا کہ اپنے ہاتھ باندھے رکھو! کوئی جوابی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ حالانکہ مکہ میں جو حضراتِ گرامی دولت ایمان سے مالا مال ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک شجاعت و بہادری میں اگر ایک ایک ہزار کے برابر نہیں تو ایک ایک سو کے برابر ضرور تھا' اور ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے حکم ''کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ'' کی تعمیل میں کسی نے اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایک طرف یہ انتہا ہے' دوسری طرف مدنی دَور میں حضور ﷺ کے ہاتھ میں تلوار ہے' علم ہے۔ آپؐ کے جاں نثار اصحاب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں' نیزے ہیں' تیر کمان ہیں۔ جوابی کارروائی ہو رہی ہے' بلکہ جیسا کہ میں ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے موضوع پر اپنی مسلسل تقریروں میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں[1] کہ صرف جوابی کارروائی ہی نہیں بلکہ ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے اقدام میں پہل کی ہے۔

لیکن پچھلی چند صدیوں میں جب نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام کے کثیر رقبہ پر مغربی سامراج کا سیاسی و عسکری استیلاء تھا اور اکثر مسلم ممالک کسی نہ کسی مغربی طاقت کے غلام تھے' حکمران اقوام کی طرف سے اسلام پر بڑے شدید اعتراضات کیے گئے کہ اسلام بڑا خونخوار مذہب ہے' مسلمان بڑی خونی قوم ہے اور اسلام تو تلوار کے زور پر

---

(۱) الحمدللہ اس موضوع پر ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے نام سے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے دس خطابات کتابی شکل میں موجود ہیں۔

پھیلا ہے ؏ ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے''۔ اغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شد و مد سے لگائی کہ علامہ شبلی مرحوم جیسے عالم دین' سیرت نگار' مؤرخ نے بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا اور سیرت کی پہلی جلد میں لکھ دیا کہ نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اقدام میں نہ پہل کی اور نہ تلوار اٹھائی' بلکہ تلوار اگر اٹھائی تو مجبوراً اور اپنی مدافعت میں اٹھائی۔ علامہ شبلی مرحوم تو پھر بھی اس معاملے میں قابل عفو قرار دیے جا سکتے ہیں کہ ان کا دَور وہ تھا جب انگریز کی حکومت تھی' اس کا غلبہ تھا۔ لیکن مجھے نہایت حیرت اور افسوس اس بات پر ہے' اور یہ بات قابلِ اعتبار ذرائع سے میرے علم میں آئی ہے کہ حال ہی میں ایک دینی جماعت کے پلیٹ فارم سے ایک نامور عالمِ دین کی طرف سے پاکستان کی آزاد فضا میں یہ کہا گیا ہے کہ ''اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے' بلکہ صرف مدافعانہ جنگ ہے۔ حضور ﷺ اور خلافت راشدہ کے دَور میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں وہ صرف دفاعی جنگیں تھیں''۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

ضمنی طور پر یہ مسئلہ زیر گفتگو آ گیا ہے تو ایک اہم اور اصولی بات عرض کر دوں کہ تصادم کا آغاز اصولاً داعی انقلاب کرتا ہے' اقدام اُس کی جانب سے ہوتا ہے۔ آپ حضرات غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کہاں سے فرمایا! آپؐ نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور گلی گلی صدا بلند فرمائی: ((یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا)) (مسند احمد) اس دعوت کے مضمرات اور مفہوم پر غور کیجیے' حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ تمہارا مذہب غلط ہے اور اس مشرکانہ مذہب پر قائم شدہ تمہارا نظام فاسد ہے۔ یہ صدیوں سے قائم و رائج نظام کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے یا نہیں؟ مکہ کی پُرامن فضا میں نعرۂ بغاوت کس نے بلند کیا؟ پرسکون شہری زندگی کے تالاب میں پتھر کس نے پھینکا کہ پورے تالاب میں ارتعاش کی لہریں اٹھ گئیں!

اب اصل گفتگو کی طرف آیئے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ہجرت کے بعد مکہ والوں کے خلاف اقدام میں پہل حضور ﷺ کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہجرت کے بعد پہلے چھ مہینے حضور ﷺ نے داخلی استحکام میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد آپؐ نے غزوۂ بدر سے

قبل آٹھ چھاپہ مار دستے بھیجے جن میں سے چار میں آپؐ خود سپہ سالار تھے۔ ان مہموں کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تھا قریش مکہ کے قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانا جو قریش کی معاشی زندگی کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسے موجودہ دَور کی اصطلاح میں قریش کا ''economic blockade'' کہا جائے گا۔ دوسرا مقصد تھا قریش کی سیاسی ناکہ بندی' جو آج کی اصطلاح میں ''political isolation & containment of Quraish'' کہلائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ اور مدینہ منورہ کے مابین بسنے والے بعض قبیلوں کو اپنا حلیف بنالیا اور بعض کو غیر جانب دار کہ وہ جنگ کی صورت میں نہ حضور ﷺ کا ساتھ دیں گے نہ قریش کا۔ انہی مہموں میں سے ایک مہم عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں وادیٔ نخلہ بھیجی۔ یہ وادی طائف اور مکہ کے مابین واقع ہے اور اس راستے سے قریش کے تجارتی قافلے طائف سے ہو کر یمن کے ساحل تک جاتے تھے۔ حضور ﷺ کی ہدایت تھی کہ قریش کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھو اور ہمیں خبر دیتے رہو۔ ان حضراتؓ کو لڑائی کا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن صورتِ حال ایسی پیش آئی کہ اس دستہ کی قریش کے ایک قافلے سے مڈبھیڑ ہو گئی جو کافی مالِ تجارت اور پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ان مشرکین میں سے ایک شخص قتل ہوا' دو افراد فرار ہو گئے' دو کو قیدی بنالیا گیا اور ان کو اور مالِ غنیمت کو لے کر یہ حضراتؓ مدینہ واپس آ گئے۔ تفاصیل کے لیے نہ موقع ہے نہ وقت۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ہجرت کے چھ ماہ بعد آٹھ مہمات کی صورت میں اقدام کی پہل نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہوئی اور پہلا مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

مزید برآں یہ بات تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد متعدد جنگیں لڑی ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں نقشہ کھینچا گیا ہے: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (التوبة: ۱۱۱) ''اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔ تو مکی زندگی اور مدنی زندگی کا فرق آپ کے سامنے ہے۔ ان میں بظاہر بہت بڑا تضاد موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور مؤرخ ٹائن بی (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۵ء) جسے اس دَور میں فلسفہ

تاریخ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے' اس نے ایک جملے میں پورا زہر بھر دیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ وہ کہتا ہے:

"Muhammad failed as a Prophet but succeeded as a statesman"

اس کے اس جملہ کی زہرناکی کو آپ نے محسوس کیا! وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مکہ میں محمد (ﷺ) کی زندگی تو نبیوں کے مشابہ ہے۔ دعوت ہے' تبلیغ ہے' وعظ ہے' نصیحت ہے' تلقین ہے' انذار ہے' تبشیر ہے' صبر ہے' پتھراؤ ہو رہا ہے' لیکن جوابی کارروائی نہیں ہو رہی ہے۔ عیسائیوں کے جو آئیڈیل ہیں یعنی حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام' ان کی زندگی کا نقشہ یہی تو تھا! حضرت مسیحؑ نے تلوار تو کبھی نہیں اٹھائی! آپؑ کبھی کسی حکومت کے سربراہ تو نہیں بنے! حضرت یحییٰؑ کے ہاتھ میں بھی کبھی تلوار نہیں آئی! تو ٹائن بی کے نزدیک مکہ میں حضور ﷺ کی جو سیرت نظر آتی ہے وہ نبوت کے نقشہ پر کچھ نہ کچھ پوری اترتی ہے۔ وہ اگرچہ حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتا لیکن یہ مانتا ہے کہ سیرت کا مکہ میں جو نقشہ ہے وہ نبیوں کی سیرت و زندگی سے مشابہ ہے' لیکن اس کے کہنے کے مطابق وہاں حضور ﷺ ناکام ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ وہاں سے تو جان بچا کر نکلنا پڑا۔ البتہ اسے مدینہ میں محمد رسول اللہ ﷺ بالکل ایک نئی شکل میں نظر آتے ہیں۔ سپہ سالار ہیں' شہسوار ہیں' صدر مملکت ہیں' مدینہ کی شہری ریاست کے سربراہ ہیں' آپؐ ہی چیف جسٹس ہیں' مقدمات آ رہے ہیں اور آپؐ فیصلے صادر فرما رہے ہیں۔ معاہدے کر رہے ہیں' مدینہ آتے ہی یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدہ میں جکڑ لیا ہے' عرب کے دوسرے قبائل سے معاہدے ہو رہے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ صورت تو ایک سیاستدان (statesman) کی نظر آتی ہے۔ اس میں پیغمبرانہ شان اسے نظر نہیں آتی۔ اس کا کہنا ہے کہ سیاست دان کی حیثیت سے محمد ﷺ کامیاب ہو گئے' ان کی کامیابی بحیثیت پیغمبر نہیں تھی۔

اسی ایک جملہ کی شرح ہے جو ایک برطانوی مؤرخ مسٹر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء تا ۲۰۰۶ء) نے ایک دوسرے انداز سے کی ہے۔ آپ حضرات نے نام سن رکھا ہوگا۔ مرکزی حکومت کے زیر اہتمام اسلام آباد میں ہر سال جو سیرت کانفرنس ہوتی ہے تو چند

سال قبل مسٹر واٹ کو حکومت کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ آ کر ہمیں سیرتِ مطہرہ سمجھائے۔ اس شخص نے سیرت پر دو کتابیں علیحدہ علیحدہ لکھی ہیں۔ ایک کا نام ہے ''Muhammad at Mecca'' اور دوسری کا نام ہے ''Muhammad at Medina'' (ﷺ) اس نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو دو حصوں میں بانٹ کر دراصل اس ظاہری تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکہ والے محمد (ﷺ) اور ہیں جبکہ مدینہ والے محمد (ﷺ) اور ہیں۔ میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اور بظاہر تضاد واقعتاً نظر آتا ہے۔ دشمنوں نے اسے exploit کیا اور اسے تنقید و تنقیص کا موضوع بنالیا۔ لیکن ہمیں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دو رنگ جدا ہیں۔ میں بعد میں وضاحت کروں گا کہ ان کا آپس میں ربط کیا ہے۔

اب دوسری نمایاں مثال میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ سب نے پڑھ رکھا ہوگا اور سن رکھا ہوگا کہ ۶ ھ میں حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور قریشِ مکّہ کے مابین صلح کا ایک معاہدہ ہوا تھا جو صلح حدیبیہ کے نام سے سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس صلح کی شرائط بڑی حد تک یک طرفہ نظر آتی ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے دب کر صلح کی ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتہائی مضطرب اور بے چین تھے کہ دب کر کیوں صلح کی جا رہی ہے! ہم اتنے کمزور تو نہیں' ہم حق پر ہیں' ہم حق کے لیے جانیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موت پر بیعت کر چکے تھے' سب حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر عہد کر چکے تھے کہ ہم سب یہاں جانیں دے دیں گے' پیٹھ نہیں موڑیں گے۔ پھر ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ صلح کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ واپس جاؤ' احرام کھول دو' اس دفعہ عمرہ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اوّل تو یہی بات صحابہ کرامؓ کے لیے ناممکن القبول تھی۔ احرام باندھ کر آئے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ میں اضطراب پیدا ہوا کہ عمرہ کیے بغیر احرام کیسے کھول دیں! پھر ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے ولی اور سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا (یعنی اسلام قبول کر کے جائے گا) تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا' لیکن اگر کوئی شخص

مدینہ سے اسلام چھوڑ کر (مرتد ہو کر) مکہ آ جائے گا تو اسے قریش واپس نہیں کریں گے۔ بظاہر بڑی غیر منصفانہ بات تھی۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے جز بز ہوئے' ان کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ یہ صلح تو مساوی شرائط پر نہیں ہو رہی۔

چنانچہ جب صلح نامہ پر دستخط کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ احرام کھول دیے جائیں اور قربانی کے جو جانور ساتھ ہیں ان کی یہیں قربانی دے دی جائے تو اس وقت صحابہ کرامؓ کے جذبات کا عالم یہ تھا کہ کوئی نہیں اٹھا۔ کیفیت یہ تھی کہ گویا اعصاب اور اعضاء شل ہو گئے ہیں۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ پھر فرمایا کہ احرام کھول دیے جائیں اور قربانیاں دے دی جائیں' لیکن پھر بھی کوئی نہیں اٹھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملول اور رنجیدہ ہو کر خیمہ میں تشریف لے گئے۔ عام معمول یہ تھا کہ سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی نہ کوئی زوجہ محترمہؓ ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس سفر میں حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے ساتھ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ذکر فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! آپ کسی سے کچھ نہ کہئے' بس آپ قربانی دے دیجیے اور احرام کھول دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے' قربانی دی اور حجام کو بلایا کہ میرے سر کے بال مونڈ دو اور آپؐ نے احرام کھول دیا۔ صحابہ کرامؓ نے جب یہ دیکھا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ جو صحابہ قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرا کے احرام کھول دیے۔ اس صورتِ حال کی تاویل اور توجیہہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ پر اُس وقت انتظار کی سی حالت طاری تھی' وہ اس خیال میں تھے کہ شاید کوئی نئی شکل پیدا ہو جائے' شاید نئی وحی آ جائے۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دیا تو حالت منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے حکم کی تعمیل کی' ورنہ معاذ اللہ ہم صحابہ کرامؓ کے متعلق ہرگز کسی حکم عدولی کا گمان تک نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ سارا پس منظر آپ حضرات کے سامنے قدرے تفصیل سے اس لیے رکھا ہے کہ آپ صحیح اندازہ کر سکیں کہ ۶ ھ میں حدیبیہ کے مقام پر جو صلح کا معاہدہ ہوا اس کی شرائط واقعتاً غیر مساوی تھیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر دب کر صلح فرما رہے تھے۔ گویا اُس وقت آپؐ بہر صورت صلح کرنا چاہتے تھے۔

لیکن دو سال بعد جب ایک موقع پر قریش نے معاہدے کی ایک شق کی خلاف ورزی کی' اور جب حضور ﷺ نے اس خلاف ورزی پر ان کی گرفت فرمائی تو قریش مکہ نے خود صلح کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ تب ابوسفیان کو' جو اُس وقت پورے قریش کے قبیلہ کی سرداری کے منصب پر فائز تھے' یہ احساس ہوا کہ جذبات میں آ کر ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے' یہ صلح تو ہمارے تحفظ (protection) کی حامل تھی' اس صلح کی تجدید ہونی چاہیے۔ چنانچہ ابوسفیان خود چل کر مدینہ پہنچے' سر توڑ کوششیں کیں' سفارشیں ڈھونڈیں کہ کسی طرح حضور ﷺ صلح کی تجدید کی منظوری دے دیں۔ لیکن بارگاہِ رسالت سے ابوسفیان کی صلح کی تجدید کے لیے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ نبی اکرم ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا اور صلح کی تجدید کی حامی نہیں بھری۔ غور کیجیے' یہاں بھی بظاہر ایک بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ دو سال پہلے بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں اور دو سال بعد قریش کے سردار کی طرف سے صلح کی درخواست ہو رہی ہے اور اس مقصد کے لیے وہ خود مدینہ آیا ہے لیکن حضور ﷺ صلح نہیں فرما رہے۔

اب یہ جو ظاہری تضادات نظر آ رہے ہیں ان کے مابین ربط قائم کرنا ہو گا۔ لیکن یہ ربط کس چیز کے ذریعے قائم ہو گا؟ یہ ربط قائم ہو گا نبی اکرم ﷺ کے اصل ہدف اور مقصود کی تعیین سے' جس کے لیے آغازِ نبوت سے مسلسل جدوجہد ہو رہی ہے۔ تو جان لیجیے کہ یہ ہدف اور یہ مقصود و مطلوب ہے: ''اللہ کے دین کو غالب کرنا''۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک وقت میں ہاتھ روکنے کا حکم ہے' مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے' جبکہ ایک وقت میں ہاتھ کھولنے اور اقدام کرنے کا حکم ہے۔ ایک وقت میں اسی مقصد کے لیے صلح مفید ہے' لہٰذا صلح کی جا رہی ہے' اپنی انانیت کو آڑے آنے نہیں دیا جا رہا' دب کر اور کسی قدر شکست خوردگی کے انداز میں صلح کی جا رہی ہے اور ایک وقت میں اس مقصد کی خاطر جب صلح نہ کرنا مفید ہے تب صلح نہیں کی جا رہی ہے۔ تمام تضادات درحقیقت مقصد کو صحیح طور پر سمجھ لینے ہی سے رفع ہوتے ہیں۔ مستشرقین نے دراصل جو ٹھوکر کھائی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کے بنیادی مقصد ہی کو نہیں سمجھا۔

رسولوں کو بھیجنے کا مقصد

قرآن مجید میں رسولوں کی بعثت کا بنیادی مقصد سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''بلاشبہ بالتحقیق ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ''۔ یعنی واضح تعلیمات اور واضح نشانیاں دے کر۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور ہم نے ان رسولوں کے ساتھ کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی''۔ یہ سب کس لیے کیا! رسول کیوں بھیجے! کتاب اور میزان کس لیے نازل فرمائی! اس مقصد کو آیت کے اگلے حصہ میں معین فرمایا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تا کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوں''۔ گویا رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجنے اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان یعنی شریعت نازل فرمانے کی غایت اور مقصد بیان فرما دیا گیا: تا کہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہوں۔ ظلم کا خاتمہ ہو جائے' جبر اور استبداد کا خاتمہ ہو جائے اور استحصال کا قلع قمع ہو جائے۔ لیکن یہ نظامِ عدل کون سا ہو گا؟ ایک عدل کا نظام وہ ہے جو انسان اپنے ذہن سے بناتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی System of Social Justice وجود میں آ جائے۔ چنانچہ نظامِ عدل اجتماعی کا ایک تصور وہ ہے جو کمیونسٹوں کے ہاں ملتا ہے' جبکہ ایک تصور مغربی ممالک کا ہے۔ کوشش سب کی یہ ہے کہ ہم کسی حقیقی نظامِ عدلِ اجتماعی تک پہنچ جائیں' لیکن انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے جتنے تصورات ہیں ان میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نقص یا خامی رہ جاتی ہے۔ حقیقی نظامِ عدلِ اجتماعی صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے سے نوعِ انسانی کو عطا فرماتا ہے' جسے ہم دین و شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اللہ کے آخری نبی اور رسول محمد ﷺ پر اس شریعت کی تکمیل ہو گئی ہے۔ یہ نظام جس نے ہر ایک کے فرائض اور حقوق کا صحیح صحیح تعین کر دیا ہے۔ جس نے طے کر دیا ہے کہ کس کو کیا دیا جائے گا اور کس سے کیا وصول کیا جائے گا۔ جس نے معاشرے کے تمام طبقات کے حقوق و فرائض کا تعین نہایت متوازن اور فطری انداز میں کیا ہے اور جس نے ہر شعبۂ زندگی کا احاطہ کیا ہے' جس میں معاشرت بھی ہے اور سیاست بھی' تجارت بھی ہے اور معیشت بھی۔ جان

لیجیے کہ اس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا انبیاء کی بعثت کا ایک اہم مقصد رہا ہے اور یہ ہے وہ بات جو سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں بیان ہوئی ہے۔

اب ذرا اس پہلو پر غور کیجیے کہ اس نظامِ عدل وقسط کے قیام میں رکاوٹ کون بنے گا؟ ظاہر بات ہے کہ جو مظلوم ہیں وہ تو چاہیں گے کہ ظلم کا خاتمہ ہو' جو مُستضعفین ہیں' جنہیں دبالیا گیا ہے' جن کے حقوق غصب کیے گئے ہیں وہ تو چاہیں گے کہ ظالمانہ نظام ختم ہو جائے اور عادلانہ نظام قائم ہو۔ لیکن جو ظالم ہیں' جنہوں نے ناجائز طور پر اپنی حکومتوں کے قلادے لوگوں کی گردنوں پر رکھے ہوئے ہیں' جنہوں نے دولت کی تقسیم کا ایک غیر منصفانہ نظام قائم کیا ہوا ہے' جس کے باعث ان کے پاس دولت کے انبار جمع ہو رہے ہیں چاہے دوسروں کو دو وقت کی روٹی بھی نہ مل رہی ہو' کیا وہ کبھی پسند کریں گے کہ استحصالی وظالمانہ نظام ختم ہو جائے اور عدل وقسط کا نظام قائم ہو؟ شریعتِ خداوندی و میزانِ عدل نصب ہو جائے! ان کی عظیم اکثریت یہ تبدیلی بالکل پسند نہیں کرے گی۔ لیکن ان طبقات میں بھی کچھ سلیم الطبع لوگ ہوتے ہیں جو بیدار ہو جاتے ہیں' ان کو احساس ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ نظام غلط ہے' باطل ہے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کے نتیجہ میں خود آلِ فرعون میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تھے۔ قرآن حکیم میں ایک مؤمن آلِ فرعون کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ المؤمن میں ان کی پوری تقریر نقل کی گئی ہے' جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ﴾ (آیت ۲۸) یہ صاحب جو آلِ فرعون کے اہم سرداروں میں سے تھے' فرعون کے دربار میں ان کا اونچا مقام تھا' ایمان لے آئے تھے! یہ اس لیے ہوا کہ ان کی انسانیت بیدار تھی۔ معلوم ہوا کہ ظالم اور استحصالی طبقات میں بھی کچھ سلیم الفطرت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب حق کی دعوت ان کے سامنے آتی ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ہمیشہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے' جبکہ عظیم اکثریت انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ حالات جوں کے توں (status quo) رہیں' تاکہ ان کے مفادات اور منفعتوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔ جاگیرداری نظام ہے تو

جاگیردار کبھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہے تو سرمایہ دار کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ ہندو معاشرے میں برہمن کبھی پسند نہیں کرے گا کہ ذات پات کی اونچ نیچ ختم ہو جائے۔ برہمن کو جو اونچا مقام ملا ہوا ہے کیا وہ چاہے گا کہ شودر کو اس کے برابر بنا دیا جائے؟ لہٰذا چاہے سماجی ظلم ہو' چاہے معاشی ظلم ہو اور چاہے سیاسی ظلم ہو' ظالم طبقات کی عظیم اکثریت اپنے اس ظالمانہ نظام کی مدافعت اور محافظت (protection) کے لیے میدان میں آ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحدید کی اس آیتِ مبارکہ کے اگلے ٹکڑے میں فرما دیا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ ایسے لوگوں کی سرکوبی اور علاج کے لیے ہم نے لوہا بھی اتارا ہے۔ لوہے میں جنگ کی صلاحیت ہے' اس سے اسلحہ بنتا ہے۔ لوگوں کے لیے اس لوہے میں دیگر تمدنی فائدے بھی ہیں۔ لیکن اس آیت کی رو سے لوہے کا اصل مقصد یہ ہے کہ میزانِ خداوندی کے نصب کرنے کے مشن میں جو لوگ بھی رسولوں کے اعوان وانصار بنیں اور نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہو جائیں' وہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع اس لوہے کی طاقت کو استعمال کریں اور ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو اِس راہ میں مزاحم ہوں۔ چنانچہ اسی آیت مبارکہ کے اگلے حصہ میں اس کو اللہ تعالیٰ ایمان کی کسوٹی اور اپنی اور اپنے رسولوں کی نصرت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ یعنی اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو غیب میں رہتے ہوئے اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ آیتِ مبارکہ ختم ہوتی ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ ''بے شک اللہ قوی ہے' زور آور ہے' زبردست اور غالب ہے''۔ یعنی لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کی راہ میں محنت کرنے اور اللہ کی نازل کردہ میزانِ شریعت کو نصب کرنے کی تعلیم وہدایت اس لیے نہیں دی جا رہی کہ معاذ اللہ' وہ تمہاری مدد کا محتاج ہے' اُس القوی العزیز کو تمہاری مدد کی کیا حاجت! البتہ تمہاری وفاداری اور ایمان کا امتحان مقصود ہے۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت

قرآن مجید کی بڑی انقلابی آیت ہے اور اس میں عمومی اسلوب و انداز میں ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر رسولوں کی بعثت کا مقصد' ان کو کتاب و میزان دینے کی غایت اور لوہے کے نزول کا سبب بیان ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت: غلبۂ دین

یہی بات اور یہی مضمون' معین طور پر جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے امتیازی مقصد کے ذکر میں قرآن حکیم میں تین جگہ یعنی سورۃ التوبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں فرمایا گیا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ''وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو'' (اب یہاں واحد کا صیغہ آیا رسول' جبکہ سورۃ الحدید میں آیا تھا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا﴾ وہاں رُسل جمع کا صیغہ تھا) کیا دے کر بھیجا! ﴿بِالْهُدٰی﴾۔ پہلی چیز جو حضور ﷺ دے کر بھیجے گئے وہ ہے الھدیٰ یعنی قرآن حکیم' ابدی ہدایت نامہ ۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ اُو رحمۃ للعالمین

آپ کو یاد آ گیا ہوگا کہ ٹیلی ویژن پر کبھی میرا ایک پروگرام چلتا تھا' میں نے اس کا نام خود ''الھدیٰ'' تجویز کیا تھا اور وہ اسی آیت سے ماخوذ تھا۔ لیکن حضور ﷺ کو صرف الھدیٰ نہیں دیا گیا بلکہ ایک اور چیز بھی عطا کی گئی ﴿وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾ ''اور حق کا دین یا سچا دین'' بھی دیا گیا۔ یہ ہے وہ نظام' جو عدل و قسط پر مبنی ہے۔ اللہ کی طرف سے نوعِ انسانی کے لیے آخری اور مکمل شریعت! رسول اللہ ﷺ کو کیوں بھیجا گیا! حضور ﷺ کو دین حق کس لیے دیا گیا! اس امتیازی مقصد کی تعیین اِس آیت سے واضح ہوئی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ حضور ﷺ نے دعوت بھی دی' تبلیغ بھی فرمائی' تربیت بھی دی' تزکیہ بھی کیا۔ یہ سب کچھ کیا' لیکن اس تمام جدوجہد (struggle) کا مقصد (goal) کیا ہے! وہ ہے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''تاکہ اس دین حق کو (اور اس نظامِ عدل و قسط کو) پورے نظامِ اطاعت پر غالب کر دیں'' —— زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہ رہ جائے۔ معاشرت ہو' معیشت ہو' سیاست ہو' حکومت ہو' قانون ہو' دیوانی قانون ہو چاہے فوجداری ہو' عبادات ہوں' معاملات ہوں' صلح و جنگ ہو' ہر شے دین حق کے تابع ہو جائے۔ اسی

مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرمایا۔ ﷺ

اب آپ غور کیجیے کہ یہ ہے مقصد بعثت تمام رسولوں کا کہ نظامِ عدل وقسط قائم ہو' ظلم' ناانصافی' جبر واستبداد اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے اور اس نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے نازل فرمایا' اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والے اپنے سردھڑ کی بازی لگا دیں۔ یہی مقصدِ بعثت جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا ہے جو قرآن حکیم میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اب جبکہ حضور ﷺ کی بعثتِ خصوصی کا مقصد معین ہو گیا تو اللہ اور اس کے آخری نبی و رسول ﷺ پر ایمان لانے اور حضور ﷺ سے محبت کا دعویٰ کرنے کے کچھ نتائج اور تقاضے ہیں جو سامنے آتے ہیں۔ میں اب انہیں ترتیب وار آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حضور ﷺ کی محبت اور آپؐ کے اتباع کا پہلا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ہماری زندگی کا مقصد وہی ہو جائے جو آپؐ کی بعثت کا مقصد ہے۔ باقی تمام چیزیں اس کے تابع ہو جائیں۔ اگر مقصد یہ نہیں ہے پھر تو نقشہ ہی جدا ہو گیا۔ ہم نے زندگی کے بعض گوشوں میں حضور ﷺ کی پیروی کر لی' مثلاً آپؐ کے لباس کی' وضع قطع کی' آپؐ کے روزانہ کے معمولات کی پیروی کر لی تو اپنی جگہ ہر چیز مبارک ہے' حضور ﷺ کے نقشِ قدم کی جس طور اور جس انداز سے بھی پیروی کی جائے گی وہ نہایت مبارک ہے' لیکن بحیثیتِ مجموعی حضور ﷺ نے اپنی زندگی کی جدوجہد کا جو رُخ معین فرمایا وہ اگر ہم نے اختیار کیا نہیں تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اتباع نتیجہ خیز نہیں ہو گا۔ جیسے کہ سورۃ البقرۃ کے سترہویں رکوع میں فرمایا گیا: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ (آیت ۱۴۸) ''ہر شخص کے سامنے کوئی ہدف ہے' کوئی مقصد ہے' جس کی طرف وہ بڑھ رہا ہے''۔ آپ حضرات نے struggle for existance کے نظریہ کا مطالعہ کیا ہو گا۔ آپ لوگ تو میڈیکل کے طلبہ ہیں' ظاہر بات ہے کہ آپ نے ڈارون کا فلسفہ پڑھا ہو گا اور آپ اس کے نظریہ survival of the fittest سے واقف ہوں گے۔ اس جہادِ زندگانی میں ہر شخص زور لگا رہا ہے' آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ہدف ہے۔ تو پہلی چیز

جو حضور ﷺ کی محبت کے تقاضا کے طور پر سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ ہمارا ہدف بھی وہی ہو جائے جو حضور ﷺ کا تھا۔ اس وقت اس ہدف کے لفظ سے بے اختیار میرا ذہن علامہ اقبال مرحوم کے اس مصرع کی طرف منتقل ہوا کہ ع ''آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!'' تیر انداز پہلے تو اپنا ایک نشانہ مقرر کرتا ہے کہ میں نے تیر مارنا کہاں ہے پھر اس کی قوت روبعمل آتی ہے۔ وہ جتنے زور کے ساتھ کمان کو کھینچ سکے گا اسی زور سے وہ تیر اپنے ہدف کی طرف جائے گا۔ علامہ نے اس مصرع میں دو چیزیں جمع کر دیں ——— کسی تیر انداز کی جدوجہد کے ضائع اور بے نتیجہ ہونے میں دو عوامل (factors) شامل ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہدف (goal) معین نہیں۔ دوسرا یہ کہ کمان کو نیم دلانہ اور پوری قوت سے کھینچا نہیں گیا ہے' اس پر پورا زور نہیں لگایا گیا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کوئی تیر اِدھر کو چلا گیا کوئی اُدھر کو چلا گیا۔ ضروری ہوگا کہ ہدف بھی صحیح معین ہو اور پھر پوری قوت کے ساتھ تیر چلا کر اس ٹارگٹ کو hit کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ دونوں چیزیں نہیں ہوں گی تو تیر بے کار جائے گا۔

بہر حال میں جو بات عرض کر رہا تھا وہ یہ ہے کہ حب رسول کا پہلا تقاضا ہے اتباعِ رسول۔ اس اتباعِ رسولؐ کی پہلی منزل یہ ہو گی کہ ہر مسلمان شعوری طور پر اپنی زندگی کا ہدف معین کر لے کہ میری زندگی کا مقصد' میری زندگی کا ہدف' میری بھاگ دوڑ کی منزل مقصود وہی ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی تھی اور وہ ہے اللہ کے دین کا غلبہ۔ اسے ملک نصر اللہ عزیز مرحوم نے ایک بڑے سادے انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

میں نماز پڑھتا ہوں تا کہ اللہ یاد رہے' روزہ رکھتا ہوں تا کہ نفس کے مُنہ زور گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت مجھ میں برقرار رہے' زکوٰۃ ادا کرتا ہوں تا کہ مال کی محبت دل میں ڈیرا لگا کر نہ بیٹھ رہے' لیکن ان تمام اعمال کو ایک وحدت میں پرونے والا مقصد کیا ہے! وہ ہے اللہ کے دین کی سرفرازی' اللہ کے دین کی سربلندی۔ جس شخص کی زندگی کا ہدف یہ

نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہیں سے اس کی زندگی کا کانٹا بدل گیا' اب اس کا رُخ کچھ اور ہو گیا۔ اب بعض اجزاء میں وہ حضور ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کر بھی رہا ہے تو اب پٹڑی بدل گئی اور بحیثیت مجموعی حضور کا اتباع مقصود و مطلوب نہ رہا تو اب اس جزوی پیروی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ البتہ بحیثیتِ مجموعی اگر رخ وہی اختیار کر لیا تو اب ہر معاملہ میں حضور ﷺ کی پیروی نور علیٰ نور کے درجہ میں آ جائے گی۔

انقلابِ اسلامی کے لیے حضور ﷺ کا طریقِ کار

اب دوسری بات کو لیجیے! اس منزل کے حصول اور اس منزل تک رسائی کا راستہ کون سا ہے! یہ ہم کہاں سے معلوم کریں گے! اس معاملے میں بھی رہنمائی ہمیں سیرتِ رسولؐ ہی سے ملے گی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہر کام ہر طریقے پر نہیں ہو سکتا۔ ہر کام کے لیے ایک طریقہ معین ہے۔ گندم کاشت کرنی ہے تو اس کا ایک خاص موسم ہے' اسی میں آپ کاشت کریں گے تو آپ کو فصل ملے گی۔ ورنہ بیج بھی ضائع ہو جائے گا خواہ خلوص و اخلاص کتنا ہی ہو۔ پھر یہ کہ اس کے لیے زمین کو تیار کرنا ہو گا۔ زمین تیار نہیں کی اور آپ گندم کے بیج بکھیر آئے تو کیا فصل مل جائے گی! معلوم ہوا کہ گندم کے حصول کا ایک نہج ہے' منہج ہے' طریق کار ہے۔ اگر اس کی پیروی نہیں کریں گے تو گندم نہیں اُگے گی۔ اسی طرح اس نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لیے بھی' جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا' وہی طریق کار اختیار کرنا ہو گا جو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا۔ اگر ایک شخص غلط فہمی میں ایک طریق کار پر عمل کر رہا ہے' وہ اپنی جگہ مخلص ہے' وہ سمجھتا ہے کہ اسی طریقے سے اسلامی انقلاب آ جائے گا' اسلامی نظامِ عدل و قسط قائم ہو جائے گا تو خلوص کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر مل جائے گا' لیکن دُنیا میں اس کی محنت کامیاب نہیں ہو گی۔ لہٰذا ہمارا دوسرا شعوری فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ حضور ﷺ نے کس طریقے سے انقلاب برپا فرمایا' کس نہج سے نظامِ عدل و قسط قائم فرمایا' کس طریقے سے ظالمانہ استبدادی اور استحصالی نظام کو ختم کر کے ''لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' کی منزل تک رسائی فرمائی؟

جب ہمارا یہ شعوری فیصلہ ہو جائے گا تو اب ضرورت ہوگی کہ ہم سیرتِ طیبہ کا گہرا مطالعہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے حضور ﷺ نے کیا طریق کار (method) اختیار فرمایا تھا۔ اس لیے کہ کسی معاشرے میں انقلاب لانے کے لیے ہر طریقہ کارگر اور مفید نہیں ہوتا' بلکہ جس قسم کی تبدیلی لانی ہو یا جس نوعیت کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو' اسی کی مناسبت سے طریق کار وضع کیا جاتا ہے۔ میں ایک مثال عرض کر دوں۔ اشتراکی انقلاب کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ جب تک اس نظریے کے شیدائی اور کامریڈز کسی معاشرے میں طبقاتی شعور (class consciousness) پیدا نہیں کرتے کہ یہ اہلِ ثروت (haves) ہیں اور وہ محرومین (have nots) 'یہ مراعات یافتہ اور استحصالی طبقات ہیں اور وہ دبے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات ہیں۔ جب تک اس شعور کو مظلوم طبقات کے ذہنوں میں راسخ نہیں کر دیا جائے گا' اس وقت تک اشتراکی انقلاب کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھ سکے گا۔ پہلے یہ طبقاتی شعور (class consciousness) پیدا کرنا ہوگا۔

دوسرا مرحلہ ہوگا طبقاتی کشاکش اور تصادم (class struggle) کا۔ اب طبقات کو طبقات سے ٹکرایا جائے۔ اس کے بغیر اشتراکی انقلاب کے لیے دوسرا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ ان کے علاوہ اشتراکیوں کے دوسرے مختلف ہتھکنڈے ہیں' افراتفری پیدا کرنا' بدنظمی پیدا کرنا' اسی طرح علاقائی اور لسانی عصبیتوں کا پیدا کرنا کہ ہم سندھی ہیں' ہم بلوچی ہیں' ہم پختون ہیں' ہم پنجابی ہیں' ہم مہاجر ہیں۔ ہماری تہذیب علیحدہ ہے' ہماری ثقافت علیحدہ ہے' ہماری زبان علیحدہ ہے۔ اس طریقے پر ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں اور عصبیتوں کو ابھار کر باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دینا' یہ کمیونسٹوں کی جدید تکنیک ہے۔ اس میں بموں کے دھماکوں اور دوسری تخریب کاریوں کے ذریعے سے چاہے بوڑھوں' بچوں' عورتوں اور متعدد بے گناہ لوگوں کی جانوں کو نشانہ بنانا پڑے' چاہے ان کو قربانی کا بکرا بنانا پڑے' لیکن یہ چیزیں اشتراکی انقلاب لانے کی کوششوں کے لوازم میں شامل ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ کوئی شخص شریف النفس ہے' وہ مغالطوں کا شکار ہو کر اشتراکی نظریہ کا

معتقد تو ہو گیا' مارکسسٹ تو بن گیا' لیکن ان تخریبی کاموں میں حصہ لینے کے لیے تیار نہیں تو وہ حقیقی کمیونسٹ نہیں ہے۔ اس کے لیے ان کاموں میں حصہ لیے بغیر اشتراکی انقلاب نہیں آ سکتا' اس کا ایک طریق کار ہے اس کا ایک set pattern بن چکا ہے۔ اسی طریق سے سمجھ لیجیے کہ اسلامی انقلاب کے لیے بھی صرف وہی طریقہ مفید اور مؤثر ہوگا جس طریقے سے حضورﷺ نے انقلاب برپا فرمایا تھا۔ چنانچہ اب ہماری علمی کاوش اور جستجو یہ ہوگی کہ ہم سیرتِ مطہرہ کا معروضی (objectively) مطالعہ کریں اور حضور اکرمﷺ کے طریق انقلاب کو جاننے کی کوشش کریں۔

مراحلِ انقلاب

میں نے نبی کریمﷺ کے منہجِ انقلاب کو سمجھنے کے لیے سیرتِ مطہرہ کا جب مطالعہ کیا تو انقلاب کے مختلف مراحل کا ایک واضح خاکہ میرے سامنے آ گیا اور اس خاکے کی روشنی میں سیرت کے تمام واقعات مجھے انتہائی مربوط و بامعنی معلوم ہوئے۔ میرے مطالعے کا حاصل یہ ہے کہ انقلابی جدوجہد کے چھ مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ ہے دعوت وتبلیغ کا۔ یعنی انقلابی نظریئے کی نشرواشاعت! اسلام کا انقلابی نظریہ ہے نظریۂ توحید۔ جان لیجیے کہ یہ نظریہ نہایت انقلابی ہے اور اس کی زد بہت دُور دُور تک پڑتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی میدان میں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ سب کا خالق ایک اللہ ہے۔ پیدائشی اعتبار سے کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے۔ ذات پات اور حسب ونسب کی بنیاد پر تمام تقسیموں کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ اسی توحید کی ایک فرع (corollary) یہ ہے کہ حاکم صرف اللہ ہے۔ ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ﴾ (یوسف:۴۰) یعنی حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے نظام کو قائم کرے۔ ہاں اللہ کی عطا کردہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ سیاست کے میدان میں اس سے بڑا انقلابی نظریہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اسی طرح معاشیات کے میدان میں توحید کا تقاضا کیا ہے! ﴿لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُن کا مالک صرف اللہ ہے“۔ ملکیت انسان کے لیے ہے ہی نہیں۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے بطورِ امانت ہے۔ اصل مالک تو اللہ ہے ۔

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست درحقیقت مالک ہر شے خداست

ملکیت میں تصرف کا حق لامحدود ہوتا ہے۔ آپ کا مال ہے آپ جو چاہیں کریں‘ میری ملکیت ہے میں جو چاہوں کروں‘ میری بکری ہے جب چاہوں ذبح کروں مجھے کُلی اختیار حاصل ہے۔ لیکن امانت میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ امانت میں مالک کی مرضی کے مطابق تصرف ہوگا۔ مالک کی مرضی کے خلاف اگر تصرف کیا جائے گا تو وہ خیانت شمار ہوگا۔ نظریۂ توحید کے تین تقاضے آپ کے سامنے آ گئے۔ معاشرتی سطح پر انسانی مساوات‘ سیاسی سطح پر اللہ کی حاکمیت اور انسان کے لیے خلافت کا تصور اور معاشی سطح پر ملکیت کی بجائے امانت کا تصور!

انقلابی جدوجہد کے دوسرے مرحلے کا عنوان ہے تنظیم۔ یعنی وہ لوگ جو شعوری طور پر توحید کی اس انقلابی دعوت کو قبول کر لیں‘ انہیں منظم کیا جائے‘ جماعتی شکل میں organize کیا جائے‘ اس لیے کہ محض نظریہ کی دعوت و تبلیغ سے انقلاب نہیں آ سکتا جب تک اس کی پشت پر فدائین اور سرفروشوں کی جماعت نہ ہو۔ اشتراکی انقلاب کو دیکھ لیجیے۔ جب تک اشتراکی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش نہیں کرتے‘ جب تک وہ جیلوں کو نہیں بھر دیتے‘ جب تک وہ پھانسی کے پھندوں کو چوم کر اپنے گلوں میں نہیں ڈالتے‘ کیا کمیونسٹ انقلاب کہیں آ سکتا ہے! اسی طریقے سے اسلامی انقلاب کے لیے ایک جماعت چاہیے‘ جان نثاروں کی جماعت جو پورے طور پر منظم ہو۔ جس کے لیے ہماری دین کی اصطلاح ہے سمع و طاعت (listen and obey) سنو اور اطاعت کرو۔ گویا ڈسپلن اس نوع کا ہونا چاہیے جیسے فوج میں ہوتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے نظم کے ساتھ انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔

تیسرا مرحلہ ہے تربیت اور تزکیہ کا‘ یعنی جس اللہ کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہو‘ اس کے احکام کو پہلے اپنے اوپر نافذ کرو۔ جس رسول ﷺ کے اتباع میں انقلاب برپا کرنے چلے ہو‘ پہلے اس رسولؐ کی ہر اَدا کو اپنی سیرت میں جذب کرو۔ جب تک یہ نہیں ہوگا کوئی کوشش بارآور نہیں ہوگی۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص بہت فعال ہے‘ تنظیمی اور جماعتی کاموں میں لگا رہتا ہے‘ بہت بھاگ دوڑ کرتا ہے‘ لیکن اس سے دین کے احکام پر عمل میں کسل مندی‘ تساہل اور بے رغبتی کا اظہار ہوتا ہے‘ تو ایسے سپاہیوں سے گاڑی نہیں چلے گی۔ ایسے لوگ کسی امتحان کے مرحلہ میں خالی کارتوس ثابت ہوں گے۔ لہٰذا تیسرا نہایت اہم مرحلہ ہے تربیت اور تزکیہ کا۔ صحابہ کرامؓ حضور نبی کریم ﷺ کی تربیت کا شاہکار تھے‘ ہمارے لیے اصل آئیڈیل وہ ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جو تربیت حضور ﷺ نے فرمائی تھی صحابہ کرامؓ کی اس کی کوئی اور نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ وہ بات ہے جس کی گواہی دشمنوں کی طرف سے ملی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب سپاہِ اسلام ایرانیوں کے خلاف صف آرا تھیں تو رستم سپہ سالارِ افواجِ ایران نے مسلمان فوجوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے کچھ جاسوس بھیجے۔ وہ بھیس بدل کر مسلمانوں کے کیمپ میں کچھ دن تک حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ واپس جا کر انہوں نے رستم کو رپورٹ پیش کی کہ هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ ”یہ عجیب لوگ ہیں‘ رات کو راہب نظر آتے ہیں اور دن میں شہ سوار ہیں“۔ دُنیا نے یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ تو دیکھی تھیں۔ عیسائی راہب بڑی تعداد میں موجود تھے۔ آپ نے بحیرہ راہب کا واقعہ سنا ہوگا جس نے حضور ﷺ کو آپ کے بچپن میں پہچان لیا تھا۔ حضور ﷺ کے زمانہ تک عیسائیوں میں بڑے مخلص راہب موجود تھے۔ انہی میں وہ راہب بھی تھا جس نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا پتا دیا کہ جاؤ میرا علم بتاتا ہے کہ کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخر الزمان کے ظہور کا وقت آ گیا ہے‘ جاؤ قسمت آزمائی کرو۔ اندازہ لگائیے کہ وہ کتنا بڑا عالم و راہب ہوگا۔ لیکن جو راہب ہوتے تھے وہ دن کے وقت بھی راہب ہوتے تھے اور رات کے وقت بھی۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تو نظر نہیں آتی۔ اسی

طرح قیصر و کسریٰ کی افواج بھی موجود تھیں، لیکن جو دن کا فوجی ہے وہ رات کا بھی فوجی ہے۔ جہاں رات کو فوج کا پڑاؤ ہو جاتا تھا وہاں آس پاس کی کسی عورت کی عصمت کا محفوظ رہ جانا ایک معجزہ ہوتا تھا۔ گل چھرّے اڑائے جا رہے ہیں، شراب کے دَور چل رہے ہیں، دل کھول کر عیاشی ہو رہی ہے۔ اب نبی اکرم ﷺ کی تربیت و تزکیہ کا کمال دیکھئے کہ دو متضاد چیزوں کو جمع کر دیا۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار پر اس سے زیادہ جامع تبصرہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ''هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ'' کہ رات کو یہ راہب نظر آتے ہیں، اللہ کے حضور سربسجود ہیں، قیام کی حالت میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے اور سجدہ گاہیں آنسوؤں سے تر ہیں، لیکن دن کے وقت یہی لوگ بہترین شہسوار ہیں اور نہایت دلیری سے لڑتے ہیں۔

تو جان لیجیے کہ کسی انقلابی جدوجہد کے یہ تین ابتدائی مراحل ہیں۔ دعوت، تنظیم اور تربیت و تزکیہ۔ ان تینوں کا حاصل یہ ہے کہ ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے جو ایک طاقت اور قوّت بن جائے۔ اس قوّت و طاقت کا کام یہ ہے کہ جب تک یہ طاقت بڑھ رہی ہے، grow کر رہی ہے، اپنے آپس کے روابط و تعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرے۔ اپنی تنظیم کو مضبوط سے مضبوط تر کرے، اپنی دعوت کے ذریعے سے اپنے حلقہ اثر اور base کو وسیع کرنے کی جدوجہد کرے، جب تک اتنی طاقت نہیں ہو جاتی کہ وہ باطل سے ٹکرا سکے اس وقت تک صبر محض پر عامل رہے۔ ''كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ'' ہاتھ بندھے رکھو! '' چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیے جائیں، تم ہاتھ مت اٹھاؤ۔ میں اس کا اجمالی تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ انقلابی جدوجہد میں اس صبرِ محض (passive resistance) کی بہت اہمیت ہوتی ہے، اس لیے کہ اگر ابتدائی مراحل میں انقلابی جماعت تشدد پر اتر آئے، violent ہو جائے تو اس معاشرے میں موجود باطل نظام کو اِس بات کا اَخلاقی جواز حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس مختصر سی انقلابی طاقت کو کچل ڈالے۔ اس کے برعکس اگر وہ انقلابی جماعت صبر محض کی پالیسی کو اختیار کرے اور ظالموں کی جانب سے تشدد کو جھیل جائے تو اس معاشرے کی رائے عامہ اس جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی

جائے گی۔ قدرتی طور پر رائے عامہ کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اِن لوگوں کو کیوں ایذائیں دی جا رہی ہیں' ان کا جرم کیا ہے؟ کیا انہوں نے چوری کی ہے' یا ڈاکہ ڈالا ہے؟ کیا کسی کی ناموس وآبرو پر ہاتھ ڈالا ہے؟ کیا کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب کیا ہے؟ ان لوگوں کا بس ایک جرم ہے کہ اللہ کو مانتے ہیں اور محمد ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں حکم یہی تھا کہ ہاتھ باندھے رکھو۔ مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر بدترین تشدد ہوا جسے مسلمانوں نے کمال صبر سے برداشت کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مکہ کے تمام لوگ تو سنگ دل نہیں تھے۔ وہاں کی خاموش اکثریت تو دیکھ رہی تھی کہ مسلمانوں کو ناحق ستایا جا رہا ہے اور یہی مسلمانوں کی اخلاقی فتح تھی جو بعد میں غزوۂ بدر میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ تین سو تیرہ بے سروسامان لشکر کے سامنے ایک ہزار کا مسلح لشکر ٹھہر نہ سکا اور مسلمانوں نے کفار کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

تو یہ صبرِ محض اس انقلابی تحریک کا نہایت اہم مرحلہ ہے۔ جب ہم ان مراحل کو ترتیب وار شمار کرتے ہیں تو صبرِ محض چوتھا مرحلہ قرار پاتا ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مرحلہ دعوت کے پہلے دن سے شروع ہو جاتا ہے اور ابتدائی تینوں مراحل یعنی دعوت' تنظیم اور تربیت کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تعذیب وتشدد پر صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنا اور اپنے موقف پر ڈٹے اور جمے رہنا انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور یہ صبرِ محض اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اتنی طاقت نہ ہو جائے کہ اس نظام کے ساتھ باضابطہ تصادم مول لے سکے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا' ٹھنڈے ٹھنڈے وعظ اور نصیحت سے انقلاب کبھی نہیں آیا' لیکن پختہ ہوئے اور مناسب تیاری کے بغیر ٹکراؤ ہو گیا تو تمام جدوجہد اکارت جائے گی۔ تقریر کے آغاز میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کوئی وجہ ہے کہ بارہ برس تک مشرکین کی طرف سے مکہ میں شدید ترین تشدد (persecution) ہو رہا ہے' انتہائی ایذا رسانی کا سلسلہ جاری ہے' لیکن حضور ﷺ کی طرف سے جوابی کارروائی

کی اجازت نہیں ہے۔ ہر نوع کے جور و ستم کو برداشت کرو' اگر اللہ ہمت دے تو ان کی گالیوں کے جواب میں دعائیں دو۔ اس طرح اہل ایمان کا امتحان بھی ہو رہا تھا' تربیت بھی ہو رہی تھی۔

لیکن جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہم برملا اور کھلم کھلا باطل کو چھیڑ سکتے ہیں' اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں' تو انقلاب کا پانچواں مرحلہ شروع ہو جائے گا جس کا عنوان ہے اقدام یعنی active resistance۔ یعنی اب اُس نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑا جائے گا۔ میں اس وقت اس معاملے کو بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔ جاننے کا شوق اگر دل میں پیدا ہو جائے تو میری کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کا مطالعہ کیجیے جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہمارے دَور میں اگر کوئی ایسی اسلامی انقلابی جماعت وجود میں آ جائے تو یہ فیصلہ کرنا کہ اب کافی طاقت فراہم ہو گئی ہے اور اقدام کا مرحلہ آ گیا ہے' اس کا انحصار امیر کے اجتہاد اور assessment پر ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کے لیے تو یہ فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا۔ ہجرت ہو رہی ہے' ساتھ ہی آیت نازل ہو گئی: ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝۳۹﴾ (الحج) اجازت دی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے کہ آج ان کے ہاتھ کھول دیے گئے' اب وہ بھی retaliate کر سکتے ہیں' بدلہ لے سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ کس کی طرف سے آیا! اللہ کی طرف سے' وحی کے ذریعے سے۔ اب وحی تو نہیں آئے گی۔ اب یہ فیصلہ اجتہاد سے ہو گا۔ اب فہم و ادراک کی پوری قوتیں کام میں لا کر فیصلہ کرنا ہو گا کہ کیا ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم باطل نظام کے ساتھ ٹکر لے سکتے ہیں! اگر مشورے کے بعد امیر جماعت کی یہ رائے بن گئی کہ ہمارے پاس معتدبہ تعداد میں ایسے کارکن موجود ہیں جو منظم ہیں' سمع و طاعت کے خوگر ہیں' ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے' ان کی اسلامی نہج پر تربیت ہو چکی ہے' تزکیۂ نفس کی وادی سے وہ گزر چکے ہیں' اللہ کی راہ میں جان دینے کو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں' وہ سینوں پر گولیاں کھانے کو تیار

ہیں‘ پیٹھ نہیں دکھائیں گے‘ اگر لاٹھیوں کی بارش ہوگی تو وہ بھاگیں گے نہیں‘ جیلوں میں بھرا جائے گا تو وہ جیلوں کو بھر دیں گے‘ کوئی معافی مانگ کر نہیں نکلے گا۔ جب اندازہ ہو کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے تو پھر چیلنج کیا جائے گا اور آگے بڑھ کر اقدام کیا جائے گا۔

سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہ اقدام ہمیں اس شکل میں ملتا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ تشریف لے جا کر ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں فرمایا۔ مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی ہرزہ سرائی دیکھئے کہ وہ ہجرت کا ترجمہ کرتے ہیں Flight to Madina۔ فلائٹ کا ترجمہ ہوگا فرار۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ فرار ہوتا ہے کسی مصیبت سے بچنے کے لیے بھاگ کر کہیں پناہ لینا۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ جا کر معاذ اللہ پناہ نہیں لی تھی۔ ہجرت دراصل عنوان ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ اور ان کے اعوان و انصارؓ کے لیے ایک base فراہم کر دی تھی کہ جہاں سے اسلامی انقلاب کی تحریک کو launch کرنا ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ حضورؐ نے مدینہ تشریف لا کر صرف چھ مہینے داخلی استحکام پر صرف فرمائے ہیں۔ اس عرصہ میں حضورؐ نے تین کام کیے ہیں۔ پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر‘ یہ مرکز بن گیا۔ دوسرا کام مہاجرینؓ اور انصارؓ کی مواخات اور تیسرا کام آپؐ نے یہ کیا کہ یہود کے تین قبیلوں سے معاہدے کر لیے۔ ان کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ طے پا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے‘ ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے لیکن اگر کبھی کسی طرف سے مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔

ان ابتدائی چھ مہینوں کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ آپؐ نے چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ قریش کی شہ رگ (life line) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کو مخدوش بنا دیا۔ ان مہموں کے متعلق میں اجمالاً گفتگو کر چکا ہوں۔ درحقیقت اس اقدام کا نتیجہ تھا کہ قریش کا ایک ہزار کا لشکر پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر حملہ آور ہوا تھا — سانپ بل سے باہر نکل آیا تھا — اور اس طرح انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا چھٹا اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (armed conflict) کا

آغاز ہو گیا۔ اب تلواریں اور نیزے ہیں' مقابلہ ہے۔ تلوار تلوار سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ چھٹا اور آخری مرحلہ (final phase) چھ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران میں ہر طرح کی اونچ نیچ آئی۔ بدر میں ستر کافر مارے گئے' چودہ مسلمان شہید ہوئے۔ اُحد میں ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ نشیب و فراز آئے ہیں۔ ﴿يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ''وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔ اللہ کی طرف سے یہ ضمانت نہیں تھی کہ اے اہلِ ایمان! میری راہ میں جنگ کرو' تم میں سے کسی کو کوئی آنچ نہیں آئے گی' یہ گارنٹی تو کہیں نہیں دی گئی تھی۔ تم کو تو اپنی جانیں دے کر اپنی صداقت کا ثبوت دینا ہے۔ عام اہلِ ایمان کو کہاں گارنٹی ملتی' حضور ﷺ کے لیے بھی گارنٹی نہیں تھی۔ طائف میں جب حضورؐ پر پتھراؤ ہوا ہے تو آپؐ کا جسدِ اطہر لہولہان ہوا کہ نہیں ہوا!! اُحد میں جب حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تلوار کا وار پڑا ہے تو آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے کہ نہیں ہوئے! خون کا فوارہ چھوٹا کہ نہیں چھوٹا اور حضور ﷺ کے رخسارِ مبارک پر خود کی دو کڑیاں گھسیں کہ نہیں گھسیں! یہ سب کچھ ہوا۔ ہاں ان تمام آزمائشوں سے گزرنے کے بعد' اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دینے کے بعد وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ اللہ کی غیبی تائید و نصرت آ کر رہتی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ کامیابی قدم چومے گی: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (آل عمران) ''اور تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مؤمن ہوئے''۔

دورِ حاضر میں انقلابِ اسلامی کا طریق کار

اسلامی انقلاب کے منہج کے یہ چھ مراحل ہیں جنہیں میں نے یہاں نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس انقلابی عمل (revolutionary process) کو میں نے حضور ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے سمجھا ہے اور اس معاملے میں میرا ماخذ صرف اور صرف سیرتِ محمدیؐ ہے۔ اب ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کروں گا اور وہ یہ کہ اس انقلابی عمل کے ابتدائی چار مراحل ہر دور میں بعینہٖ اسی طرح رہیں گے جیسے ہمیں سیرتِ مطہرہ میں نظر آتے ہیں۔ یعنی اسلامی انقلابی جدوجہد کا پہلا مرحلہ دعوت و تبلیغ کا ہو گا۔ اس میں

قرآن کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہوگی اور انقلابی نظریہ توحید ہی کا ہوگا۔ بقول اقبال ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علمِ کلام!

آج کے دور میں توحید بریلویوں اور اہلِ حدیث کے درمیان بحث و نزاع کا ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے' اس پر کھینچ تان ہو رہی ہے' ورنہ حقیقت میں توحید تو پورے ایک نظام تمدن' ایک نظامِ اجتماعی' ایک نظامِ عدل و قسط کی بنیاد ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے تنظیم۔ یہاں بھی ہمیں سیرتِ مطہرہ سے حاصل ہونے والے اُسوہ کو جوں کا توں اختیار کرنا ہوگا۔ اس تنظیم کے معاملے میں میرے نزدیک حضور ﷺ نے جو رہنمائی اُمت کو دی ہے وہ ہے نظامِ بیعت۔ اجتماعیت کے لیے بنیاد بیعت ہوگی۔ میری اس رائے سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے' لیکن میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک جماعت اور ایک تنظیم کی تاسیس کے لیے سیرتِ مطہرہ میں بیعت کی سنت کے علاوہ کوئی دوسری صورت موجود نہیں ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ملتی ہے' جس کی صحت پر اُمت کے دو جلیل القدر محدثین امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما متفق ہیں۔ سند کے اعتبار سے متفق علیہ سے زیادہ کسی روایت کا مقام نہیں ہوتا۔ اس حدیث کے الفاظ اس قدر جامع ہیں کہ میرا گہرا تاثر یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک صحیح اسلامی انقلابی تنظیم یا جماعت کا پورا دستور موجود ہے۔ میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ اس حدیث اور اس کے ترجمہ اور تشریح کو پوری توجہ اور غور کے ساتھ سماعت فرمایئے۔ حدیث ہے:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کہ جو حکم آپ ہمیں دیں گے ہم سنیں گے اور مانیں گے'

چاہے آسانی ہو چاہے تنگی ہو' چاہے وہ ہمارے نفس کو اچھا لگے چاہے اس کے لیے ہمیں اپنے نفس کو مجبور کرنا پڑے اور چاہے آپؐ ہم پر دوسروں کو ترجیح دیں' اور جس کو بھی آپؐ امیر مقرر فرمادیں گے ہم اس کا حکم مانیں گے اور اس سے جھگڑیں گے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہماری رائے ہوگی اور جس بات کو ہم حق سمجھیں گے اس کو بیان ضرور کریں گے ہم جہاں کہیں بھی ہوں۔ اور اللہ کے معاملہ میں حق بات کہنے سے ہم کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے۔''

یہ ہے میرے نزدیک تنظیم کے مرحلے کے لیے نبی اکرم ﷺ کی سنت۔ اس میں صرف یہ فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ حضور کی اطاعت مطلق تھی' اس لیے کہ حضور کا ہر فرمان معروف کے حکم میں تھا' لیکن آپؐ کے بعد اب کسی بھی امیر کی اطاعت آزاد نہیں ہوگی بلکہ معروف کے دائرے کے اندر اندر ہوگی۔ تربیت کے مرحلے میں بھی ہمیں پورے طور پر نبوی طریق کی پیروی کرنا ہوگی۔ اس میں اہم ترین چیز ہے عباداتِ مفروضہ کا اہتمام اور ان کی پابندی' مزید برآں تلاوتِ قرآن اور حتی الامکان قیام اللیل کا اہتمام۔ اسی طرح صبر محض کے مرحلے کو بھی ہمیں بعینہٖ اسی طرح اختیار کرنا ہوگا جس طرح ہمیں سیرت میں مکی دور میں نظر آتا ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ کے اس کام میں اور اقامتِ دین کی اس جدوجہد میں جو مصائب اور شدائد آئیں ان پر صبر کرنا ثابت قدم رہنا' اور اپنا ہاتھ روک کر رکھنا۔ یہ وہ چار ابتدائی مراحل ہیں جن میں ہمیں طریقِ نبویؐ کو جوں کا توں اختیار کرنا ہے۔

البتہ اسلامی انقلابی جدوجہد کے پانچویں اور چھٹے مرحلے یعنی اقدام اور مسلح اقدام کے معاملے میں ہمیں احوال وظروف کی مناسبت سے کچھ ترمیم کرنی ہوگی اور اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجیے۔ پہلی بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ کا جس معاشرے سے معاملہ تھا' وہ تمام اعتبارات سے خالص کافرانہ معاشرہ تھا۔ آج کسی بھی مسلمانوں کے ملک میں یہ جدوجہد ہوگی تو سابقہ مسلمانوں سے پیش آئے گا چاہے اس ملک میں حکمران اور عامۃ المسلمین کی اکثریت فاسق وفاجر افراد پر مشتمل ہو۔ وہ سیکولر (secular) ذہن رکھتے ہوں' لیکن کلمہ گو تو ہیں' شمار تو ان کا مسلمان ہی میں ہوتا ہے۔ ایک معاملہ تو یہ ہے جس کی وجہ سے صورتِ حال میں فرق واقع ہوگیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس زمانہ میں

طاقت کا زیادہ فرق نہیں تھا' جو تلواریں اُدھر مشرکین و کفار کے پاس تھیں وہی مسلمانوں کے پاس تھیں۔ مقدار اور تعداد (quantity) کا فرق ضرور تھا' لیکن نوعیت (quality) کا فرق نہیں تھا۔ وہی نیزہ' تلوار' تیر کمان اُن کے پاس ہے وہی اِن کے پاس ہے۔ وہی گھوڑے اور اونٹ اِدھر ہیں' وہی اُدھر ہیں۔ لیکن آج کل جو استحصالی نظام بھی قائم ہے' خواہ وہ سرمایہ دارانہ ہو یا جاگیردارانہ' اس کو تحفظ دینے والی حکومت ہوتی ہے جو انہی طبقات کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے مفادات رائج الوقت نظام سے بڑی مضبوطی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مقابلہ میں حکومت آتی ہے۔ اس کے پاس بے پناہ قوت و طاقت ہے۔ چنانچہ مسلح تصادم والی بات موجودہ دور میں بڑی مشکل ہے۔ اس کا کوئی بدل تلاش کرنا پڑے گا۔ وہ متبادل طریقے تمدن کے ارتقاء نے فراہم کیے ہیں۔ پُرامن مظاہرے' پکٹنگ کرنا' گھیراؤ کرنا' چیلنج کرنا کہ فلاں فلاں کام جو اسلام کی رو سے منکر ہیں' ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام اگر ہوگا تو ہماری لاشوں پر ہوگا۔ یہ وہ راستے ہیں جو تمدن کے ارتقاء کی بدولت ہمارے لیے کھلے ہیں۔ جب تک یہ مرحلہ نہیں آتا صرف زبان و قلم سے اس کا اظہار کیا جائے گا کہ یہ کام اسلام کے خلاف ہیں' منکر ہیں' حرام ہیں۔ ان کو چھوڑ دو' ان سے باز آ جاؤ' ان کی جگہ معروفات کو رائج کرو' لیکن جب وہ وقت آ جائے کہ اسلامی انقلابی جماعت یہ سمجھے کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم مظاہروں کے ذریعے سے حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں تو پھر چیلنج کیا جائے گا کہ اب یہ کام ہم نہیں ہونے دیں گے' سڑکوں پر نکل آئیں گے' پُرامن مظاہرے کریں گے' دھرنا مار کر بیٹھیں گے' پکٹنگ کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں لاٹھی چارج ہوگا' گرفتاریاں ہوں گی' جیلوں میں بھرے جائیں گے۔ حکومت اور آگے بڑھے گی تو فائرنگ ہوگی' شہادتیں ہوں گی۔ تو جب اس جماعت کے وابستگان نے پہلے ہی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے' وہ سر پر کفن باندھ کر نکلے ہیں کہ ؏ ''شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن'' تو پیٹھ دکھانے کا کیا سوال! اب یا تو حکومت گھٹنے ٹیک دے گی' اس لیے کہ آخر فوج بھی اسی ملک کی ہے اور عوام بھی اسی ملک کے ہیں۔ اپنوں کے خون سے ہاتھ کب تک رنگ سکیں گے۔ یا

پھر نذرانہ جان اپنے ربّ کے حضور پیش کر کے اس تنظیم کے ارکان سرخرو ہو جائیں گے۔

اس کی ایک مثال اس دَور میں ایرانیوں نے پیش کر کے دکھا دی ہے۔ اگرچہ ایران میں انقلاب کے پہلے چار مراحل پر مطلوبہ درجہ میں کام نہیں ہوا تھا' اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس کے بارے میں اس وقت میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا' لیکن ایک چیز انہوں نے کر کے دکھا دی۔ انہوں نے شاہ کے خلاف مسلح بغاوت نہیں کی تھی' انہوں نے ہتھیار ہاتھ میں نہیں لیے' خود جانیں دینے کے لیے سڑکوں پر آ گئے۔ ہزاروں مارے گئے' کوئی پروا نہیں۔ لیکن ان قربانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس عاجز آ گئی اور فوج نے مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور آخر کار شہنشاہ کو بھاگتے بنی اور اس کا انجام یہ ہوا کہ ع ''دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں''۔ وہ شہنشاہ جو اس علاقہ میں امریکہ کا سب سے بڑا پولیس مین تھا' اسے امریکہ بہادر نے بھی اپنے یہاں پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کون سی طاقت تھی جس نے شہنشاہِ ایران کو حکومت چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا! وہ عوام کا جذبہ اور جان قربان کرنے پر آمادگی کی طاقت تھی۔ اس کے بغیر نظام نہیں بدلتا۔ تو اس معاملے میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر صبرِ محض ہی کی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے اقدام کرنا ہوگا' مسلح تصادم کی نوبت نہیں آئے گی۔

البتہ جہاں حالات سازگار ہوں' جہاں مسلح تصادم ہو سکتا ہو وہاں ہوگا۔ جیسے اب افغانستان میں ہو رہا ہے۔ وہاں اس لیے ہو رہا ہے کہ ایک تو وہ قوم عرصہ سے آزاد قوم کے طور پر دنیا کے نقشے پر موجود رہی ہے' اس پر مغربی استعمار کا براہ راست غلبہ نہیں ہوا' وہ برصغیر پاک و ہند کی طرح دو سو برس تک غلام نہیں رہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ہتھیار عام ہیں۔ کوئی گھر شاید ہی ایسا ہو جس میں ہتھیار نہ ہوں۔ ان کے بچے تو بچپن ہی سے بندوق اور رائفل سے کھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر وہ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں گوریلا جنگ ممکن ہے۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ اس میں گوریلا وار ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اگر کہیں مسلح تصادم کے لیے حالات سازگار ہوں تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ وہاں نہی عن المنکر کے لیے طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے' تلوار اٹھائی جا سکتی ہے۔ ایسی بات نہیں

ہے کہ کسی مسلمان فاسق و فاجر حکمران کے خلاف مسلح بغاوت کا راستہ بالکل بند کر دیا گیا ہو۔ بغاوت ہو سکتی ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے اس کے لیے شرط یہ عائد کی ہے کہ طاقت اتنی ہو جائے کہ اپنے اندازے اور جائزے کی حد تک کامیابی کا واضح امکان نظر آتا ہو۔ باقی عملاً کیا ہوگا؟ تو بہت سے ان دیکھے عوامل ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ آپ یقین سے نتیجہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال یہ معاملہ اگرچہ مشروط ہے لیکن اتنی بات تو ثابت ہے کہ مسلح بغاوت حرام مطلق نہیں ہے۔

لیکن ہمارے ملک کے حالات میں عملاً مسلح بغاوت ممکن نہیں ہے۔ اس کا بدل ہے پُرامن اور منظم مظاہرے اور وہ تمام اقدامات جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس طرح ہم اللہ کی راہ میں جان تو دے سکتے ہیں۔ ہمارے پاس دینے کی چیز جان ہی ہے جو ہم دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے آمادگی ضرور رہنی چاہیے۔ اس معاملے میں حضور ﷺ کی دو حدیثیں سنا دوں۔ یہ حبِ رسولؐ یا محبتِ رسولؐ یا اتباعِ رسول ہی کا تقاضا ہوگا کہ ہماری قلبی کیفیات حدیث رسول کے مطابق بن جائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلُ ثُمَّ اَغْزُوْ فَاُقْتَلُ ثُمَّ اَغْزُوْ فَاُقْتَلُ)) (صحیح مسلم) ''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میری یہ شدید آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں' پھر (مجھے زندہ کیا جائے اور پھر) میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔ پھر (مجھے زندہ کیا جائے اور پھر) میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں''۔ اس آرزو کا ہر مسلمان کے دل میں ہونا ایمان کی علامت ہے اور حضور ﷺ کے اتباع کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی طریقے سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس کسی مسلمان نے اللہ کی راہ میں نہ کبھی جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو تھی تو اگر اس حال میں اس کو موت آئی تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہوگی''۔ گویا یہ ایمان کی شرطِ لازم ہے کہ یہ آرزو دل میں موجود ہو کہ اے اللہ! تیرے دین کی سربلندی کے لیے یہ جان کام آئے' گردن کٹے' اس جسم کے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس خواہش کا ہونا ضروری ہے خواہ اس

کا مرحلہ نہ آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا انتقال جنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہوگیا۔ ہوسکتا ہے مکی دَور میں کسی صحابی کی طبعی موت واقع ہو گئی ہو۔ ان کے لیے میدانِ جنگ میں گردن کٹانے کی نوبت آئی نہیں۔ اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہماری زندگیوں میں اللہ کی راہ میں جانی قربانی دینے کا مرحلہ نہ آئے' لیکن دل میں نیت ہو' آرزو ہو' تمنا ہو' تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے واثق اُمید ہے کہ وہ اس پر بھی اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

میری اس وقت کی گفتگو کا خلاصہ ذہن نشین کر کے اٹھیے۔ حب رسول کا بنیادی تقاضا ہے اتباعِ رسولؐ۔ یہ اتباع زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی مطلوب اور مبارک ہے' لیکن اس کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہماری زندگی کا پورا رخ وہی ہو جائے جو نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا تھا۔ اور وہ رخ تھا غلبہ دین کی جدوجہد کا رخ' نظامِ عدل وقسط کا عملاً قیام ونفاذ! اسی مشن کے لیے حضور ﷺ نے تیئیس (۲۳) سال تک جاں گسل محنت و مشقت کی' اسی کے لیے صحابہ کرام نے زندگیاں کھپا دیں۔ مصائب جھیلے' مظالم برداشت کیے' جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ حضور اور صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر ہماری زندگی کا رخ معین ہو جائے' ہماری دلچسپیاں اور ہمارے ذوق وشوق سیرتِ رسولؐ اور سیرتِ صحابہؓ کے سانچے میں ڈھل جائیں' یہی حب رسول کا اصل تقاضا ہے۔

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی!

حاصلِ کلام

سیرتِ مطہرہ کے ایک اجمالی نقشہ کے ذریعے سے میں نے آپ حضرات کے سامنے حُبِ رسول کے تقاضے بیان کر دیے ہیں۔ اس انداز میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میری ہر بات کو تسلیم کر لیں' لیکن میرا نقطہ نظر آپ کے سامنے آیا ہے' اس پر ٹھنڈے انداز میں سوچ بچار کیجیے اور ضرورت محسوس ہو تو مجھ سے یا تنظیم کے ذمہ دار حضرات سے تبادلہ خیال کیجیے۔

و اخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین OO

معراجُ النّبی

علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

ترتیب

۞ واقعۂ معراج کی حقیقت و اہمیت 374

۞ سفرِ معراج کی غرض و غایت 376

۞ روایاتِ معراج میں اختلاف کی حقیقت 380

۞ سفرِ معراج کی عقلی توجیہہ 382

۞ آیۂ اسراء کی تشریح و توضیح 383

☆ عبدیت و رسالت میں فرقِ مراتب 385

☆ چند وضاحت طلب پہلو 389

۞ واقعۂ معراج — حدیثِ نبویؐ کے آئینے میں 391

۞ سورۃ النجم میں مشاہداتِ معراج کا ذکر 396

☆ معراج اور رؤیتِ باری تعالیٰ 398

☆ ''مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى'' کا مفہوم 401

۞ حدیثِ معراج کا تسلسل 402

☆ اُمت کے لیے معراج کے تحفے 404

۞ مشرکین کا ردِّ عمل 406

۞ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تصدیق 408

۞ واقعۂ معراج سے متعلق احادیث اور آثارِ صحابہؓ 409

۞۞۞

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱﴾ (الاسراء)

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ
نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۭ﴿۱۵﴾
اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ
رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ (النجم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد:

آج سے چودہ سو چھ (۱۴۰۶) برس قبل ۲۷ رجب کی ایک شب وہ محیر العقول واقعہ پیش آیا تھا جسے ہم ''معراج'' کے نام سے جانتے ہیں۔ معراج کے بارے میں کتب احادیث میں جو روایات ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عظیم واقعہ ہجرتِ مدینہ سے ڈیڑھ سال قبل پیش آیا جب کہ نبی اکرم ﷺ کی عمر شریف قریباً باون برس تھی۔

واقعۂ معراج کی حقیقت واہمیت

اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے! اس کی اہمیت کیا ہے! اس موضوع پر گفتگو کرنے کے ضمن میں سب سے پہلے ہمیں یہ معین کرنا ہوگا کہ اس واقعہ کے ہم تک پہنچنے کے ذرائع (sources) کیا ہیں! ظاہر بات ہے کہ ہمارے لیے کسی بھی ضمن میں مرجعِ اوّل اور اوّلین بنیاد قرآن مجید ہے۔ قرآن حکیم میں واقعۂ معراج کا ذکر دو مقامات پر صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں نہ کسی اشارے' کنائے' رمز یا ایماء کا انداز ہے اور نہ کوئی ابہام وایہام ہے' بلکہ صراحت کے ساتھ واضح الفاظ میں اس واقعے کا ذکر ہے۔ اس سفرِ مبارک کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ زمینی ہے یعنی مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک' اور دوسرا حصہ آسمانی ہے یعنی مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو مقامات پر اس واقعہ کے دونوں حصوں کو جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں' جو پندرھویں پارے کی بھی پہلی آیت ہے' اس زمینی سفر کا ذکر ہے: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ ''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندے کو' شب کے ایک حصے میں' مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک'' ﴿الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ﴾ ''جس کے ماحول (گردو پیش) کو ہم نے مبارک بنایا'' ﴿لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا﴾ ''تا کہ ہم دکھائیں

اسے (ﷺ) اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں'' ۔﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ①﴾ ''یقیناً سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا تو صرف وہ (تبارک وتعالیٰ) ہے۔''

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' یہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے۔ نوٹ فرما لیں کہ اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا نام سورۃ الاسراء بھی ہے' بلکہ عرب ممالک میں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں اسے ''سورۃ الاسراء'' کے نام سے ہی موسوم کیا جاتا ہے۔

اس سفر مبارک کا جو آسمانی حصہ ہے' اس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کی اطلاع خود قرآن سے ملتی ہے جو ہمارے لیے مرجع اوّل ہے' اس حوالے سے یہ بات جان لیجئے کہ چونکہ اس واقعہ کی بنیاد صرف احادیث ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں بھی بصراحت اس کا ذکر ہے' لہٰذا اس کا انکار کفر ہوگا' اگرچہ توجیہہ اور تاویل کے اعتبارات سے الفاظِ قرآنی میں جس حد تک گنجائش ہو اس حد تک اگر کوئی اختلاف ہو تو اسے کفر نہیں سمجھا جائے گا۔

اس واقعہ کے ضمن میں ہمارے لیے مرجعِ ثانی احادیثِ نبویہؐ ہیں۔ ہمارے دین کے یہ دو بنیادی ماخذ ہیں' قرآن و حدیث۔ انہی کو اصطلاحاً کتاب و سنت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معروف بات ہے کہ احادیث میں درجہ بندی ہے۔ سند کے اعتبار سے قوی ترین احادیث وہ ہیں جو صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہیں۔ ان میں سے بھی وہ احادیث جو ان دونوں میں موجود ہوں' یعنی جن کی صحت پر یہ دونوں امام متفق ہو گئے ہوں' وہ اپنی سند کے اعتبار سے قرآن مجید کے آس پاس پہنچ جاتی ہیں۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات جان لیجئے کہ اگرچہ ایسی احادیث کی تعداد کثیر ہے جن میں مختلف تفاصیل مذکور ہیں' تاہم نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ کم از کم اٹھائیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ واقعہ مروی ہے۔ چونکہ ایک ہی روایت کئی کئی صحابہؓ سے مروی ہے اس اعتبار سے روایات کی تعداد تو اٹھائیس سے بھی بڑھ جائے گی' لیکن ان صحابہ کی تعداد اٹھائیس ہے جن سے واقعۂ معراج کا ذکر تفصیلاً یا اجمالاً مروی ہے۔ پھر ان میں ایک بڑی مفصّل روایت وہ بھی ہے جو متفق علیہ ہے۔ یعنی احادیث کے اس طبقے سے تعلق رکھتی

ہے کہ جن کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش بہت ہی کم رہ جاتی ہے' بلکہ صحیح تر بات یہ ہوگی کہ معدوم کے درجے میں آجاتی ہے۔ اس متفق علیہ حدیث میں جو تفاصیل آئی ہیں' انہیں ہمیں مِن وعَن ماننا ہوگا۔

سفرِ معراج کی غرض وغایت

اس تمہید کے بعد پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ اس واقعہ کی نوعیت کیا ہے......! آیا یہ کوئی منفرد واقعہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کو پیش آیا ہے یا یہ نبوت ورسالت کے مستقل معاملات میں سے ایک معاملہ ہے اور مختلف انبیاء ورُسل کے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آیا ہے!— اگر پیش آیا ہے تو اس میں جو فرق وتفاوت ہے وہ آیا نوعیت کا ہے یا کیفیت کا......؟ یہ بات جان لیجئے کہ مکاشفات اور مشاہدات تو نبوت کا جزوِ لاینفک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء ورُسل اِس منصب اور خدمت پر مامور ہوتے ہیں کہ ان امورِ غیبی کی اطلاع دیں جن پر ایمان لانا لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ والا صفات ہے' جو ذات وصفات کے اعتبارات سے اَحد ہے۔ پھر ملائکہ ہیں۔ اسی طرح جو آئندہ پیش آنے والے واقعات ہیں' جب تک وہ پیش نہ آجائیں وہ پردۂ غیب میں ہیں۔ یوم الآخرۃ' قیامت کا دن' ایک امرِ غیبی ہے۔ بعث بعد الموت' حشر ونشر' وزنِ اعمال' جزا وسزا' یہ سب امورِ غیبی ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے' جس کے متعلق یا یوں کہہ لیں کہ وہ (اللہ تعالیٰ) غیب میں ہے...... یا یوں کہہ لیں کہ اُس ذاتِ عزوجل اور ہمارے مابین غیب کا پردہ حائل ہے۔ یہ وہ چیزیں اور وہ امور ہیں جن پر ایمان لانا ازبس ضروری ہے۔

ہدایت کا نقطۂ آغاز ہی یہ ہے کہ ان باتوں کو مانا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں ہدایت کے لیے جو شرطِ اول بیان کی گئی ہے وہ یہی ایمان بالغیب ہے: ﴿الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ......﴾ یہ شرطِ اوّل ہے۔ اب جو بلند مرتبت ہستیاں اس خدمت پر مامور ہوئی ہوں کہ وہ ان امورِ غیبی پر ایمان کی دعوت دیں' ظاہر ہے کہ انہیں تو ان امور پر بدرجۂ کمال وتمام ایمان ویقین

ہونا چاہیے۔ جب تک وہ ایمان و یقین ان کے اندر اپنے درجۂ کمال کو پہنچا ہوا نہیں ہوگا‘ وہ دوسروں تک اس ایمان بالغیب کو کیسے منتقل کریں گے!

اب یہ بھی جان لیجیے کہ ایمان و یقین کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک یقین وہ ہے جو فکر و نظر اور تعقّل و تفکّر کے نتیجے میں پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک یقین وہ ہے جو خود ذاتی مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے بھی بلند تر ایک درجہ وہ ہے جو انسان کے ذاتی تجربے اور احساس پر مبنی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان مدارج کے لیے تین اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں: علم الیقین‘ عین الیقین اور حقّ الیقین ـــــ علم الیقین یہ ہے کہ آپ نے اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے استنباط کیا‘ استدلال کیا اور اس طرح کسی چیز کا علم آپ کو حاصل ہوا اور آپ کو یقین آ گیا۔ عین الیقین یہ ہے کہ آپ نے کسی چیز کو دیکھا اور آپ نے اپنی حسِ بصارت پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر یقین کر لیا ـــــ اور حقّ الیقین کا درجہ ان دونوں سے بلند ہوگا۔ یہ یقین وہ ہوگا جو انسان کے اپنے ذاتی تجربے کا ایک جزو بن جائے۔

میں اسے ایک سادہ سی مثال سے واضح کروں گا۔ اگر آپ دیکھیں کہ کہیں دھواں ہے تو آپ اپنی عقل کے بل پر یہ استدلال کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہاں آگ ہے۔ اس لیے کہ آپ کو یہ کلیہ معلوم ہے کہ دھواں اور آگ لازم و ملزوم ہیں۔ آگ اگرچہ آپ نے نہیں دیکھی‘ آپ نے دھواں ہی دیکھا ہے‘ لیکن اس کو دیکھ کر آپ کو اپنے استنباط اور استدلال سے آگ کے وجود پر یقین آ گیا۔ یہ علم الیقین ہے۔ اب آپ نے قدم بڑھایا۔ بھاگے دوڑے اور آپ وہاں پہنچے جہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور آپ نے اپنے سر کی آنکھوں سے آگ کا مشاہدہ کر لیا تو اب علم الیقین سے بلند تر درجہ آپ کو حاصل ہو گیا۔ یہی عین الیقین ہے۔ عربی کا مقولہ ہے کہ ”لَیْسَ الْخَبَر کَالْمُعَایَنَۃ“ یعنی ”کسی کے بتانے سے جو یقین پیدا ہوتا ہے وہ اس درجے کا نہیں ہوسکتا جو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے“۔ فارسی میں اسی حقیقت کا اظہار اس مقولے کے ذریعے کیا جاتا ہے کہ ”شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ“ ـــــ لیکن ابھی یقین و معرفت کا ایک درجہ باقی ہے اور وہ درحقیقت آگ کی اصل حقیقت کا ادراک ہے۔ آپ نے آگ آنکھ سے دیکھ لی‘

لیکن اس وسوسے کا امکان ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ آگ کی سی صورت ہو' حقیقی آگ نہ ہو۔ سورۃ النجم میں فرمایا گیا: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪﴾ ''نظر نے جو دیکھا دل نے اس کو جھٹلایا نہیں''۔ اس میں اسی وسوسے کی طرف اشارہ ہے کہ کسی وقت انسان کسی شے کو دیکھ رہا ہوتا ہے' لیکن یقین نہیں آتا کہ میں ٹھیک دیکھ رہا ہوں' اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان پکار اُٹھتا ہے کہ ''آنچہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب!''— اس وسوسے کا کلیۃً ازالہ اُس وقت ہو جائے گا جب وہ آگ آپ کو چھو جائے یا آپ اس آگ کو خود چھو لیں۔ اب یقین ہو جائے گا کہ یہ واقعتاً آگ ہے' محض صورتِ آگ نہیں ہے بلکہ حقیقتِ آگ ہے۔ اس تجربے ہی سے آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ آگ کہتے کسے ہیں! اگر کبھی انگارے نے آپ کے جسم کے کسی حصے کو چھوا نہ ہو اور آپ نے ساری عمر آگ صرف دیکھی ہو تو اس کی اصل حقیقت کا علم اور ادراک آپ کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے وہ ذاتی تجربہ جس کی رسائی جب انسان کے اپنے احساس تک ہو جاتی ہے تو اس کو ''حق الیقین'' کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ انبیاء و رُسل کو جو یقین دوسروں تک منتقل کرنا ہے اس کے پیش نظر ان کا اپنا یقین و ایمان اگر حق الیقین کے درجے تک نہ پہنچا ہو اور ان کے اپنے تجربے اور احساس کا جزو نہ بن چکا ہو تو مطلوب حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر یقین کی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی کہ وہ مجسّم ایمان و یقین بن جائیں کہ ان کی شخصیتوں سے یقین متعدی ہو رہا ہو' پھیل رہا ہو۔ اس کے لیے ان کا تجربہ' ان کا معائنہ اور ان کا مشاہدہ اگر نہ ہو تو یقین کا وہ درجہ کبھی پیدا نہیں ہوسکتا کہ ان کی شخصیتوں سے یقین متعدی ہو جائے' لوگوں تک پہنچے۔ جیسے اگر آگ کی بھٹی ہو تو اس سے حرارت خود بخود نکلتی ہے اور دوسروں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہے اصل میں وہ سبب جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ عالمِ ملکوت کے مشاہدات انبیاء و رسل کو کراتا ہے۔ یہ مکاشفات کی شکل میں بھی ہوئے ہیں' یہ رؤیا کی شکل میں بھی ہوئے ہیں۔ یہ حالتِ نوم میں بھی ہوئے ہیں' حالتِ بیداری میں بھی ہوئے ہیں اور ان دونوں یعنی خواب و بیداری کی درمیانی کیفیت میں (بَيْنَ النَّوْم

وَالیقظة) بھی ہوئے ہیں۔ اس میں کچھ چیزوں کو ممثّل کر کے بھی دکھایا گیا ہے۔ بعض حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ جیسے جیسے مراتب ہیں ویسے ویسے ہی ان تجربات ومشاہدات کا معاملہ ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۷۵ میں فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے رہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا نظام تاکہ وہ پوری طرح یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔''

''مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' یعنی اس کائنات کی خفیہ حکومت کا جو انتظام و انصرام ہے' اس کے جو کارندے ہیں' اس کی جو سول سروس ہے' یعنی ملائکہ' جو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہیں۔ ملائکہ تو ہر جگہ موجود ہیں' ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ہیں' کراماً کاتبین موجود ہیں لیکن وہ مخفی ہیں۔ وہ غیب میں ہیں یا ہم ان سے غیب میں ہیں۔ اس عالم کا ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کرایا جاتا رہا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی اس خفیہ حکومت' اس غیبی حکومت کے رموز و اسرار اور معاملات دکھائے جاتے رہے ہیں — اس آیت کا آخری ٹکڑا میری اس گفتگو کے اعتبار سے بہت اہم ہے: ﴿وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝﴾ ''تاکہ وہ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) اصحابِ یقین میں سے بن جائے''۔ ایمان تو محض خبر کی بنیاد پر بھی ہے' لیکن میں نے یقین کا جو بلند ترین درجہ عرض کیا ہے وہ مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔ اس بلند ترین درجے کا یقین انبیاء و رسل کو دینا مقصود ہوتا ہے' لہٰذا انہیں یہ مشاہدات و تجربات کرائے جاتے ہیں۔

البتہ جیسے نبوت و رسالت کے سلسلے کی تکمیل نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ہوئی ہے' اسی طرح ان مشاہدات کے بارے میں بھی چوٹی کا مشاہدہ اور ذاتی تجربات کے ضمن میں بھی بلند ترین تجربہ وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کو ہوا' جسے ہم معراج کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے بارے میں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ واحد تجربہ نہیں ہے' آپ کو بے شمار تجربات ہوئے ہیں۔ آپ صلوٰۃِ استسقاء پڑھا رہے

ہیں اور جنت آپؐ کے سامنے لے آئی گئی اور بے اختیار آپؐ کا ہاتھ اُٹھا اور آگے بڑھا تاکہ آپ جنت کے کسی درخت کا پھل یا میوہ توڑ لیں۔ یہ ہاتھ کا اُٹھنا اور بڑھنا ایک غیر اختیاری عمل تھا۔ اس نوع کے عمل میں کسی ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ پھر جہنم سامنے لے آئی گئی اور آپؐ بے اختیار اس کی حرارت' اس کی گرمی' اس کی دہشت سے اچانک پیچھے ہٹے۔ یہ تمام تجربہ نماز میں ہو رہا ہے' عالمِ بیداری میں ہو رہا ہے۔ حضورﷺ خلوت میں نہیں ہیں' مجمع میں ہیں' وہاں ہو رہا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہم ان مشاہدات کا احاطہ کر ہی نہیں سکتے جو جناب محمد رسول اللہﷺ کو ہوئے۔

روایاتِ معراج میں اختلاف کی حقیقت

آگے بڑھنے سے قبل واقعۂ معراج سے متعلق ایک ظاہری الجھن کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک نفسِ واقعہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب مانتے ہیں کہ سیرت میں ایسا کوئی واقعہ ہوا تو ضرور ہے۔ البتہ اس کی تفصیلات کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں' جن میں بظاہر بہت اختلاف ہے۔ یعنی مجرد واقعۂ معراج تو متفق علیہ ہے' لیکن اس خاکے میں جو رنگ ہیں' وہ مختلف روایات میں جدا جدا ہیں۔ ان میں بھی ایک تو اس نوعیت کی چیزیں ہیں جن میں ہم آہنگی کی جاسکتی ہے اور وہ باہم منطبق ہو جاتی ہیں۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک واقعہ آپ نے دیکھا اور وہی واقعہ کسی اور نے بھی دیکھا تو آپ اس کو جس انداز میں بیان کریں گے ہوسکتا ہے کہ دوسرا اس کو اس انداز سے نہیں بلکہ کسی اور انداز سے بیان کرے۔ یعنی آپ اس واقعہ کی ایک کڑی کو زیادہ تفصیل سے بیان کریں اور شاید دوسرے صاحب اس کو اجمالی طور پر بیان کریں اور کسی دوسری کڑی کو زیادہ تفصیل سے بیان کریں۔ ہر شخص کا ایک اپنا ذوق اور اپنا مزاج ہوتا ہے اور اسی کے اعتبار سے واقعات کا بیان بھی ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذوق کے اعتبار سے کوئی بات آپ کے نزدیک کم اہمیت رکھتی ہے تو اگرچہ آپ اسے سنیں گے یا دیکھیں گے بھی' لیکن وہ آپ کے حافظے میں محفوظ نہیں رہے گی' جبکہ ایک دوسری چیز کی طرف آپ کو زیادہ میلان

ہے' اس کو آپ پوری طرح گرفت میں لائیں گے' اسے catch کریں گے اور محفوظ کرلیں گے۔ تو ایک ہی واقعہ بیان کیا جارہا ہے' اسے دو نے سنا' پانچ نے سنا' تو جب یہ حضرات اس کو بیان کریں گے تو تھوڑا تھوڑا فرق ہو جائے گا' لیکن آپ اس فرق کو جوڑ کر ایک وحدت بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا روایات میں ایک اختلاف تو اس نوعیت کا ہے جس میں کسی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں یہ ہوگا کہ اس واقعہ کا کوئی درمیانی یا بعد کا حصہ کوئی شخص پہلے بیان کردے گا اور اسے جب یاد آجائے گا تو وہ پہلا حصہ بعد میں بیان کردے گا۔ یہ تقدیم و تاخیر والی باتیں بھی بالکل سمجھ میں آنے والی ہیں۔ عقلِ انسانی ان کو ہم آہنگ (reconcile) کرسکتی ہے۔

البتہ بعض باتیں ایسی ہیں جو ناقابلِ تطبیق (irreconcilable) ہیں' وہ بالکل متضاد نوعیت کی ہیں۔ مثلاً کہیں تو یہ بیان کیا گیا کہ سفرِ معراج مقامِ حطیم سے شروع ہوا۔ کسی دوسری روایت میں بیان ہورہا ہے کہ اس کا آغاز کسی گھر سے ہوا' حضور ﷺ کے اپنے گھر سے یا حضرت اُمِ ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر سے' جو آنحضرت ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ کسی روایت کے آخر میں الفاظ ایسے آگئے ہیں: ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ ''پھر میں جاگ گیا۔'' جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ سارا واقعہ عالمِ خواب اور نیند میں ہوا۔ اس لیے کہ ''اِسْتَيْقَظْتُ'' کے معنی کوئی اور نہیں ہوسکتے' لہٰذا تاویل ممکن نہیں۔ یہ جو اس نوعیت کی تضاد کی حامل روایات ہیں' جن کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم جوڑنا ممکن نہیں ہے' ایسی روایات کی ایک نہایت عمدہ تاویل بہت سے محققینِ اُمت کی جانب سے یہ کی گئی ہے کہ واقعہ معراج بھی ایک بار نہیں ہوا' کئی بار ہوا ہے۔ اس طرح کوئی روایت بھی رد نہیں ہوتی۔ بعض محققین اس تاویل کو تسلیم نہیں کرتے کہ واقعۂ معراج بار بار ہوا ہے' بلکہ وہ اپنی تحقیق کی بنیاد اس روایت کو بناتے ہیں جسے وہ زیادہ معتبر سمجھتے ہیں اور صرف اسی کو قبول کرتے ہیں' چنانچہ اسی کے مطابق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور بقیہ روایات کو وہ رد کردیتے ہیں۔ سلف سے یہ اختلاف چلا آرہا ہے اور یہ آئندہ بھی رہے گا۔ اپنے ذاتی مطالعہ اور غور و فکر سے جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں' وہ میں آپ کے سامنے بیان کردیتا ہوں اور وہ یہ

ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو معراج کی سعادت کم از کم دو مرتبہ حاصل ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ یہ واقعہ نبوت کے ابتدائی دور میں پیش آیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ معراج نبوت کے سن دو یا تین میں ہوا' یعنی ۴۲ یا ۴۳ سنِ ولادت میں۔ اور یہ معراج ہوا ہے حالتِ نوم میں۔ ایسی روایات اس معراج کے ساتھ جڑیں گی جن کے آخر میں مذکور ہے "ثُمَّ اسْتَیْقَظْتُ" یعنی "پھر میں جاگ گیا"۔ یہ جو تجربہ ہے اس کو نیند میں ایک روحانی تجربے' ایک مکاشفے یا خواب سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور جو دوسرا واقعہ ہے' جو انتہائی مشہور و معروف ہے اور جس کو ہم "معراج" کے نام سے جانتے ہیں' یہ نبوت کے سن گیارہ کے اواخر یا سن بارہ کے اوائل میں ہوا ہے۔ گویا یہ آں حضور ﷺ کی عمر شریف کا ۵۲ واں سال ہے' یعنی ہجرت سے لگ بھگ دو سال قبل۔ یہ واقعہ درحقیقت ان تجربات کی' جو آنحضور ﷺ کو اُس وقت تک ہوئے تھے' تکمیل ہے اور یہ تجربہ ان تمام تجربات کا نقطۂ عروج ہے۔ اور یہ سفر ہرگز نیند میں نہیں ہوا۔ یہ صرف روحانی تجربہ نہیں ہے' یہ کوئی رؤیا یا خواب نہیں ہے' بلکہ یہ سفر ہے بِجَسَدِہٖ۔ نبی اکرم ﷺ کے پورے جسدِ مبارک کے ساتھ معراج کا یہ پورے کا پورا سفر پیش آیا۔

سفرِ معراج کی عقلی توجیہہ

اس ضمن میں اِس دور میں' جو عقلیت پرستی کا دور ہے اور جسے "18th Century Rationalism" کہا جاتا ہے' مغرب میں فکرِ انسانی کئی قلابازیاں کھا چکا ہے' لیکن مشرق کے کچھ مفکرین ہیں جو ابھی تک اٹھارہویں صدی ہی کے "Rationalism" کو بیٹھے چاٹ رہے ہیں۔ حالانکہ اٹھارہویں صدی کی وہ عقل پرستی مغرب میں ختم ہو چکی ہے' سائنس کے صغریٰ کبریٰ اور مقدمات ومتعلقات (premises) تبدیل ہو چکے ہیں' اصول ومبادی بدل چکے ہیں' لیکن علامہ اقبال کے اس مصرعے کے مصداق کہ ؏ "وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ!" ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو ابھی تک نیوٹونین فزکس (Newtonion Physics) کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک معراج کا واقعہ محالات اور ناممکنات میں سے ہے۔ میں اسی لیے کہا

کرتا ہوں کہ اگر سرسید احمد خان مرحوم نے ٹھوکر کھائی تو وہ قابلِ رحم اور معذور ہیں' وہ آج سے سوا سو سال پہلے کے انسان ہیں۔ وہ جس سائنس کی عقل پرستی سے مرعوب تھے اس سائنس کے' جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' مقدمات (premises) بدل گئے۔ لیکن تعجب اور حیرت تو ان لوگوں کی حالت پر ہوتی ہے جو سرسید کے فکر پر آج بھی اپنی دکانیں چمکا رہے ہیں۔ یہ مقلدِ محض ہیں۔ ان کے پاس تو درحقیقت عقلِ عام نام کی شے بھی نہیں ہے کہ ان کو اندازہ ہو کہ ہم کس دور میں سوڈیڑھ سو سال پہلے کی عقلیت پرستی کی بات کر رہے ہیں۔

آج کا دور آئن سٹائن کی فزکس کا دور ہے۔ ڈیڑھ دو سو سال پہلے کی فزکس کے مقدمات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب مادّہ (matter) حتمی' قطعی اور ناقابلِ تردید اور مستحکم نہیں رہا۔ اب سائنس یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ نظری اعتبار سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی مادی جسم نور کی رفتار کے ساتھ حرکت کرے گا تو اس کے لیے وقت نہیں گزرے گا۔ حساب نے یہ ثابت کر دیا ہے' اگرچہ ابھی ہم اس کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ سب سے زیادہ رفتاریں انسان کے سامنے دو تھیں۔ ایک آواز کی رفتار اور دوسری روشنی کی رفتار۔ آواز کی رفتار سے تو انسان آگے گزر گیا ہے۔ پہلے بندوق کی گولی آواز سے تیز جاتی تھی۔ گولی پہلے لگتی تھی' آواز بعد میں آتی تھی۔ لیکن اب تو سپر سانک جیٹس ہیں۔ آواز سے کہیں زیادہ ان کی اپنی رفتار ہے۔ اب صرف ایک رفتار رہ گئی ہے اور وہ ہے نور یا روشنی کی رفتار۔ اگرچہ ایک مادی جسم کے لیے اس رفتار تک پہنچنا یا اس سے تیز سفر کرنا عموماً ناممکن قرار دیا جاتا ہے' تاہم طبیعیات کے حلقوں میں یہ امور اب اس قدر محال نہیں سمجھے جاتے جتنے یہ ایک صدی پہلے تھے۔ صرف فرق ہے انسانی قدرت اور اللہ کی قدرت کا جس کی طرف اشارہ کر کے بات شروع کی گئی کہ ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ ''پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات لے گئی اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔''

آیۂ اسراء کی تشریح وتوضیح

آیت زیرِ مطالعہ میں پہلی قابلِ توجہ بات لفظ ''سبحان'' ہے۔ یعنی جو ہستی اس

فعل (اسراء) کی فاعلِ حقیقی ہے وہ ''سُبُّوح'' ذات ہے۔ اگر یہ بات کسی انسان کی طرف منسوب ہوتی تو اور بات تھی۔ اگر یہ فعل حضور ﷺ کی طرف منسوب ہوتا کہ حضورؐ خود تشریف لے گئے تو اور بات تھی۔ لیکن وہاں تو صورت بالفعل یہ تھی: ع ''کہ میں آیا نہیں' لایا گیا ہوں'' ــــ حضور ﷺ خود نہیں گئے' لے جائے گئے تھے۔ اور لے جانے والی ذات کون ہے؟ ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ ......﴾ جو پاک ہے ہر عیب سے' ہر نقص سے' ہر ضعف سے' ہر کوتاہی سے' ہر درماندگی سے۔ اور وہ ذات سبوح ہے' منزّہ ہے' ارفع ہے' اعلیٰ ہے' بالاترین ہے۔ لہٰذا اس کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک لے جائے اور واپس لے آئے اور مسجد حرام میں پہنچا دے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ کی مراجعت پر وضو کا پانی ابھی بہہ رہا تھا اور حضورؐ کے مکان کے دروازے کی کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی وقت نہیں گزرا[1] اور یہ چیز' جیسا کہ میں نے

(۱) اس موقع پر اس عاجز کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ کی ''معراج'' کے موضوع پر کی گئی ایک تقریر کا وہ حصہ اچانک یاد آ گیا جو اسی مسئلہ سے متعلق تھا۔ یہ تقریر اس عاجز نے نوجوانی کے دور میں سنی تھی۔ ایک مسجد میں تقریر تھی۔ اس زمانے میں عموماً وقت بتانے والے وہ گھنٹے ہوا کرتے تھے جو چابی اور pendulum (لنگر) سے چلتے تھے۔ مولانا مرحوم جب تقریر میں اس موضوع پر آئے تو انہوں نے ایک بڑی پیاری مثال سے اس مسئلہ کو سمجھایا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اس گھنٹہ میں چابی بھری ہوئی ہے لیکن یہ گھنٹہ پینڈولم کے رقص کی بدولت چل رہا ہے اور وقت بتا رہا ہے۔ اس وقت اس میں گیارہ بج رہے ہیں۔ اب اگر میں اس کو روک دوں تو یہ گیارہ بجے کے وقت پر رک جائے گا۔ بعدازاں ایک یا دو دن یا چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد اس پینڈولم کو حرکت دی جائے تو یہ ٹھیک گیارہ بجے سے' جہاں اسے روکا گیا تھا' حرکت میں آ جائے گا''۔ مولانا نے یہ مثال دے کر آگے فرمایا کہ ''ہم جس اللہ کو مانتے ہیں وہ ''علٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر'' ہے اور اس کائنات کے رواں دواں رہنے میں ہر لحظہ اور ہر آن اسی کا حکم کارفرما ہے ''لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ''۔ اب جبکہ اس نے اپنے بندے محمد رسول اللہ ﷺ کو معراج عطا فرمایا تو اُس نے کائنات کو (suspend) ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہر چیز کی حرکت اسی جگہ رک گئی۔ بعدہٗ اللہ تعالیٰ سبحانہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا' جہاں آپ کی ◄

عرض کیا' آج کا جو ذہن ہے اس کی رو سے نا قابلِ قیاس اور نا قابلِ یقین نہیں رہی۔

دوسری قابلِ توجہ بات ہے لفظِ ''عبد'' —— ایک اس پہلو سے کہ لفظ عبد کا اِطلاق صرف روح پر نہیں' بلکہ روح اور جسد دونوں پر ہوگا۔ ہم عبد ہیں' صرف ہماری روح کو عبد نہیں کہا جائے گا۔ ہم اپنی روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تو روحِ محمد علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حقیقت کو کیا سمجھ سکیں گے! بلکہ جان لیجئے کہ عبد کا اطلاق اکثر و بیشتر تو جسد پر ہوگا۔ اس صراحت سے یہ اضافی بات معلوم ہوئی کہ صرف روحِ محمد ﷺ نہیں لے جائی گئی بلکہ بنفسِ نفیس حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ لے جائے گئے۔ اور ''محمد ﷺ'' کا اطلاق روحِ محمدیؐ اور آپؐ کے جسد شریف دونوں کے مجموعے پر ہوگا' صرف روح پر نہیں ہوگا۔

عبدیت و رسالت میں فرقِ مراتب: تیسری بات جو بہت قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو مقامِ عروج ہے' جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ہو رہا ہے' اس میں حضور ﷺ کی دو نسبتوں میں سے جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے' وہ نسبتِ رسالت نہیں ہے' بلکہ نسبتِ عبدیت ہے۔ ویسے بھی عام طور پر قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خصوصی اور شفقتِ خصوصی کا اظہار ہوتا ہے' وہاں آپ ﷺ کی نسبتِ عبدیت کا ذکر ملتا ہے' جیسے ہم نے یہاں دیکھا' یا جیسے اگلی سورۃ الکہف کے آغاز میں ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ①﴾ اور جیسے سورۃ الفرقان کے آغاز میں ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ①﴾ اسی طریقے سے سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: ﴿فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ⑩﴾ اسی طرح یہاں ہے: ﴿سُبْحٰنَ

◄ امامت میں تمام انبیاء و رسل نے نماز پڑھی' جو گویا علامت تھی اس بات کی کہ آپؐ سید الانبیاء والرسل ہیں۔ اس کے بعد آپؐ حضرت جبرائیلؑ کی معیت میں یکے بعد دیگرے ساتوں آسمانوں پر اور پھر سدرۃ المنتہٰی تک تشریف لے گئے۔ آپؐ کو جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ کو واپس اپنے مستقر پر بھیج دیا گیا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے کائنات پھر رواں دواں ہوگئی۔ چنانچہ جو چیز جس مقام پر روک دی گئی تھی' اسی جگہ اس نے حرکت شروع کر دی''۔ مولانا نے فرمایا کہ ''یہ ایک عقلی توجیہہ ہے اس بات کی کہ حضور ﷺ کی واپسی پر کنڈی ہل رہی تھی' وضو کا پانی بہہ رہا تھا اور بستر میں حرارت موجود تھی۔'' (ج۔ر)

﴿الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا......﴾

یہاں یہ نکتہ جان لیجیے کہ نسبتِ عبدیت بالاتر ہے نسبتِ رسالت سے —— اور اگر اسے صوفیاء کی اصطلاح سے سمجھیں تو وہ یہ ہے کہ نسبتِ عبدیت ایک عروجی نسبت ہے' جبکہ نسبتِ رسالت ایک نزولی نسبت ہے۔ اگر آپ اس امر کو ذہن میں رکھیں گے تو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب پہلی وحی ہوئی یا آپ اللہ تعالیٰ سے مخاطبہ یا مکالمہ سے جو مشرف ہوئے تو آپ کوہ طور پر تھے' بلند مقام پر تھے۔ اور اس سے اعلیٰ مقام کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ گفتگو ہو رہی ہے' درمیان میں کوئی واسطہ حائل نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: ﴿وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾﴾ (النساء) ''اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے کلام فرمایا جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے''۔ یہاں موسیٰؑ کیا ہیں؟ عبد ہیں! اور جب رسالت کا حکم ملا تو فرمایا گیا: ﴿اِذۡہَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ فرعون کی طرف' بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے''۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے اتریں گے تو فرعون کی طرف جائیں گے۔ کسی کے پاس سے کوئی جاتا ہے تو اُس کی طرف پیٹھ کر کے جاتا ہے' جبکہ اُس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے تو اُس کے حضور میں ہے' مواجہہ کر رہا ہے' face to face ہے۔ تو غور کیجیے کہ کون سی نسبت بالاتر ہوئی! —— ظاہر ہے کہ نسبتِ عبدیت' جس میں رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے۔ جبکہ رسالت ایک فرضِ منصبی ہے کہ جاؤ ادا کرو۔ اس کا رخ مخلوق کی طرف ہوتا ہے۔

مولانا رومؒ نے اس کو ایک تمثیل کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں ان حقائق کو جاننے والے یہ صوفیاء ہی ہیں' یہ نہ فقہاء کا دائرہ ہے نہ محدثین کی دلچسپی کا میدان۔ اس لیے کہ ہر ایک کے اپنے اپنے دائرے ہیں اور ان دائروں میں سب نے اپنے اپنے کام کیے ہیں۔ یہ تمام اصحاب ہمارے محسن ہیں' لیکن ہر طبقے کا اپنا اپنا ذوق اور اپنا اپنا میدان (field) ہے۔ چنانچہ عبدیت و رسالت میں فرقِ مراتب ہمارے صوفیاء نے قائم کیا ہے۔ مولانا رومؒ نے اس کے لیے بارش کی مثال دی ہے۔ ہماری دنیا میں بارش کا جو نظام چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ سمندر سے بخارات اُٹھ

رہے ہیں۔ یہ عروج ہے۔ بخارات نہایت لطیف حالت میں ہیں' نہایت پاک وصاف ہیں۔ اس عملِ تبخیر کے ذریعے تطہیر ہو رہی ہے۔ پانی کو بھاپ بنایا جا رہا ہے۔ اس میں ظاہر ہے کہ کثافت تو ساتھ نہیں جائے گی۔ پانی انتہائی لطیف اور پاک وصاف صورت میں اوپر جا رہا ہے۔ اوپر جا کر ان بخارات نے بادلوں کی شکل اختیار کر لی۔ ہواؤں کے دوش پر یہ بادل فضا میں تیرتے ہیں۔ پھر بارش بن کر وہی پانی زمین پر نازل ہو رہا ہے۔ اب اس نزولِ بارش سے کیا ہوگا! پہلے وہ پانی فضا کو دھوئے گا۔ اس عمل میں فضا کی کچھ نہ کچھ کثافت برستے پانی میں شامل ہو جائے گی۔ پھر وہ بارش زمین تک پہنچے گی اور زمین کو دھوئے گی۔ اس مرحلے پر کچھ مزید کثافتیں اس میں شامل ہو جائیں گی۔ یہ پانی ندیوں' نالوں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا پھر سمندر میں پہنچے گا۔ اب وہ ساری کثافتیں سمندر میں رہ جائیں گی اور پھر وہی پانی لطیف اور پاک وصاف ہو کر بخارات کی صورت میں آسمان کی طرف اُٹھ جائے گا۔ یہ عروج ہے اور وہ نزول ہے۔ نزول سے فضا اور زمین کی صفائی ہو رہی ہے جبکہ عروج میں پانی کی اپنی صفائی ہوتی ہے۔

عروج و نزول کا یہی سائیکل عبدیت و رسالت کے مابین چلتا ہے۔ رات کو اللہ کا بندہ اُس کے حضور میں کھڑا ہے۔ یہ کس کی صفائی ہے؟ اپنی!—— کس چیز سے صفائی یہ میں بعد میں عرض کروں گا۔ اس کو کہیں اپنی کثافتوں پر قیاس نہ کر لیجیے گا۔ وہ کثافتیں ان ہستیوں کے کہیں آس پاس بھی نہیں ہوتیں۔ ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی''—— لیکن دن کے لیے کیا حکم ہے؟ اب نزول کا مرحلہ ہے۔ جاؤ لوگوں کی طرف' انہیں اللہ کا پیغام پہنچاؤ' ان کو اللہ کے راستے کی طرف پکارو۔ یہ کام منصبِ رسالت سے تعلق رکھتا ہے۔ مکہ کے مشرکانہ ماحول میں نبی اکرم ﷺ توحید کی دعوت پہنچا رہے ہیں۔ مجمعوں میں قرآن پیش فرما رہے ہیں' گھروں پر دستک دے رہے ہیں' دربدر تشریف لے جا رہے ہیں۔ لیکن ہو کیا رہا ہے؟ یہی کہ کسی نے استہزا اور تمسخر کیا' کسی نے گالی دے دی' کسی نے شاعر کہا' کسی نے مجنون و دیوانہ کہا تو کسی نے ساحر اور جادوگر کہہ دیا' کسی نے کاہن کہہ دیا۔ ان باتوں سے قلبِ محمد ﷺ میں کچھ کدورت پیدا ہوتی ہوگی یا نہیں؟ آپ

کی طبعِ مبارک کو رنج پہنچتا ہوگا یا نہیں؟ یہ اثرات بالکل مترتب نہ ہوں' یہ ناممکن ہے۔ اسی لیے تو قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے حضور ﷺ کو تسلی دی جاتی رہی ہے' جیسے فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ﴾ (الانعام:۳۳) ''ہمیں بخوبی علم ہے کہ آپؐ کی طبیعت پر ان کی باتوں سے تکدر پیدا ہوتا ہے' آپؐ ملول اور غمگین ہوتے ہیں''۔ اور ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ②﴾ (القلم) ''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں (یعنی قرآن)۔ آپ (اے محمد ﷺ) اپنے رب کے فضل سے ہرگز مجنون نہیں ہیں''۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو ایک طرف تسلی دی جا رہی ہے۔ اور دوسری طرف جو تکدر آپؐ کے دل پر آ گیا ہے اسے دور کرنے کے لیے حکم ہو رہا ہے کہ راتوں کو کھڑے رہا کیجیے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ② نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ③ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ④ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ⑤ (المزمل)

''اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! آپ رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کریں مگر کم۔ آپ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیں' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دیں' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر (حالتِ قیام میں) پڑھا کریں۔ ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔''

اب یہ عروجی کیفیت ہے' یہ نسبتِ عبدیت ہے کہ ''عَبْدُهٗ'' یعنی محمد ﷺ اُس (اللہ تعالیٰ) کا بندۂ خاص' اُس کے حضور میں راتوں کو کھڑا ہے' اللہ تعالیٰ سے لو لگی ہوئی ہے اور اپنے رب' اپنے مولا' اور اپنے حامی و ناصر کے حضور میں مناجات ہو رہی ہے۔ دن میں نزولی کیفیت ہے کہ لوگوں کے اذہان و قلوب کو نورِ توحید سے منور کرنے کی سعی ہو رہی ہے' ماحول کو صاف کرنے کی جدّوجہد ہو رہی ہے۔ اسی طرف اشارہ ہے سورۃ المزمل کی آیات ایک تا دس میں' جن میں سے پہلی پانچ آیات اور ان کا ترجمہ ابھی آپ نے ملاحظہ کیا۔

اب اگلی چند آیات اور ان کا ترجمہ بھی دیکھ لیجیے تا کہ بات مکمل ہو جائے۔ فرمایا:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ⑥ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا

طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝ (المزمل)

''(اے نبی ﷺ!) درحقیقت رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ بلاشبہ آپؐ کے لیے دن میں (تبلیغ کی) بڑی مصروفیات ہیں (بڑی محنت اور مشقت ہے' لیکن اس میں بھی) اپنے رب کے نام کا ذکر کیجیے اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہیے۔ وہ (اللہ) مشرق و مغرب کا مالک ہے' اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' لہٰذا اُسی کو اپنا پشت پناہ بنایئے (اسی پر بھروسا کیجیے) اور (اے نبیؐ آپ کی دعوت پر) لوگ جو باتیں بنا رہے ہیں ان پر صبر کیجیے اور ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ کنارہ کش ہو جایئے۔''

طنز واستہزا اور طعن و تشنیع کے گھاؤ بڑے کاری ہوتے ہیں' ان کو جھیلنا آسان نہیں۔ اس سے طبیعتِ مبارک پر جو تکدر آتا تھا اس کا ازالہ اُس وقت ہوتا تھا جب ''عبدہ'' نسبتِ عبدیت کے اعتبار سے رات کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا تھا اور حالتِ عروجی کی کیفیات سے بہرہ مند ہوتا تھا۔ تو یہاں لفظ ''عبد'' کے حوالے سے ان حقائق کو ذہن نشین کر لیجیے۔

چند وضاحت طلب پہلو: زیرِ نظر آیت کے اس حصے ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا﴾ میں دو مزید الفاظ وضاحت طلب ہیں' ایک ''اَسْرٰى'' اور دوسرا ''لَيْلًا''۔ عربی میں ''اسراء'' کے معنی ہیں راتوں رات لے جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں سورۃ الشعراء کی آیت ۵۲ میں یہی لفظ آیا ہے: ﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کو وحی بھیجی کہ (اے موسیٰؑ) راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ' تمہارا پیچھا کیا جائے گا''۔ تو حضور ﷺ کے لیے بھی یہی لفظ آیا ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ ...... اس کے بعد ''لَيْلًا'' کیوں آیا' جبکہ اَسْرٰى میں ''راتوں رات'' کا مفہوم و معنی شامل ہے؟ اس لیے کہ سفرِ معراج میں پوری رات نہیں لگی تھی' بلکہ رات کا ایک نہایت قلیل' نہایت مختصر حصہ صَرف ہوا تھا۔ اسی لیے ''لَيْلًا'' کا

ترجمہ ''رات کا ایک حصہ'' کیا جاتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۝

''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندے کو شب کے ایک حصے میں' مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک' جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے' تاکہ ہم (اپنے) اس (بندے) کو اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائیں۔ یقیناً سب کچھ سننے (اور) دیکھنے والا تو وہی (اللہ تعالیٰ) ہے۔''

اب دوبارہ ترجمے سے پوری بات آپ کے سامنے بالکل واضح ہو کر آ گئی ہوگی۔ اب دو باتیں وضاحت طلب رہ گئیں' ایک تو یہ کہ کون سی نشانیاں حضور ﷺ کو دکھائی گئیں! وہ میں آپ کو آگے چل کر احادیث کے حوالے سے بتاؤں گا۔ اس لیے کہ ان کا ذکر احادیث میں بصراحت موجود ہے۔ دوسرے اس آیت کا آخری ٹکڑا ﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ ہے۔ یعنی ''سب کچھ سننے والا' سب کچھ دیکھنے والا تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے''۔ یہ دراصل اُس کے علمِ کامل کی شرح ہے۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے۔ یعنی اُس کے سوا یہ وصف کسی اور میں ہے ہی نہیں' چاہے وہ ملائکہ ہوں' انبیاء ورسل ہوں یا اولیاء ہوں۔ البتہ یہ اُس کو اختیار ہے کہ وہ اپنے علم میں سے جتنا جس کو چاہے عطا فرما دے' اپنی سماعت میں سے جتنا حصہ چاہے کسی کو مرحمت فرما دے' اپنی بصارت میں سے جتنا چاہے کسی پر فیضان فرما دے۔ یہ اُسی کو اختیار ہے: ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۵) ''اور وہ اللہ کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے ماسوائے اس کے جو وہ خود چاہے''۔ اور ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ﴾ (البقرۃ:۳۲) ''(اے اللہ) تو پاک ہے اور ہمیں کوئی علم حاصل نہیں ہے مگر وہ جو تو نے ہمیں سکھایا''۔ یہ ملائکہ کا قول نقل ہوا ہے۔ پس فرشتوں کے علم کی نوعیت بھی یہی ہے اور انبیاء ورسل کے علم کی کیفیت بھی یہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا' اتنا ہی ان کو علم ہے۔ باقی سب کچھ سننے والا' سب کچھ دیکھنے والا' سب کچھ جاننے والا صرف اللہ تبارک وتعالیٰ سبحانہ ہی ہے۔

واقعۂ معراج۔ حدیثِ نبویؐ کے آئینے میں

اب میں چاہتا ہوں کہ پورا واقعۂ معراج آپ کو اس حدیث کے حوالے سے سنادوں جو متفق علیہ ہے۔ میں خود بیان کروں گا تو کچھ نہ کچھ کمی بیشی کا احتمال ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ واقعۂ معراج اپنی پوری تفاصیل کے ساتھ حدیث کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے اور حدیث بھی دوسرے یا تیسرے طبقے کی کتابوں میں نہیں ہے' بلکہ متفق علیہ ہے' جس کا پایہ' جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' روایت اور سند کے اعتبار سے تقریباً قرآن مجید کے برابر ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بارے میں ایک بڑی اہم بات نوٹ کر لیجیے کہ یہ انصاری صحابی ہیں اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنہیں حدیث بیان کرنے کا زیادہ شوق نہ رہا ہو۔ غالباً یہ واحد حدیث ہے جو ان سے مروی ہے۔ ان کو اس حدیث سے نہایت شغف تھا' انہوں نے اس کو نہایت محبت کے ساتھ محفوظ کیا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کی تھی۔ چنانچہ بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ سنا ہوا تھا' جیسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ' وہ بھی ان کی خدمت میں خاص طور پر حاضر ہو کر اس روایت کو سنتے تھے۔ اس لیے کہ اس روایت میں انؓ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ اپنی صحیح بخاری میں ''عن قتادة عن أنس بن مالك عن مالك بن صعصعة'' کی اسناد سے روایت کرتے ہیں۔ مسلم شریف میں یہ روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے براہِ راست مروی بھی موجود ہے۔ ہم اس روایت کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سے' ان شاء اللہ العزیز' اس ضمن میں بہت سے اشکالات دور ہو جائیں گے۔ حدیث یہ ہے:

عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم حَدَّثَهُمْ عَنْ لَيْلَةِ اُسْرِيَ بِهٖ

''حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہمیں وہ حالات و واقعات سنائے جو اُس رات کو پیش آئے' جس رات آپؐ کو لے جایا گیا''۔ یعنی واقعۂ معراج بیان فرمایا۔ اب دیکھئے' یہ مرفوع حدیث ہوگئی۔ آگے روایت کرتے ہیں کہ نبی

اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((بَيْنَمَا أَنَا فِي الْحَطِيمِ - وَرُبَّمَا قَالَ فِي الْحِجْرِ - مُضْطَجِعًا إِذْ أَتَانِي آتٍ)) ”اس اثنا میں کہ میں حطیم — یا شاید حجر کا لفظ ارشاد فرمایا (حجر بھی حطیم کے ایک حصے کو کہتے ہیں) میں لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میرے پاس ایک آنے والا آیا“۔ یہ آنے والے کون ہیں؟ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں' یہ آگے واضح ہو جائے گا۔((فَشَقَّ مَا بَيْنَ هٰذِهٖ إِلٰى هٰذِهٖ [مِنْ ثُغْرَةِ نَحْرِهٖ إِلٰى شِعْرَتِهٖ] فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِي)) ”حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ ”اُس نے یہاں سے وہاں تک میرا سینہ چاک کیا [یعنی حلق کے گڑھے سے لے کر ناف تک] پھر میرا دل نکالا۔“ ((ثُمَّ أُتِيتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَمْلُوْءَةٍ إِيمَانًا فَغُسِلَ قَلْبِي)) ”پھر ایک سنہری طشت لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا' پھر اس سے میرا دل دھویا گیا“۔ وفی روایۃٍ:((ثُمَّ غُسِلَ الْبَطْنُ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ مُلِئَ إِيمَانًا وَحِكْمَةً)) اور ایک روایت میں آتا ہے کہ ”اسی طرح پیٹ کو بھی زمزم سے دھویا گیا اور اس میں ایمان و حکمت بھر دیے گئے“۔((ثُمَّ أُتِيتُ بِدَابَّةٍ، دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ، أَبْيَضَ، يُقَالُ لَهُ الْبُرَاقُ)) ”پھر میرے پاس ایک چوپایہ لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا' وہ بالکل سفید تھا' اس کا نام بُراق ہے“۔((يَضَعُ خَطْوَهٗ عِنْدَ أَقْصٰى طَرْفِهٖ)) ”اس کا ہر قدم' اس کی حدِ نگاہ تک پڑتا تھا“۔((فَحُمِلْتُ عَلَيْهِ)) ”پس مجھے اس پر سوار کیا گیا“۔((فَانْطَلَقَ بِي جِبْرِيلُ)) ”اور جبرائیلؑ میرے ساتھ چلے“۔ اب یہاں نام کے ساتھ صراحت ہو گئی کہ آنے والے حضرت جبرائیلؑ تھے۔((حَتّٰى أَتَى السَّمَاءَ الدُّنْيَا)) ”یہاں تک کہ وہ آسمانِ دنیا تک پہنچ گئے“۔ یعنی یہ پہلا آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے۔

اس روایت میں سفرِ معراج کے زمینی حصہ کا ذکر نہیں ہوا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور دوسری روایات جوڑ کر اس خلا کو پُر کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے سفر معراج کا پہلا حصہ زمینی سفر پر مشتمل ہے۔ یعنی پہلے آپ مسجد اقصیٰ تک پہنچے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”میں نے اپنی سواری بُراق کو اُس جگہ باندھا جہاں انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ مسجد میں بہت سے لوگ نماز

کے لیے جمع تھے۔ میں منتظر تھا کہ کون امامت کرائے گا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آگے کیا' میں نے نماز پڑھائی اور پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے بتایا کہ آپؐ کی اقتدا میں نماز ادا کرنے والے وہ تمام انبیاء ہیں جو دنیا میں مبعوث ہوئے اور آج آپؐ نے ان سب کی امامت کی''۔ یہ علامت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سید الانبیاء والمرسلین ہونے کی۔ پھر یہاں سے آسمانی سفر کا آغاز ہوا۔

اب پھر اسی روایت کا سلسلہ جوڑتے ہیں جو بیان ہو رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ پہلے آسمان پر پہنچے تو حضرت جبرائیلؑ نے دستک دی۔ ((فَاسْتَفْتَحَ)) ''پس اُس نے دروازہ کھلوانا چاہا''۔ ((فَقِيلَ: مَنْ هٰذا؟ قَالَ: جِبْرِيلُ)) ''تو پوچھا گیا: کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جبرائیل''۔ ((قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟)) ''پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟'' یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ آسمانِ اوّل کے دروازے پر تعینات فرشتوں کو معلوم ہو' پھر بھی پوچھ رہے ہوں۔ قانون قانون ہے' لہٰذا دروازے پر دستک دینی ہوگی اور شناخت کرانی ہوگی۔ کوئی جج اپنے علم کی بنیاد پر کبھی فیصلہ نہیں دے گا۔ فیصلہ تو مقدمے کی سماعت اور شہادتوں کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ کسی جج کو کسی واقعے کا ذاتی علم ہے تو بھی اسے مقدمہ کسی عدالت کو منتقل کرنا ہوگا اور وہاں گواہ کی حیثیت سے پیش ہونا ہوگا۔ پس قانون قانون ہے۔ ''پوچھا گیا ساتھ کون ہے؟'' ((قَالَ: مُحَمَّدٌ)) ''حضرت جبرائیلؑ نے جواب دیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)''۔ ((قِيلَ: وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ)) ''پوچھا گیا: کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں''۔ ((قِيلَ: مَرْحَبًا بِهٖ' فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ' فَفَتَحَ)) ''اس کے بعد کہا گیا: مرحبا ہے ان کے لیے (تہنیت ہے' مبارک باد ہے' خوش آمدید ہے) کیا ہی اچھے ہیں جو لائے گئے ہیں۔ پھر سماءِ دنیا کا دروازہ کھولا گیا''۔ ((فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا فِيهَا آدَمُ)) ''پھر جب میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا وہاں آدم (علیہ السلام) تشریف فرما ہیں''۔ ((فَقَالَ: هٰذَا اَبُوْكَ آدَمُ' فَسَلِّمْ عَلَيْهِ' فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ)) ''جبرائیلؑ نے کہا: یہ آپؐ کے جدِ امجد حضرت آدمؑ ہیں' پس آپؐ ان کو سلام کیجیے' تو میں

نے ان کو سلام کیا''۔ ((فَرَدَّ السَّلَامَ، ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) ''انہوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: خوش آمدید ہے' (تہنیت ہے) صالح بیٹے اور صالح نبی کے لیے۔''

((ثُمَّ صَعِدَ بِیْ حَتّٰی اَتَی السَّمَاءَ الثَّانِيَةَ)) ''پھر جبرائیل مجھے لے کر اوپر گئے یہاں تک کہ دوسرے آسمان تک پہنچ گئے''۔ یہاں بھی وہی سوال و جواب ہوئے۔ ((فَاسْتَفْتَحَ، قِيلَ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ جِبْرِيلُ، قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ: مُحَمَّدٌ (ﷺ) قِيلَ: وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قِيلَ: مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ، فَفَتَحَ)) اس ساری عبارت کا ترجمہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ((فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ، قَالَ: هٰذَا يَحْيٰى وَعِيْسٰى، فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا، فَسَلَّمْتُ، فَرَدَّا ثُمَّ قَالَا: مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) ''پھر جب میں (دوسرے آسمان میں) داخل ہوا تو وہاں یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) تھے اور یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبریلؑ نے کہا: یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں' ان کو سلام کیجیے' تو میں نے سلام کیا۔ انہوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: خوش آمدید' مرحبا صالح بھائی اور صالح نبی کو''۔ یہاں غور کیجیے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضور ﷺ کا استقبال ''بیٹا'' کہہ کر کیا' جبکہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے ''بھائی'' کہہ کر خیر مقدم کیا۔ یہ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام تو کُل بنی نوعِ انسان کے جدِّ امجد ہیں' جبکہ حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام بنی اسرائیل میں سے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں' چنانچہ وہ بیٹا کہنے کے بجائے ''بھائی'' کہتے ہیں۔ اسی طرح آگے حضرات یوسف' موسیٰ اور ہارون علیہم السلام آپ ﷺ کو بھائی کہیں گے اور آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹا کہیں گے' کیونکہ آنحضور ﷺ ان کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

آگے چلیے' نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((ثُمَّ صَعِدَ بِیْ اِلَی السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ، فَاسْتَفْتَحَ، قِيلَ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: جِبْرِيلُ، قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ: مُحَمَّدٌ (ﷺ)، قِيلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، قِيلَ: مَرْحَبًا بِهٖ، فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ، فَفَتَحَ، فَلَمَّا

خَلَصتُ فَإِذَا يُوسُفُ، قَالَ: هٰذَا يُوسُفُ، فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَرَدَّ، ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) یعنی تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور وہی مکالمہ ہوا۔

اسی طرح چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر حدیث میں اس طرح ہے کہ سلام کے تبادلہ کے بعد ((فَلَمَّا جَاوَزْتُهُ بَكٰى)) ''جب میں آگے جانے لگا تو موسیٰؑ رونے لگے''۔ ((قِيلَ لَهُ مَا يُبْكِيكَ؟)) ''ان سے پوچھا گیا: آپ کو کیا چیز رلا رہی ہے؟'' ((قَالَ: أَبْكِي، لِأَنَّ غُلَامًا بُعِثَ بَعْدِي يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِهِ أَكْثَرُ مِمَّنْ يَدْخُلُهَا مِنْ أُمَّتِي)) ''موسیٰؑ نے کہا کہ مجھے اس بات پر رونا آ رہا ہے کہ یہ جوان (محمد ﷺ) جن کی بعثت میرے بہت بعد ہوئی ہے (اس کے باوجود) ان کی امت سے جنت میں داخل ہونے والوں کی تعداد میری امت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی''۔ وہ شفقت والفت جو کسی نبی کو اپنی امت سے ہونی چاہیے یہ اس کا بکمال وتمام اظہار ہے۔ اسے معاذ اللہ کسی حسد پر محمول نہ کر لیجئے گا، بلکہ یہ اپنی امت کی محرومی کا احساس ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ کیفیت طاری ہوئی۔

((ثُمَّ صَعِدَ بِي إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ......)) ''پھر مجھے ساتویں آسمان پر لے جایا گیا''۔ وہاں بھی داخلہ کے لیے فرشتوں سے مکالمہ ہوا۔ اس آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ((فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا إِبْرَاهِيمُ، قَالَ: هٰذَا أَبُوكَ إِبْرَاهِيمُ، فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَرَدَّ السَّلَامَ، ثُمَّ قَالَ: مَرْحَبًا بِالِابْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ)) ''پھر جب میں داخل ہوا تو وہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تھے۔ جبریل نے کہا: یہ آپ کے جد حضرت ابراہیم ہیں، انہیں سلام کیجئے، چنانچہ میں نے انہیں سلام کیا، جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کہا اور ان الفاظ سے میرا استقبال کیا: خوش آمدید ہو صالح بیٹے اور صالح نبی کے لیے''۔

((ثُمَّ رُفِعْتُ إِلَى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى)) ''پھر مجھے اور بلند کیا گیا سدرة المنتهٰی

تک''۔ یہاں نوٹ کیجیے ''صَعِدَ بِیْ'' کی جگہ ''رُفِعَتُ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور یہی سدرۃ المنتہیٰ ہے، جس کا ذکر سورۃ النجم میں ہوا ہے۔

سورۃ النجم میں مشاہداتِ معراج کا ذکر

میں چاہتا ہوں کہ حدیث کے بیان کی تکمیل سے قبل ہم اس واقعہ سے متعلق سورۃ النجم کی آیات کا مطالعہ بھی کر لیں۔ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات مشکلات القرآن میں سے ہیں اور ان کی تفسیر وتشریح میں اختلاف سلف سے چلے آرہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو جو مشاہدات کرائے گئے اور جن کا ذکر سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں ہوا ہے، اس وقت میں ان سب سے بحث نہیں کروں گا، البتہ جس مشاہدے کا ذکر آیات ۱۱ تا ۱۸ میں آیا ہے، میں اس کا ذکر کروں گا، کیونکہ ان آیات کا تعلق تقریباً تمام مفسرین وعلمائے امت کے نزدیک واقعۂ معراج سے ہے۔ فرمایا ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾﴾ ''جو کچھ انہوں (ﷺ) نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اس کو ان کے دل نے جھٹلایا نہیں''۔ اس کی طرف میں قبل ازیں اشارہ کر چکا ہوں کہ ایک ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ وسوسے بھی ہوتے ہیں کہ یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں کیا یہ واقعتاً ایسا ہی ہے؟ جو آگ سامنے نظر آرہی ہے وہ درحقیقت آگ ہے یا آگ کی سی صورت ہے؟ آج کل تو اس طرح کے لیمپ اور ہیٹر بنے ہوئے ہوتے ہیں کہ انسان کو ان کے اندر حقیقی انگارے دہکتے نظر آتے ہیں، ان سے انسان دھوکہ کھا سکتا ہے، حالانکہ انگاروں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ تو ہماری آنکھ دھوکہ کھا جاتی ہے، لیکن نبیؐ کا جو مشاہدہ ہوتا ہے وہ آنکھ اور دل، نظر وقلب، بصارت وبصیرت کی یکجائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں فرق وتفاوت اور وسوسہ نہیں ہوتا۔ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے نہایت فصاحت وبلاغت اور اعجاز وایجاز کے ساتھ فرمایا: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾﴾

آگے فرمایا: ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾﴾ ''لوگو! کیا تم ان چیزوں کے بارے میں ان سے جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتے ہیں؟'' ان چیزوں کے بارے میں تو جھگڑا ہو سکتا ہے جو کہیں سے سنی سنائی ہوں، لیکن تم محمد (ﷺ) سے ان چیزوں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو جو وہ دیکھتے ہیں چشمِ سر سے اور دل کی بصیرت سے؟ ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً

أُخْرٰى ﴿١٣﴾ ''اور وہ اسے ایک بار اور بھی دیکھ چکا ہے''۔ ہمارے رسول ﷺ کا یہ مشاہدہ پہلی بار نہیں ہوا' ایک مرتبہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ موجودہ مشاہدہ ان کو کہاں ہوا؟ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾﴾ ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس''۔ ﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿١٥﴾﴾ ''اسی (سدرۃ المنتہیٰ) کے پاس جنت الماویٰ ہے''۔ وہ جنت جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور جو اللہ کے نیکوکار بندوں کا ٹھکانہ بنے گی' جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ جس کے متعلق سورۃ الزمر میں فرمایا گیا: ﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿٧٣﴾﴾ ''اور جنت کے داروغہ ان (نیکوکاروں) سے کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر' تم بہت خوش بخت رہے' داخل ہو جاؤ اس (جنت) میں ہمیشہ ہمیش کے لیے''۔ یہاں نوٹ کر لیجیے کہ احادیث میں معراج کے موقع پر جنت کے مشاہدات کے جو احوال آئے ہیں' وہ جنت وہیں تو ہے۔ ان آیات میں ان احوال کا ذکر نہیں ہے۔

''سدرہ'' عربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ لفظ ''منتہیٰ'' انتہا سے بنا ہے' جس کا مفہوم وہ جگہ اور مقام ہے جہاں جا کر کوئی چیز ختم ہو جائے۔ یہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' کیا ہے! اس کا سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ اس کے متعلق میں آگے چل کر کچھ عرض کروں گا۔ قرآن مجید نے یہاں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ ہر شخص اس اسلوب سے یہ جان لے کہ یہ میرے فہم سے بالاتر ہے۔ یہ منتہیٰ کس اعتبار سے ہے' اب اس کو سمجھنا چاہیے۔ یہ اس اعتبار سے ''منتہیٰ'' ہے کہ یہاں سے آگے مخلوق کا گزر نہیں ہے۔ یہ انتہا ہے۔ یہاں سے آگے حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی نہیں جا سکتے۔ اور نوٹ کیجیے کہ اس سے آگے جانے کا کہیں محمد رسول اللہ ﷺ کا بھی ذکر نہیں ہے۔ یہ صرف ہماری شاعری میں ہے کہ حضور ﷺ اس سے بھی آگے گزر گئے۔ لیکن اس کا قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ بھی یہیں تک گئے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اس بارے میں بھی وضاحت آئی ہے کہ وحی الٰہی بھی یہاں نازل ہوتی ہے اور یہاں سے فرشتے لے لیتے ہیں۔ گویا جو چیز بھی عرشِ الٰہی سے اترتی ہے' وہ بلاواسطہ اوّلاً یہیں نازل ہوتی ہے۔ اس سے آگے وہ حریم کبریا ہے جس میں مخلوق کا داخلہ ممکن نہیں

ہے۔ عالمِ خلق کی کوئی شے جو بھی اوپر آ سکتی ہے' وہ زیادہ سے زیادہ یہیں تک آ سکتی ہے' اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی رسائی بھی یہیں تک ہے۔ لہٰذا نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید نے جو ذکر کیا وہ سدرۃ المنتہیٰ کے آگے یا پار کا نہیں کیا' بلکہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾﴾

آگے فرمایا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾﴾ ''جب کہ اس بیری کے درخت کو ڈھانپے ہوئے تھا جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ یعنی نہ اس کو زبان ادا کر سکتی ہے' نہ انسانی زبان میں وہ حروف و الفاظ ہیں جو اس کیفیت کو بیان کر سکیں یا اس کی تعبیر کر سکیں' نہ اس کا کوئی تصور انسان کے لیے ممکن ہے۔ جنت کی نعمتوں کے بارے میں ایک حدیث میں آیا ہے: ((مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ))(۱) ''وہ نعمتیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں' نہ کسی کان نے سنیں' نہ کسی انسان کے دل پر کبھی ان کا خیال تک آیا''۔ اب انہیں بیان کریں تو کن الفاظ میں کریں! ان کا ابلاغ و اعلان کیسے ہو! وہ communicate کیسے ہوں! — ابلاغ اور اعلان تو کسی ایسی چیز کے حوالے سے ہوتا ہے جس کا آپ کو تجربہ ہو' وہ آپ کی دید یا شنید میں آئی ہو' آپ کے ذہن میں اس کا کوئی تصور ہو' تو اس کے حوالے سے بات ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہاں اسلوب اور انداز یہ اختیار کیا گیا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾﴾ ''جبکہ سدرہ کو ڈھانپے ہوئے تھا جو ڈھانپے ہوا تھا''۔ تجلیاتِ ربانی کس نوعیت اور کس کیفیت کی حامل تھیں' اسے سمجھنا انسانی ذہن کے لیے ممکن نہیں' تجلیات کا جو براہِ راست نزول ہو رہا تھا' اس مہبطِ تجلیات اور ان کے نزول کا نبی اکرم ﷺ نے مشاہدہ فرمایا۔

معراج اور رؤیتِ باری تعالیٰ

ہماری شاعری میں بے انتہا مبالغے ہو جایا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال جو کچھ بھی تھے بہرحال شاعر بھی تھے اور شاعری میں مبالغہ لازماً ہو جاتا ہے' لہٰذا کہتے ہیں: ؎

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق و کتاب تفسیر القرآن و کتاب التوحید۔ باب قول اللّٰہ تعالٰی یریدون ان یبدلوا کلام اللّٰہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری و تبسمی!

یعنی ''موسیٰ علیہ السلام تو ایک جلوۂ صفات ہی کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے ﴿خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا﴾ جبکہ آپؐ عینِ ذات کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور تبسم فرما رہے ہیں''۔ میرے نزدیک یہ مبالغہ ہے' عینِ ذات کے مشاہدے کا ذکر نہ قرآن میں ہے' نہ حدیث میں۔ تاہم اس ضمن میں اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے چلا آ رہا ہے۔ یہ اختلاف سلف میں بھی ہے اور خلف میں بھی۔ لہٰذا کوئی یہ رائے رکھنا چاہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا تو رکھے۔ میں نے آغاز ہی میں واضح کر دیا تھا کہ اس واقعۂ معراج کا بالکلیہ انکار کفر ہوگا' لیکن تفصیلات اور توجیہات و تاویلات کا اختلاف کفر نہیں ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ شبِ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو دیکھا' براہِ راست دیدارِ الٰہی ہوا۔ لیکن زیادہ قوی رائے یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا براہِ راست مشاہدہ نہیں ہوا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''نُوْرٌ اَنّٰی یُرَاہ؟'' یعنی ''اللہ تو ایک نور ہے' اسے دیکھا کیسے جا سکتا ہے؟'' آپ نور کے ذریعے سے کسی اور شے کو دیکھتے ہیں' نور تو نور ہے' اس کو کہاں دیکھا جا سکتا ہے! نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا:

﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ (النجم)

درمیانی آیت کے متعلق تو میں بعد میں عرض کروں گا' پہلے آخری آیت پر غور کیجیے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دیکھا! ''بے شک انہوں نے اپنے رب کی عظیم الشان نشانیوں کو دیکھا''۔ ''کُبْرٰی'' اسم تفضیل ہے۔ پس یہاں عظیم ترین آیاتِ ربانیہ کے مشاہدے کا ذکر ہے۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رب کا نہیں' آیاتِ ربانیہ کا مشاہدہ ہوا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں معراج کے زمینی سفر کی غرض و غایت یہ بیان ہوئی کہ ﴿لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا﴾ یعنی یہ سفر اس لیے کرایا گیا کہ ہم اپنے رسول کو اپنی آیات میں سے چند ایک کا مشاہدہ کرائیں۔ وہاں ''کبریٰ'' نہیں آیا۔ وہ زمینی آیات ہیں' وہ

بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن عظیم ترین آیاتِ الٰہیہ وہ ہیں جو سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپے ہوئے ہیں‘ جن کا رسول اللہ ﷺ نے مشاہدہ فرمایا۔

اس حوالے سے اگر تقابل کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا اور اس اعتبار سے فضیلتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ثابت کی جائے تو درست ہوگی کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی ایک تجلی جو کوہِ طور پر پڑی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کا بھی تحمل نہ کر سکے اور یہاں تجلیاتِ ربانیہ کا سدرۃ المنتہیٰ پر براہِ راست جو نزول ہو رہا تھا جناب محمد ﷺ نے انہیں بھرپور انداز میں دیکھا اور ان کا تحمل کیا۔ اس اعتبار سے فرق و تفاوت ثابت ہے۔ لیکن اگر یہاں ذاتِ باری تعالیٰ کے دیدار کو لایا جائے تو یہ بلا سند ہے‘ اس کی قرآن یا حدیث میں سند موجود نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ اتنی بڑی بات تھی کہ یہاں ضرور اس کی صراحت کر دی جاتی یا کم از کم حدیث میں ہی اس کی تصریح ہوتی۔ ہاں بعض صحابہؓ کے یہ اقوال کہ آپؐ شبِ معراج میں دیدارِ الٰہی سے بھی مشرف ہوئے تھے‘ سند کے ساتھ منقول ہیں۔ لیکن عظیم اکثریت کی رائے یہی ہے کہ شبِ معراج میں حضور ﷺ کو دیدارِ الٰہی نہیں ہوا۔ جمہور اہلِ سنت کی رائے بھی یہی ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو آنکھیں عطا کی ہیں اور ان میں بصارت کی جو صلاحیت رکھی ہے وہ دیدارِ الٰہی کا تحمل نہیں کر سکتیں۔ یہ رائے رکھنے والے اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم اس کے لیے قرآن حکیم کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٠٣﴾﴾ (الانعام) ”نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے‘ وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے“۔ البتہ قیامت کے روز اہلِ ایمان دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوں گے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ بعث بعد الموت پر ان کو وہ بصارت عطا فرمائے گا جو دیدارِ الٰہی کا تحمل کر سکے گی۔ سورۃ القیامہ میں ارشاد ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ ”کچھ چہرے اُس روز تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے“۔ نیز حدیث میں بھی آیا ہے کہ اہلِ جنت کے لیے سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہوا کرے گی۔ (رؤیتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں بعض اہم احادیث اس کتابچے کے

آخر میں ''ضمیمہ'' میں ملاحظہ کر لی جائیں۔)

"مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى" کا مفہوم: اب میں سورۃ النجم کی آیت ۱۷ کے متعلق کچھ عرض کروں گا جس کی تشریح و توضیح مؤخر کی گئی تھی‘ یعنی: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰﴾ اس مقام پر بڑی عجیب کیفیت بیان کی گئی ہے اور اس آیت کو سمجھنا آسان نہیں ہے جب تک آپ چند کیفیات کو اچھی طرح جان نہ لیں۔ ہمارے اپنے مشاہدے کے بارے میں ایک کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مشاہدے کا شوق ہے اور وہ شوق اتنا ہے کہ حدِ ادب سے بھی تجاوز کرنا چاہتا ہے لیکن ظرف اتنا نہیں ہے کہ دیکھ سکے۔ حسرت موہانی کا ایک شعر ہے۔

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتائیں

مرے شوق کی بلندی‘ مری ہمتوں کی پستی!

شوق بہت بلند ہے‘ دیکھنا بہت کچھ چاہتے ہیں‘ لیکن آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں‘ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیتِ قرآنیہ: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○﴾ ان دو متضاد کیفیات کو نہایت بلیغ اسلوب سے بیان کر رہی ہے۔ جیسے عربی کا مقولہ ہے کہ "تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا" یعنی کسی شے کی حقیقت کو اس کی ضد (antonym) کے حوالے سے بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ جیسے رات کی حقیقت دن کے تقابل سے سمجھ میں آتی ہے اور دن کی حقیقت رات کے تقابل سے سمجھی جا سکتی ہے۔ اب علامہ اقبال کا وہ شعر ملاحظہ ہو جو ان کی نظم ''ذوق و شوق'' میں ہے۔ علامہ کی یہ نظم میرے نزدیک ان کے اردو کلام کی معراج (climax) ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کا ایک شعر ہے۔

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا

گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب!

دونوں اعتبارات سے جو ضد ہے اسے اقبال اس شعر میں لائے ہیں۔ یعنی ایک طرف میری نگاہ میں بے ادبی تھی‘ اور وہ چوری چوری بھی کچھ دیکھ لینا چاہتی تھی جس کا دیکھنا ادب کے خلاف ہے۔ لیکن دوسری طرف حوصلۂ نظر نہیں تھا‘ لہٰذا دیکھ نہیں سکی۔ اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب اس مشاہدے کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو مشاہدہ

محمد رسول اللہ ﷺ کر رہے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ مشاہدہ اللہ کا نہیں' بلکہ "اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى" کا مشاہدہ ہے۔ لیکن اس مشاہدے کی شان یہ ہے کہ نگاہ جمی رہی۔ یہ ظرف ہے محمدِ عربی ﷺ کا' کہ نگاہیں چکاچوند نہیں ہوئیں۔ جہاں تیز روشنی ہو نگاہیں اس کا تحمل نہیں کر سکتیں اور دیکھنے والا نگاہ ہٹانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں حال یہ ہے کہ "مَا زَاغَ الْبَصَرُ" نگاہ کج نہیں ہوئی' ٹیڑھی نہیں ہوئی۔ جو کچھ دیکھا ہے نگاہ کو جما کر دیکھا ہے' جو مشاہدہ کیا ہے' بھرپور کیا ہے' پورے ظرفِ کامل کے ساتھ کیا ہے' پورے تحمل کے ساتھ کیا ہے' لیکن: "وَمَا طَغٰى" حد سے تجاوز نہیں کیا' بے ادبی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ "طغٰی" ہی سے طغیانی بنا ہے' یعنی حد سے نکل جانا۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

'طغٰی' حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ وہ چونکہ مقامِ ادب بھی ہے' لہٰذا وہاں حد سے تجاوز نہیں ہوا۔ العبدُ عبدٌ وَاِنْ ترقّٰی' وَالرَّبُّ ربٌّ وَاِن تَنَزّل "بندہ بندہ ہی رہے گا خواہ کتنے بلند مقام تک پہنچ جائے اور رب رب ہی رہے گا خواہ کتنا ہی نزولِ اجلال فرمالے"۔ سدرۃ المنتہٰی تک پہنچ کر بھی محمد ﷺ مقامِ بندگی سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں۔ وہاں بھی حال یہ ہے کہ: ﴿فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ⑩﴾ "پس (وہاں بھی) وحی پہنچائی اپنے بندے کو جو وحی پہنچانی تھی"۔ لیکن عبدہٗ وَرَسُوْلُهٗ کے مشاہدے کی کیفیت یہ ہے کہ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰﴾ "نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ ہی اس نے حد سے تجاوز کیا"۔ ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ⑱﴾ "بالتحقیق انہوں نے اپنے رب کی عظیم ترین آیات کا مشاہدہ کیا"۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ آیاتِ کبریٰ ہمارے تخیل و تصور سے بالاتر ہیں اور انسانی زبان کے الفاظ ان کے بیان کا تحمل بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں بھی ان کا ذکر مجمل طور پر ہی کیا گیا ہے۔

حدیثِ معراج کا تسلسل

اب ہم دوبارہ زیرِ مطالعہ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس میں سدرۃ

المنتہیٰ کی بات شروع ہوئی تھی۔ نبی اکرم ﷺ سے حضرت مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ((ثُمَّ رُفِعْتُ اِلٰی سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی)) ''پھر مجھے اُٹھالیا گیا سدرۃ المنتہیٰ تک''۔ ((فَاِذَا نَبْقُھَا مِثْلُ قِلَالِ ھَجَرَ' وَاِذَا وَرَقُھَا مِثْلُ آذَانِ الْفِیَلَۃِ))اب حضور ﷺ سدرۃ المنتہیٰ کی کچھ باتیں ہماری زبان میں سمجھا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ: ''اُس بیری کے درخت کے بیر تو علاقہ ہجر کے مٹکوں کے حجم کے تھے اور اُس کے پتے ہاتھی کے کانوں جتنے بڑے تھے''۔ ((قَالَ: ھٰذِہٖ سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی)) ''(حضرت جبرائیلؑ نے) کہا: یہ ہے سدرۃ المنتہیٰ''۔((وَاِذَا اَرْبَعَۃُ اَنْھَارٍ: نَھْرَانِ بَاطِنَانِ' وَنَھْرَانِ ظَاھِرَانِ)) ''میں نے وہاں چار نہریں دیکھیں' دو نہریں خفیہ طور پر اور دو ظاہر طور پر بہہ رہی تھیں''۔ ((فَقُلْتُ مَا ھٰذَا یَا جِبْرِیْلُ؟)) ''تو میں نے پوچھا: جبرائیل! یہ کیا ہیں؟'' ((قَالَ: اَمَّا الْبَاطِنَانِ فَنَھْرَانِ فِی الْجَنَّۃِ)) ''یہ جو دو ڈھکی ہوئی نہریں جاری ہیں یہ تو جنت کی نہریں ہیں (ایک کوثر اور دوسری سلسبیل)''۔ ((وَاَمَّا الظَّاھِرَانِ' فَالنِّیْلُ وَالْفُرَاتُ)) ''اور یہ جو ظاہری نہریں جاری ہیں یہ نیل اور فرات ہیں''۔ یعنی جن کا مادی پرتو ہمیں دنیا میں نظر آتا ہے۔

((ثُمَّ رُفِعَ لِیَ الْبَیْتُ الْمَعْمُوْرُ)) ''پھر بیت المعمور میرے قریب لایا گیا''۔ بیت المعمور درحقیقت ساتویں آسمان پر اللہ تعالیٰ کا اصل گھر ہے' جس کا ظل اور سایہ اس دنیا میں خانہ کعبہ ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جبرائیلؑ نے اس کے بارے میں بتایا: ((یُصَلِّی فِیْہِ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ' اِذَا خَرَجُوْا لَمْ یَعُوْدُوْا اِلَیْہِ آخِرُ مَا عَلَیْھِمْ)) ''اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور جب ایک بار اس سے نکلتے ہیں تو دوبارہ ان کے داخلے کی نوبت نہیں آتی''۔ اسی طریقے سے فرشتے بیت الحرام میں خانہ کعبہ کا بھی طواف کرتے ہیں۔ پھر جان لیجئے کہ یہ ہماری نگاہوں سے مخفی عالم غیب کی ایک دنیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک وجود ہے' چاہے وہ ہمیں نظر نہ آئے۔ (واضح رہے کہ بخاری و مسلم کی بعض روایات میں بیت المعمور کا ذکر سدرۃ المنتہیٰ سے مقدم ہے)

((ثُمَّ اُتِیْتُ بِاِنَاءٍ مِنْ خَمْرٍ' وَاِنَاءٍ مِنْ لَبَنٍ' وَاِنَاءٍ مِنْ عَسَلٍ)) ''پھر میرے سامنے تین

برتن لائے گئے' ایک شراب کا' ایک دودھ کا اور ایک شہد کا''۔ ((فَاَخَذْتُ اللَّبَنَ)) ''تو میں نے دودھ والا پیالہ اُٹھالیا''۔ ((قَالَ: هِيَ الْفِطْرَةُ الَّتِي اَنْتَ عَلَيْهَا وَاُمَّتُكَ)) ''حضرت جبرائیلؑ نے کہا: یہی مطابقِ فطرت ہے' جس پر آپؐ بھی ہیں اور آپؐ کی اُمت بھی''۔ یعنی انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے انتخاب کی توثیق کی۔ یہی بات اس آیت میں فرمائی گئی ہے: ﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اسی فطرتِ انسانی کا انتخاب فرمایا جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا۔

<u>اُمت کے لیے معراج کے تحفے:</u> نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا: ((ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلَوَاتُ، خَمْسِيْنَ صَلَاةً كُلَّ يَوْمٍ)) ''پھر مجھ پر (اور میری امت پر) پچاس نمازیں یومیہ فرض کی گئیں''۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ مجھے اس موقع پر تین چیزیں عطا کی گئیں: ایک تو پچاس نمازیں ایک دن رات میں فرض ہوئیں اور دوسری سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور تیسری چیز یہ کہ آپؐ کی اُمت کے گناہ کبیرہ بھی بغیر توبہ کے معاف ہوسکیں گے۔ یہ خصوصی تحفے ہیں جو بارگاہِ ربّ العزت سے اس مقام پر شبِ معراج میں محمد رسول اللہ ﷺ کو امت کے لیے عطا ہوئے۔ اس میں اوّلین صلوٰۃ ہے۔ یہ معراج میں فرض ہوئی' لہٰذا اس کے متعلق اولیاء کرامؒ کا قول ہے: ''اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' یعنی نماز اہلِ ایمان کے لیے بمنزلہ معراج ہے۔

پھر اسی روایت میں آگے تفصیل آ رہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب واپسی کے لیے آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: ''یہ پچاس نمازیں بہت زیادہ ہیں، مجھے لوگوں کا تجربہ ہے، آپ کی امت اس کا تحمل نہ کر سکے گی، واپس جائیے اور تخفیف کے لیے درخواست کیجئے''۔ حضور ﷺ واپس گئے تو دس نمازیں معاف ہو گئیں، چالیس رہ گئیں۔ پھر آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے پھر وہی بات کہی اور آپ کو واپس بھیجا۔ پھر گئے تو تیس ہو گئیں، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھیجنے پر پھر گئے تو بیس ہو گئیں، پھر تشریف لے گئے تو دس رہ گئیں۔ اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہی بات کہی۔ آپ ﷺ پھر گئے تو اب پانچ رہ گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کہا کہ پھر واپس جائیے اور تخفیف کے لیے درخواست کیجئے، پانچ نمازیں بھی آپؐ کی اُمت کے لیے بھاری ہوں گی۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب مجھے شرم آتی ہے، اتنی مرتبہ جا چکا ہوں کہ اب مزید جانے میں حیا محسوس کر رہا ہوں، لہٰذا میں اسی پر راضی ہوں اور اس معاملے کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جب میں موسیٰؑ کے پاس سے واپسی کے لیے روانہ ہوا تو ایک ندا کرنے والے کی ندا آئی کہ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) ''میں نے اپنے فرض کو نافذ کر دیا ہے اور اپنے بندوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، اور میں نیکی کا بدلہ دس گنا دیتا ہوں''۔ ایک دوسری متفق علیہ روایت کے آخر میں اس کا ذکر ہے کہ ''اللہ کے ہاں یہ پانچ نمازیں اجر و ثواب کے حساب سے پچاس نمازوں کے مساوی ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں قول بدلا نہیں جاتا''۔ میں نے بقیہ حدیث کی ترجمانی اپنے الفاظ میں کر دی ہے۔ اب اس کے آخری حصے کا متن بھی ملاحظہ کر لیجیے:

((فَرَجَعْتُ اِلٰی مُوْسٰی، فَقَالَ: بِمَ اُمِرْتَ؟ قُلْتُ: اُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ کُلَّ یَوْمٍ، قَالَ: اِنَّ اُمَّتَکَ لَا تَسْتَطِیْعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ کُلَّ یَوْمٍ، وَاِنِّیْ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَکَ، وَعَالَجْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اَشَدَّ الْمُعَالَجَۃِ، فَارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ، فَاسْأَلْہُ التَّخْفِیْفَ لِاُمَّتِکَ، قَالَ: سَاَلْتُ رَبِّیْ حَتّٰی اسْتَحْیَیْتُ وَلٰکِنِّیْ اَرْضٰی وَاُسَلِّمُ، قَالَ: فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادٰی مُنَادٍ: اَمْضَیْتُ فَرِیْضَتِیْ

وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِیْ وَاَجْزِی الْحَسَنَةَ عَشْرًا))

صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکۃ اور کتاب المناقب' باب المعراج میں وارد ہوئی ہے' جبکہ صحیح مسلم میں کم وبیش الفاظ کے ساتھ کتاب الایمان' باب الاسراء بِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِلَی السَّمٰوات وفرض الصلوات میں بھی آئی ہے۔ اس متفق علیہ روایت کے علاوہ بھی واقعۂ معراج کے متعلق کثیر روایات موجود ہیں۔ آنحضور ﷺ کو جنت و دوزخ کے جو مشاہدات کرائے گئے وہ دوسری روایات میں مذکور ہیں' لیکن اسناد کے اعتبار سے کسی دوسری روایت کا وہ درجہ اور مرتبہ نہیں ہے جو اس روایت کا ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ پھر حضور ﷺ واپس مسجد اقصیٰ تشریف لائے اور وہاں سے بُراق پر مکہ مکرمہ مراجعت ہوئی۔ میں چند دوسری روایات کی روشنی میں عرض کر چکا ہوں کہ اس پورے سفر معراج کے دوران وقت بالکل نہیں گزرا۔ گویا وقت کہیں روک دیا گیا اور پوری کائنات کو کہیں تھام دیا گیا۔ یہ بات تو وہ ہے جو آج سے پہلے بھی سمجھ میں آ سکتی تھی کہ شاید کسی ایک وقت پر پوری کائنات کو روک دیا گیا ہو اور کسی کے لیے بھی وقت بالکل نہ گزرا ہو۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اِس وقت تو یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سب کے لیے وقت گزر رہا ہو' لیکن صرف محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے نہ گزرے۔ تاہم یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس پورے سفر کے لیے وقت کی رفتار کو روک دیا گیا ہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؏ ''آگے بڑھو یا وقت کی رفتار روک دو!'' ...... تو یہ وقت کی رفتار محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے لیے روک دی گئی تھی۔ واللہ اعلم!!

مشرکین کا ردِّ عمل

اس واقعہ کو نبی اکرم ﷺ نے جب ایک مجمع میں سنایا تو اس پر جو ردِّ عمل اور جو ہنگامہ ہونا تھا' وہ ہوا۔ یہاں تک بھی ہوا کہ بعض مومنین صادقین متزلزل' متردّد اور متذبذب ہو گئے۔ مشرکینِ مکہ نے بغلیں بجائیں کہ اب ہمیں اپنے پروپیگنڈے کے لیے بڑا سنہری موقع مل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک تو یہ شک ہی کی بات تھی کہ (نقلِ کفر' کفر

نہ باشد) ان کو کچھ خللِ دماغ کا عارضہ ہے‘ اب تو ثابت ہو گیا‘ اب تو کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ آپ حضرات خود اس کا اندازہ کیجیے کہ یہ واقعہ مکہ میں مجمع عام میں بیان کیا جا رہا ہے‘ جہاں منکرینِ نبوت کی عظیم ترین اکثریت ہے‘ وہاں کیسی ہنگامہ آرائی ہوئی ہو گی! پھر مشرکین کی جانب سے امتحانی سوالات کیے گئے: اچھا! یہ بتائیے کہ مسجدِ اقصیٰ کے ستون کتنے ہیں؟ وہاں کی کھڑکیاں کیسی ہیں؟ فرش کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ —— حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں گھبرا گیا۔ اس لیے کہ ایسی تفصیلات کس کو یاد رہتی ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ میں جا کر حضور ﷺ ستون تو نہیں گنتے رہے تھے۔ لیکن جب ایسے سوالات کیے جا رہے تھے تو عین ممکن تھا کہ مجمع میں تالی پٹ جائے‘ مگر اچانک اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سامنے مسجد اقصیٰ کو ظاہر کر دیا۔ اب آپؐ دیکھ دیکھ کر ان کے اس طرح کے سوالات کے جوابات دیتے رہے کہ لوگ دنگ ہوتے رہے۔ بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے:

عَنْ جابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ ؓ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَمَّا كَذَّبَتْنِىْ قُرَيْشٌ قُمْتُ فِي الْحِجْرِ فَجَلَّى اللّٰهُ لِيْ بَيْتَ الْمَقْدِسِ فَطَفِقْتُ اُخْبِرُهُمْ عَنْ آيَاتِهٖ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَيْهِ))(۱)

حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا: ”جب مجھ کو قریش نے (واقعہ معراج پر) جھٹلایا تو میں حجر میں کھڑا ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میرے سامنے ظاہر فرما دیا۔ چنانچہ میں نے ان کو اس کی نشانیاں بتانی شروع کر دیں اور میں اس کو دیکھتا جاتا تھا۔“

میں نے عرض کیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ کی طرف سے بے شمار مشاہدات کرائے گئے۔ جنت آپؐ کے سامنے لے آئی جاتی ہے‘ جہنم سامنے لے آئی جاتی ہے۔ بیت المقدس سامنے لے آیا جاتا ہے اور مسجد اقصیٰ کے مشاہدے سے حضور ﷺ ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب حدیث الاسراء‘ و کتاب تفسیر القرآن‘ باب قولہ اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام۔ صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب ذکر المسیح ابن مریم والمسیح الدجال۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تصدیق

اسی ضمن میں وہ واقعہ آتا ہے کہ چند لوگ دوڑے دوڑے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ پالا ہم مارلیں تو پھر ہماری جیت ہے' اگر ہم ابوبکرؓ کو متزلزل کر دیں تو پھر گویا ہمارے لیے کوئی اور مسئلہ نہیں رہے گا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سن کر ایک مرتبہ تو جھرجھری لی' لیکن آنے والوں سے صرف ایک سوال کیا کہ ''کیا واقعی وہؐ یہ فرما رہے ہیں؟'' لوگوں نے خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے کہا: ہاں ہاں وہ یہ کہہ رہے ہیں' چلو ہم تمہیں اپنے ساتھ لے چلتے ہیں' اپنے کانوں سے سن لو۔ انہوں نے سمجھا کہ ہمارا وار کارگر ہوا ہے' واقعی کوئی تزلزل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کے بعد یہ جواب دیا: ''لوگو! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں تو صدفی صد درست کہہ رہے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ روزانہ فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے' اور اگر ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر لے جایا گیا تو یہ کون سی بڑی شے ہے؟ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں''۔ یہ دن ہے کہ جس دن سے بارگاہِ رسالتؐ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب عطا ہوا اور اسی روز سے ابوبکر ''صدیق اکبر'' شمار ہوتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

تو یہ تھا وہ سفرِ معراج' جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہفت آسمان اور سدرۃ المنتہیٰ پر موجود اپنی عظیم نشانیوں کا مشاہدہ کرایا۔

اَقولُ قَولِی هٰذا وَاَستَغفِرُ اللّٰهَ لِی وَلَکُم وَلِسَائِرِ المُسلِمِینَ وَالمُسلِمَاتِ

ضمیمہ

واقعۂ معراج سے متعلق

چند احادیثِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ

ذیل میں چند ایسی احادیث پیش کی جارہی ہیں جن کا براہِ راست یا بالواسطہ حوالہ اس کتابچے میں آیا ہے۔

رؤیتِ باری تعالیٰ کے متعلق احادیث

(۱) عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا)) وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ: كُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَنَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ: ((اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ، لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ، فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تُغْلَبُوا عَلٰى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا)) ثُمَّ قَرَأَ ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾

(صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ تعالیٰ وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ، وکتاب مواقیت الصلاۃ، باب فضل صلاۃ الفجر وباب فضل صلاۃ العصر۔ ومتعدد دیگر مقامات۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب فضل صلاتی الصبح والعصر والمحافظۃ علیھما۔ وسنن الترمذی، ابواب صفۃ الجنۃ۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی الرؤیۃ۔ وسنن ابن ماجہ، المقدمۃ، باب فیما انکرت الجھمیۃ)

حضرت جریر بن عبداللہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنے پروردگار کو عیاں دیکھو گے“۔ ایک روایت میں ہے: ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: ”تم اپنے رب کی طرف دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس کے دیکھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ اگر تم اس بات کی طاقت رکھو کہ تم سورج نکلنے اور غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھنے سے مغلوب نہ کر دیے جاؤ تو ایسا ضرور کرو“۔ پھر یہ آیت پڑھی: ”اور تسبیح بیان کرو اپنے پروردگار کی سورج

نکلنے اور غروب ہونے سے پہلے۔''

(۲) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الْغِفَارِی رضی اللہ عنہ قَالَ: سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: هَلْ رَأَیْتَ رَبَّكَ؟ قَالَ: ((نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاهُ؟))

(صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی قوله نور انی اراه وفی قوله رأیت نورا)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ''کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وہ تو نور ہے' میں اسے کیونکر دیکھتا؟''

(۳) عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ: کُنْتُ مُتَّکِئًا عِنْدَ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) فَقَالَتْ: یَا اَبَا عَائِشَةَ، ثَلَاثٌ مَنْ تَکَلَّمَ بِوَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ فَقَدْ اَعْظَمَ عَلَی اللّٰهِ الْفِرْیَةَ، قُلْتُ: مَاهُنَّ؟ قَالَتْ: مَنْ زَعَمَ اَنَّ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وسلم رَآی رَبَّهٗ فَقَدْ اَعْظَمَ عَلَی اللّٰهِ الْفِرْیَةَ، قَالَ: وَکُنْتُ مُتَّکِئًا فَجَلَسْتُ فَقُلْتُ: یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ، اَنْظِرِیْنِیْ وَلَا تَعْجَلِیْنِیْ، اَلَمْ یَقُلِ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ﴾ ﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً اُخْرٰی﴾؟ فَقَالَتْ: اَنَا اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ سَاَلَ عَنْ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: ((اِنَّمَا هُوَ جِبْرِیْلُ، لَمْ اَرَهُ عَلٰی صُوْرَتِهِ الَّتِیْ خُلِقَ عَلَیْهَا غَیْرَ هَاتَیْنِ الْمَرَّتَیْنِ، رَاَیْتُهٗ مُنْهَبِطًا مِنَ السَّمَاءِ، سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهٖ مَا بَیْنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) فَقَالَتْ: اَوَلَمْ تَسْمَعْ اَنَّ اللّٰهَ یَقُوْلُ: ﴿لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾؟ اَوَلَمْ تَسْمَعْ اَنَّ اللّٰهَ یَقُوْلُ: ﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَاءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ﴾؟ قَالَتْ: وَمَنْ زَعَمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم کَتَمَ شَیْئًا مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ فَقَدْ اَعْظَمَ عَلَی اللّٰهِ الْفِرْیَةَ، وَاللّٰهُ یَقُوْلُ: ﴿یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ قَالَتْ: وَمَنْ زَعَمَ اَنَّهٗ یُخْبِرُ بِمَا یَکُوْنُ فِیْ غَدٍ فَقَدْ اَعْظَمَ عَلَی اللّٰهِ الْفِرْیَةَ، وَاللّٰهُ یَقُوْلُ: ﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾

(صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب معنی قول اللہ عزوجل ولقد راه نزلة اخری...... وسنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن' باب ومن سورة الانعام)

جناب مسروق رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تکیہ لگائے بیٹھا تھا کہ انہوں نے فرمایا: ''اے ابوعائشہ (مسروق رحمہ اللہ کی کنیت) تین باتیں ایسی ہیں کہ جو کوئی ان میں سے کوئی ایک بات بھی کہے تو اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا۔'' میں نے کہا: وہ کیا

ہیں؟ (حضرت عائشہؓ نے) فرمایا: ''جس کسی کا یہ خیال ہو کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا''۔ مسروقؒ کہتے ہیں: میں تکیہ لگائے ہوئے تھا' (یہ سن کر) میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہا: اُمّ المؤمنین! ٹھہریئے' ذرا میری بات تو سنئے اور جلدی نہ کیجئے' کیا اللہ عزوجل نے یہ نہیں فرمایا: (ترجمہ) ''اور اُس نے اُس کو روشن افق پر دیکھا ہے''۔ ''اور ایک مرتبہ پھر اس نے (سدرۃ المنتہیٰ کے پاس) اس کو اترتے دیکھا''۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''اس امت میں سب سے پہلے میں نے ہی رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا تھا: ''یہ تو جبریل علیہ السلام (کا ذکر) ہے۔ میں نے ان کو ان کی اصل صورت میں جس پر انہیں پیدا کیا گیا ہے' ان دو مواقع کے سوا کبھی نہیں دیکھا۔ (ان دو مواقع پر) میں نے انہیں آسمان سے نیچے اترتے دیکھا' اور ان کی عظیم ہستی زمین و آسمان کے درمیان ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی''۔ پھر (حضرت عائشہؓ نے) فرمایا: ''کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا؟ (ترجمہ) ''نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے''۔ اور کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی نہیں سنا؟ ''اور کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر یا تو وحی کے طور پر' یا پردے کے پیچھے سے' یا یہ کہ ایک فرشتہ بھیجے اور وہ اس پر اللہ کے اِذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہے' یقیناً وہ بلند مرتبت اور صاحبِ حکمت ہے''۔

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مزید) فرمایا: ''اور جس کسی کا یہ خیال ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ میں سے کوئی بات چھپائی ہے تو اس نے بھی اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا جھوٹ گھڑا' کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے: (ترجمہ) ''اے رسولؐ' جو کچھ آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے' وہ لوگوں تک پہنچا دیجئے' اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا''۔ پھر فرمایا: ''اور جو کوئی یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ آنے والے کل کے حالات بتا سکتا ہے اس نے بھی اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ترجمہ) ''کہہ دیجئے کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا''۔

(۱) عَنِ ابْنِ عَوْنٍ اَنْبَاَنَا الْقَاسِمُ عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: مَنْ زَعَمَ اَنَّ مُحَمَّدًا ﷺ رَاٰی رَبَّهٗ فَقَدْ اَعْظَمَ وَلٰكِنْ قَدْ رَاٰی جِبْرِيْلَ فِيْ صُوْرَتِهٖ وَخَلْقُهٗ سَادٌّ مَا بَيْنَ الْاُفُقِ

(صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکۃ)

جناب عونؒ بیان کرتے ہیں کہ ہم سے حضرت قاسمؒ (بن محمد بن ابی بکرؓ) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا: ''جس کسی کا یہ خیال ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربّ کو دیکھا ہے تو اُس نے بہت بڑا جھوٹ بولا۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ کو ان کی اصل صورت میں دیکھا تھا کہ ان کی ہستی پورے افق کے مابین چھائی ہوئی تھی۔''

(۵) حَدَّثَنَا الشَّيْبَانِي قَالَ: سَأَلْتُ زِرَّ بْنَ حُبَيْشٍ عَنْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ قَالَ: اَخْبَرَنِى ابْنُ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِىَّ صلی اللہ علیہ وسلم رَاٰى جِبْرِيْلَ لَهٗ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ (صحيح البخارى، كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة۔ وصحيح مسلم، كتاب الايمان، باب فى ذكر سدرة المنتهى)

ہمیں شیبانیؒ نے بتایا کہ میں نے زِر بن حبیشؒ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں دریافت کیا کہ (ترجمہ) ''یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا''۔ تو انہوں نے کہا: ''مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو اس صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔''

معراج میں نماز کی فرضیت سے متعلق ایک روایت سے اقتباس

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ اَبُوْذَرٍّ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: فُرِجَ سَقْفُ بَيْتِىْ وَاَنَا بِمَكَّةَ فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ...... قَالَ: (صلی اللہ علیہ وسلم): ((فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى علیہ السلام فَاَخْبَرْتُهٗ، قَالَ: رَاجِعْ رَبَّكَ، فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ، قَالَ: فَرَاجَعْتُ رَبِّىْ، فَقَالَ: هِىَ خَمْسٌ، وَهِىَ خَمْسُوْنَ، لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَىَّ، قَالَ: فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى، فَقَالَ: رَاجِعْ رَبَّكَ، فَقُلْتُ: قَدِ اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَبِّىْ ......)) (صحيح البخارى، كتاب الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة فى الاسراء وكتاب احاديث الانبياء وكتاب التوحيد۔ وصحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الاسراء برسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الى السماوات وفرض الصلوات)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں مکہ میں تھا کہ میرے گھر کی چھت میں شگاف ہوا اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں

اس کے بارے میں بتایا''۔ انہوں نے کہا: ''اپنے رب کے پاس واپس جایئے' کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھے گی''۔ آپ نے فرمایا: ''میں پھر اپنے رب کے پاس واپس پلٹا' تو رب تعالیٰ نے (نمازوں کی تعداد پانچ معین کرتے ہوئے) فرمایا: ''یہ (اگرچہ) پانچ ہیں' مگر (ثواب کے لحاظ سے) پچاس ہی ہیں' میرے ہاں قول تبدیل نہیں ہوا کرتا''۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر مجھے اپنے رب کے پاس واپس جانے کو کہا۔ مگر میں نے کہا کہ اب مجھے اپنے رب سے حیا آتی ہے......''

سدرۃ المنتہیٰ کی کیفیت اور معراج کے تین تحفے

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: لَمَّا اُسْرِیَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ انْتُهِیَ بِهٖ اِلٰی سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی' وَهِیَ فِی السَّمَاءِ السَّادِسَةِ اِلَيْهَا يَنْتَهِیْ مَا يُعْرَجُ بِهٖ مِنَ الْاَرْضِ فَيُقْبَضُ مِنْهَا' وَاِلَيْهَا يَنْتَهِیْ مَا يُهْبَطُ بِهٖ مِنْ فَوْقِهَا فَيُقْبَضُ مِنْهَا، قَالَ: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى﴾ قَالَ: فَرَاشٌ مِنْ ذَهَبٍ' قَالَ: فَاُعْطِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثًا: اُعْطِیَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ' وَاُعْطِیَ خَوَاتِيْمَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ' وَغُفِرَ لِمَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ مِنْ اُمَّتِهٖ شَيْئًا الْمُقْحِمَاتُ

(صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب فی ذکر سدرۃ المنتہیٰ۔ وسنن الترمذی' ابواب التفسیر' باب ومن سورۃ النجم۔ وسنن النسائی' کتاب الصلاۃ' باب فرض الصلاۃ......)

''حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو رات کے وقت (سفر معراج پر) لے جایا گیا تو آپ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اور سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان میں ہے۔ زمین سے جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ سدرہ تک پہنچتی ہے اور وہاں سے لے لی جاتی ہے اور اوپر سے جو چیز اتاری جاتی ہے وہ بھی یہیں تک آتی ہے اور یہاں سے لے لی جاتی ہے۔ اور سدرہ کے متعلق انہوں نے اس آیت کا حوالہ دیا: (ترجمہ) ''اور سدرہ پر چھایا ہوا تھا جو کچھ بھی چھایا ہوا تھا''۔ اور کہا کہ وہ سونے کے پروانے ہیں۔ اور (سدرۃ المنتہیٰ پر) نبی ﷺ کو تین چیزیں دی گئیں: (۱) پانچ نمازیں' (۲) سورۃ البقرۃ کی آخری آیات' اور (۳) آپ کی اُمت میں سے ہر اس شخص کے کبیرہ گناہ بھی معاف کر دیے گئے جس نے اللہ کے ساتھ کسی نوع کا شرک نہ کیا ہو۔''

❁ ❁ ❁

رسولِ انقلاب ﷺ
کا
طریقِ انقلاب

ترتیب

- اِنقلاب کا لغوی و اصطلاحی مفہوم 420
- کامل انقلاب کی واحد مثال: انقلابِ نبویؐ 422
- اِنقلابی عمل کے لوازم و مراحل 429

(۱) انقلابی نظریہ 429

(۲) تنظیم 430

(۳) تربیت 430

(۴) صبرِ محض (Passive Resistance) 431

(۵) راست اقدام (Active Resistance) 434

(۶) مسلّح تصادم (Armed Conflict) 436

(۷) تصدیرِ انقلاب 438

- رسولِ انقلاب ﷺ کا اِنقلابی نظریہ اور اس کے تقاضے 438

(۱) انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت 439

(۲) ملکیت کی بجائے امانت 439

(۳) کامل معاشرتی مساوات 440

- اسلامی اِنقلابی تنظیم اور اس کی اَساسات 442
- اِنقلابی تربیت کا نبویؐ منہاج 446
- آنحضور ﷺ کی اِنقلابی جِدّوجُہد میں صبرِ محض کا مرحلہ 449
- انقلابِ نبویؐ میں اِقدام اور چیلنج کا مرحلہ 453

مدینہ میں حضور ﷺ کے ابتدائی اِقدامات 454

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات 456

- انقلابِ نبویؐ کا چھٹا مرحلہ: مُسلّح تصادم 459
- انقلابِ نبویؐ کی توسیع و تصدیر 460
- منہجِ انقلابِ نبویؐ کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق 462

موجودہ دَور میں اقدام کی نوعیت 465

- وقت کی اہم ترین ضرورت 467

نحمدهٗ ونصلی علیٰ رَسولہِ الکریم ...... امّا بعد:
اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳‘ الفتح:۲۸‘ الصف:۹)

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸)

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ﴿۲۱﴾﴾ (الاحزاب) ...... صدق اللّٰہ العظیم

معزز حاضرین اور محترم خواتین —— السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں اپنے موضوع پر براہِ راست گفتگو سے قبل آپ کے سامنے ایک سوال رکھ رہا ہوں کہ آج اُمتِ مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے؟ ہر شخص سوچے کہ کیا مال و دولت‘ حکومت‘ تعلیم‘ ٹیکنالوجی یا جمہوریت میں سے کوئی چیز ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے؟ میرے تجزیے کے مطابق آج اُمتِ مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے اس طریق کار کو سمجھ لے جس طریقے پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کیا۔ میری سوچ کے یہ پہلو تو آپ حضرات پر واضح ہوں گے کہ اس وقت عالمی پیمانے پر اُمتِ مسلمہ جس زبوں حالی کا شکار ہے یہ اصل میں عذابِ الٰہی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زمین پر اللہ کے دین کے نمائندے بنائے گئے تھے‘ لیکن ہم آج پوری دنیا میں کوئی ایک ملک بھی بطور ماڈل ایسا نہیں دکھا سکتے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ لوگو آؤ‘ دیکھو‘ یہ ہے نظامِ مصطفیٰ ﷺ —— یہ ہیں اللہ کے دینِ حق کے قیام کی برکات! لہٰذا ہم اللہ کے عذاب کی گرفت میں ہیں۔ یہ بات جان لیجیے کہ اللہ کے اِذن کے بغیر بھارت اور امریکہ سمیت دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ گویا اس وقت دنیا میں ہمارا جو حال ہو رہا ہے وہ اِذنِ ربّ ہی سے ہو رہا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اللہ کے دین کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے‘ بلکہ اپنے

عمل سے اسے misrepresent کر رہے ہیں۔ تو اس کا حل ایک ہی ہے کہ ہم کم از کم دنیا کے کسی ایک ملک میں صحیح صحیح اسلامی نظام قائم کر کے دکھا دیں۔ اور پھر دنیا کو دعوت دیں کہ آؤ' دیکھو یہ ہے اسلام!

ملکی اور قومی سطح پر پاکستان کے بارے میں بھی میرا یہ موقف آپ کے علم میں ہے کہ پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنے قیام کی وجہ جواز کھو بیٹھا ہے۔ البتہ ابھی اللہ کی طرف سے ایک مہلت باقی ہے اور اب اس کے بقاء و استحکام کی صرف ایک صورت ہے کہ یہاں پر اسلامی انقلاب برپا ہو۔ یہ ملک اسی مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ بانی و مؤسسِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصولِ حریت واخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہی بات مفکّر و مبشّر و مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال نے فرمائی تھی۔

تیسری طرف یہ دیکھئے کہ عالمی سطح پر اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت امریکہ اور اس کے حواری اس بات پر تُل گئے ہیں کہ دنیا میں کہیں پر اسلامی نظام کا ظہور نہ ہو۔ یہ وہی بات ہے جو علامہ اقبال نے ابلیس کی زبان سے کہلوائی تھی ۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

آج امریکہ اور پوری مغربی دنیا پر بالفعل یہ خوف طاری ہے کہ کہیں دنیا کے کسی کونے میں شرعِ پیغمبرؐ کا عملی ظہور نہ ہو جائے۔ ظاہر بات ہے کہ ''جَاءَ الْحَقُّ '' کے بعد ''زَهَقَ الْبَاطِلُ '' اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور یہ خوف ان پر اس درجے مسلط ہے کہ ان کی پوری گلوبل پالیسی اسی پر مرکوز ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ انہیں نظر آ رہا ہے کہ عالمِ اسلام کے اندر اسلامی نظام کو قائم کرنے کا جذبہ انگڑائیاں لے رہا ہے اور یہ جذبہ ان کے اعتبار سے بہت خوفناک جذبہ ہے۔ اس ضمن میں کمی صرف یہ ہے کہ ابھی اُس جذبے کو صحیح راہِ عمل نہیں مل رہی اور محض جذبہ اُس وقت تک ناکافی ہے جب تک اسے صحیح لائحہ عمل بھی نہ مل جائے۔

ان تینوں زاویوں کے حوالے سے میری بات جس نقطے پر آ کر مرکوز ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کو نظامِ زندگی کے طور پر نافذ و غالب کرنے کے لیے صحیح لائحہ عمل واضح کیا جانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور صحیح لائحہ عمل وہی ہوگا جو سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ ہو۔ ہم نے وہ احادیث ایک جگہ جمع کر کے بہت عام کی ہیں جن سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور کفار کا ''نیو ورلڈ آرڈر'' نہیں' اسلام کا ''Just World Order'' پوری دنیا پر غالب ہو کر رہے گا۔ یہ جس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کو دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت ''جیو (یہودی) ورلڈ آرڈر'' ہے' جبکہ اسلامک ورلڈ آرڈر منصفانہ اور عادلانہ نظام ہے اور اس کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری دی ہے کہ یہ قیامت سے قبل پوری دنیا پر غالب ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا آغاز اسی طور سے ہوگا کہ یہ نظام پہلے کسی ایک ملک میں قائم ہوگا' جیسے حضور ﷺ کے دست مبارک سے ''جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ'' کی کیفیت جزیرہ نمائے عرب میں پیدا ہوئی تھی۔ دنیا کے کسی ایک ملک میں بھی یہ نظام کیسے قائم ہوگا؟ اس کے ضمن میں امامِ دارالہجرت امام مالکؒ کا قول ہے: ''لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا'' یعنی اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی' مگر اسی طریقے پر جس پر کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔ چنانچہ آج اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کے انقلاب کا طریقِ کار اچھی طرح سمجھنا ہوگا اور پھر اسے apply کرنا ہوگا۔

میں نے یہ چند باتیں بطور تمہید عرض کی ہیں تاکہ آج کی گفتگو کی اہمیت آپ پر واضح ہو جائے۔ آج غلبۂ اسلام کے لیے لوگوں کے جذبے میں کمی نہیں ہے' لیکن صحیح لائحہ عمل پیش نظر نہ ہونے کے باعث تحریکیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال بالفعل یہ ہو گیا ہے کہ ۔

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے!

اسلامی انقلاب کے لیے صحیح لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا جو صرف اُسوۂ رسول ﷺ میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ یعنی تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی شخصیت اور حیاتِ طیبہ میں ایک بہت عمدہ نمونہ موجود ہے۔ لیکن اس ''اسوۂ حسنہ'' سے استفادے کی تین شرائط ہیں' جو ساتھ ہی بیان فرما دی گئی ہیں: ﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ یعنی اس سے استفادہ وہی کر سکیں گے (۱) جو اللہ سے ملاقات کے امیدوار ہیں' (۲) جو یومِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں' اور (۳) جو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ اس اسوۂ حسنہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ جیسے قرآن ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' یعنی تمام نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ہے' لیکن اس کی ہدایت سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکیں گے جس کے اندر تقویٰ موجود ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا کہ یہ ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' ہے۔

انقلاب کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

اس تمہیدی گفتگو کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انقلاب کسے کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں تبدیلی۔ لہٰذا ہم یہ لفظ کسی بھی لفظ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً علمی انقلاب' ثقافتی انقلاب' سائنسی انقلاب' فوجی انقلاب۔ لیکن لفظ ''انقلاب'' کے اصطلاحی مفہوم میں اس استعمال کی گنجائش نہیں۔ بلکہ کسی معاشرے کے سیاسی نظام' معاشی نظام یا سماجی نظام میں سے کسی ایک میں بنیادی تبدیلی کو صحیح انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آج دنیا بھر میں انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم مانا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے' جبکہ دوسرا حصہ زندگی کے اجتماعی معاملات کو محیط ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر حصہ مذہب کا دائرۂ کار ہے' جو کہ عقائد (dogmas)' مراسمِ عبودیت (rituals) اور سماجی رسومات (social customs) پر مشتمل ہے۔ آج دنیا بھر میں ان معاملات میں فرد کو آزاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح کے چاہے عقائد اپنا لے۔ چاہے وہ ایک خدا کو مانے' چاہے سو کو

مانے یا ہزار کو مانے‘ چاہے کسی کو بھی نہ مانے۔ جس طرح چاہے مراسمِ عبودیت بجالائے۔ چاہے گوشہ نشین ہو کر تپسیائیں کرے‘ چاہے بتوں کے آگے سجدے کرے‘ یا ایک نادیدہ خدا کی پرستش کرے۔ مراسم عبودیت کی اسے آزادی ہے۔ چاہے روزے رکھے‘ نماز پڑھے‘ چاہے مندر میں جائے یا چرچ میں‘ اجازت ہے۔ اسی طرح سماجی رسومات ادا کرنے میں وہ آزاد ہے۔ شادی کے موقع پر چاہے نکاح پڑھوائے چاہے پھیرے ڈلوائے۔ فوت شدہ شخص کی میت کو چاہے دفن کیا جائے چاہے اسے جلادیا جائے۔

زندگی کا دوسرا حصہ تہذیب‘ تمدن‘ ریاست اور سیاست یعنی اجتماعی نظام سے متعلق ہے اور یہ سیاسی نظام‘ معاشی نظام اور سماجی نظام (The Politico-Socio-Economic System) پر مشتمل ہے۔ اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ اس کا نام سیکولرزم ہے۔ واضح رہے کہ سیکولرزم کا مطلب لامذہبیت نہیں ہے‘ بلکہ یہ ہمہ مذہبیت‘ لادینیت کے اصول پر مبنی ہے۔ سیکولرزم میں مذہب تو سارے قابلِ قبول ہیں۔ یہ بات تو بش بھی کہتا ہے کہ ’’We are ready to embrace Islam‘‘ اسلام بطور مذہب پر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے امریکہ میں آکر سیناگاگ اور چرچ خریدے اور انہیں مساجد بنالیا‘ ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہوں نے یہاں‘ بڑی تعداد میں ایفروامریکنز کو اور کچھ گوروں کو بھی convert کر کے مسلمان بنالیا‘ ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لیے کہ بحیثیتِ مذہب ان کی اسلام سے کوئی جنگ نہیں ہے‘ لیکن ایک نظام (Politico-Socio-Economic system) کی حیثیت سے اسلام انہیں قطعاً گوارا نہیں۔ اسلام کے اسی تصور کو وہ ’’فنڈامنٹلزم‘‘ کا نام دیتے ہیں۔ اور اس وقت چونکہ کچھ فنڈامینٹلسٹ لوگوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس پر دہشت گردی کا لیبل لگ گیا ہے‘ لہٰذا وہ فنڈامینٹلزم کو دہشت گردی (terrorism) کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ ’’دہشت گردی کے خلاف جنگ‘‘ کا نعرہ لگاتے ہیں تو کبھی ’’بنیاد پرستی کے خلاف جنگ‘‘ کا۔ حقیقت میں یہ جنگ اسلام کے نظامِ حیات کے خلاف ہے۔ یہ جنگ اسلام کے عقائد‘ عبادات اور رسومات کے خلاف نہیں ہے۔

آج کی اصطلاح میں انقلاب اس اجتماعی نظام میں کسی تبدیلی کو کہتے ہیں۔ مذہبی میدان میں کسی بڑی سے بڑی تبدیلی کو بھی انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ تاریخ انسانی میں سب سے بڑی مذہبی تبدیلی ۳۰۰ عیسوی میں ہوئی تھی جب شہنشاہِ روم قسطنطین اعظم نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور ساری سلطنت عیسائی ہو گئی تھی۔ مذہبی تاریخ کے اندر اتنی بڑی تبدیلی (conversion) کبھی نہیں ہوئی۔ سلطنتِ روما اُس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی' یعنی پورا شمالی افریقہ' پورا مشرقی یورپ اور پورا مغربی ایشیا۔ لیکن اتنی بڑی مذہبی تبدیلی کا نام بھی انقلابات کی تاریخ میں نہیں گنوایا گیا۔ اس لیے کہ اس مذہبی تبدیلی سے سیاسی' معاشی یا سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ انقلاب (revolution) وہ تبدیلی کہلائے گی جو کسی ملک کے سیاسی نظام' معاشی نظام' یا سماجی نظام سے متعلق ہو اور بنیادی نوعیت کی ہو۔

کامل انقلاب کی واحد مثال: انقلابِ نبویؐ

اب ہم دنیا کے چند مشہور انقلابات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان میں ''انقلابِ فرانس'' بہت مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ واقعی انقلاب تھا' لیکن اس سے صرف سیاسی نظام میں تبدیلی آئی تھی۔ مذہب پہلے بھی عیسائیت تھا' بعد میں بھی وہی رہا۔ سماجی ڈھانچے (social structure) میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی نظام تبدیل ہوا۔ دوسرا بہت مشہور انقلاب روس کا بالشویک انقلاب ہے جو ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اس سے صرف معاشی نظام تبدیل ہوا۔ تمام ذرائع پیداوار قومیا لیے گئے اور انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ نوٹ کیجیے کہ یہ دونوں انقلابات ہیں' جبکہ رومن امپائر کا بیک وقت کرسچین ہو جانا انقلاب نہیں ہے۔

اب ذرا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کا جائزہ لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ کیا واقعی حضور ﷺ نے انقلاب برپا کیا —— یا ہم صرف جوشِ عقیدت میں یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ یہ بات میں جذباتی انداز سے نہیں بلکہ ٹھنڈے تجزیے (cold analysis)

سے ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو میں اس پر اغیار کی گواہیاں پیش کروں گا' اس لیے کہ ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' (اصل فضیلت وہ ہوتی ہے جس کا دشمن بھی اقرار کریں)۔ دوست اور اعتقاد رکھنے والے تو ہر چیز کی تعریف ہی کریں گے' اصل تعریف وہ ہے جو دشمن کی زبان سے ہو۔ اگر شیر دل کنگ رچرڈ نے صلاح الدین ایوبی کی تعریف کی تو معلوم ہوا کہ واقعتاً صلاح الدین ایوبی بڑی عظیم شخصیت تھی۔

ایم این رائے ایک بنگالی ہندو تھا اور وہ انٹرنیشنل کمیونسٹ آرگنائزیشن کا رکن تھا۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں بریڈلا ہال لاہور میں ''اسلام کا تاریخی کردار'' (The Historical Role of Islam) کے عنوان سے لیکچر دیا اور کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب محمد (ﷺ) نے برپا کیا۔ واضح رہے کہ وہ عقیدت مند نہیں ہے' ایک بنگالی ہندو ہے اور ٹاپ کا کمیونسٹ ہے' لیکن وہ یہ بات تسلیم کر رہا ہے۔ یہ تو ۱۹۲۰ء کی بات ہے' یعنی صدی کے آغاز سے ۲۰ برس بعد — اب ۱۹۸۰ء پر آ جایئے' صدی کے اختتام سے ۲۰ برس قبل — امریکہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے کتاب ''The 100'' لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے پانچ ہزار سالہ معلوم انسانی تاریخ میں سے ایسے ایک سو انسانوں کا انتخاب (selection) کر کے ان کی درجہ بندی (gradation) کی' جنہوں نے انسانی تمدن کے دھارے کے رخ کو موڑنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اور اس درجہ بندی میں وہ نمبر ایک پر لایا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہے اور میری اطلاع کی حد تک ابھی زندہ ہے' اور مین ہٹن میں رہائش پذیر ہے۔ اس کی یہ کتاب دنیا میں بہت عام ہوئی ہے' لیکن اشاعت کے بعد وہ بہت جلد نایاب ہو گئی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ شاید کسی سازش کے تحت اسے غائب کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس کتاب میں (عیسائیوں کے نزدیک خدا کے اکلوتے بیٹے) حضرت مسیح علیہ السلام کو نمبر تین پر رکھا اور حضور ﷺ کو نمبر ایک پر لایا' اور یہ بات عیسائی دنیا کے لیے قابلِ قبول اور قابلِ برداشت نہیں تھی۔ اس نے لکھا ہے:

"My choice of Muhammad to lead the list of the

world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے نزدیک انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان ہیں۔ ایک ہے مذہب' اخلاق اور روحانیت کا میدان' جبکہ ایک ہے تمدن' تہذیب' سیاست اور معاشرت کا میدان' اور ان دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب (supremely successful) انسان تاریخِ انسانی میں صرف اور صرف ایک ہی ہیں اور وہ ہیں حضرت محمد ﷺ۔ جن لوگوں کو بالعموم بڑا سمجھا جاتا ہے ان کی عظمت کسی ایک پہلو سے نمایاں ہوتی ہے۔ عبادت گزاری اور نفس کشی میں گوتم بدھ بہت اونچا ہے۔ اخلاقی تعلیمات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام بہت اونچے ہیں' لیکن ریاست' حکومت اور سیاست میں ان کا کوئی دخل نہیں۔ فتوحات اور ملک گیری کے حوالے سے سکندرِ اعظم بہت اونچا ہے' اٹیلا بہت اونچا ہے' چنگیز خان بہت اونچا ہے' اکبر اعظم بہت اونچا ہے۔ اور بھی بڑے بڑے حکمران ہو گزرے ہیں —— لیکن دین' اخلاق اور روحانیت میں ان کا کوئی مقام تھا؟ یہاں زیرو سے بھی کام نہیں چلے گا' minus لانا پڑے گا۔ تاریخ انسانی میں صرف اور صرف ایک ہی انسان ہے جو ہر دو اعتبار سے بلند ترین اور کامیاب ترین قرار پاتا ہے —— اور وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔

اغیار کی گواہیوں میں سے تیسری گواہی میں ایچ جی ویلز کی دیا کرتا ہوں' لیکن اس کی جس عبارت کا میں حوالہ دیتا ہوں' اس کی کتاب "A Concise History of the World" کے نئے ایڈیشن سے اس عبارت کو نکال دیا گیا ہے۔ واقعتاً کسی دشمن کی زبان سے اس سے بڑا اخراجِ تحسین ممکن نہیں۔ اس لیے کہ ایچ جی ویلز بدترین دشمن ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین (دو بدبخت جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے) ان سے کہیں زیادہ زہریلے اور ان سے کہیں زیادہ کمینگی والے جملے کہے ہیں۔ لیکن جب اُس نے آنحضور ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے

مندرجہ ذیل الفاظ کا حوالہ دیا ہے تو وہ گھٹنے ٹیک کر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (مسند احمد' ح ۲۲۹۷۸)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

ایچ جی ویلز اگرچہ عیسائی ہے' لیکن خطبہ حجۃ الوداع کا حوالہ دینے کے بعد وہ یہ اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے:

''اگرچہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

چنانچہ دشمنوں کی گواہی سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا جو محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا فرمایا۔ انقلابِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس سے تقابل کریں تو نظر آتا ہے کہ انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی نظام بدلا اور انقلابِ روس میں صرف معاشی نظام تبدیل ہوا —— لیکن انقلابِ محمدیؐ میں ہر چیز بدل گئی۔ مذہب بھی بدل گیا' عقائد بھی بدل گئے' رسومات بھی بدل گئیں' سیاسی نظام بھی بدل گیا' معاشی نظام بھی بدل گیا' معاشرت بھی بدل گئی۔ کوئی بھی شے اپنی سابقہ حالت پر قائم نہیں رہی۔ ڈھونڈ کر بتایئے کہ فلاں چیز جوں کی توں رہ گئی۔ جہاں پڑھے لکھے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے' اس قوم کو آپ ﷺ نے علم کے میدان میں دنیا کا امام بنا دیا۔ انہوں نے نئے نئے علوم ایجاد کیے' پوری دنیا کا علم سمیٹ

کر' ہندوستان اور یونان تک سے علم لے کر' اور اسے مزید develope کر کے دنیا کے سامنے رکھا۔ تو پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ دنیا کا جامع ترین' گھمبیر ترین اور most profound انقلاب محمد عربی ﷺ کا انقلاب تھا' کوئی دوسرا انقلاب اس کے مقابلے میں نہیں آ سکتا۔ باقی سب جزوی (partial) انقلابات تھے۔ باقی تمام انقلابات میں آپ دیکھیں گے کہ فکر اور دعوت دینے والے کچھ اور لوگ تھے جبکہ انقلاب برپا کرنے والے کچھ اور۔ مارکس اور اینجلز نے کتاب Das Capital جرمنی یا انگلستان میں بیٹھ کر لکھی' لیکن جرمنی اور انگلستان کے کسی ایک گاؤں میں بھی مارکسسٹ انقلاب نہیں آیا' بلکہ تیسرے تیواڑے کہاں جا کر روس میں بالشویک اور مانشویک کے ہاتھوں انقلاب آیا' اور عین وقت پر فرنٹ پر لینن آ گیا۔ اس انقلاب کے برپا کرنے میں نہ مارکس کا کوئی حصہ ہے نہ اینجلز کا۔ تو فکر دینے والے اور تھے' اور انقلاب برپا کرنے والے اور۔ اسی طرح والٹیئر اور روسو جیسے بے شمار اصحابِ قلم تھے جنہوں نے حریت' آزادی اور جمہوریت کا ایک فکر دیا تھا' لیکن وہ محض ڈیسک ورکر تھے' کتابیں لکھ سکتے تھے' میدان میں آ کر قیادت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا فرانس میں انقلاب برپا کیا اوباش اور بدمعاش لوگوں نے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ فرانس انتہائی خونیں انقلاب تھا۔ اسے کنٹرول کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں اور ہجوم (mo b) جو چاہے کر گزرے۔ اب ذرا contrast دیکھئے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا انقلاب دنیا کا واحد انقلاب ہے کہ ابتدا سے انتہا تک اس کی قیادت ایک ہی ہستی کر رہی ہے۔ ایک وقت میں وہی ہیں جو مکہ میں street preaching کر رہے ہیں' گلی گلی گھوم کر دعوت دے رہے ہیں' تبلیغ کر رہے ہیں۔ کوئی پاگل کہتا ہے' کوئی مجنون کہتا ہے' کوئی کہتا ہے شاعر ہیں۔ آپ ﷺ سب برداشت کر رہے ہیں۔ آپؐ نے کبھی پلٹ کر نہیں کہا پاگل تم ہو۔ لیکن وہی شخص ہے جو میدانِ بدر میں فوج کی کمان کر رہا ہے۔ کوئی ہے تاریخ میں اس کی مثال؟ میں پھر ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے وہی الفاظ دہراؤں گا کہ He is the only, the only, the only person — کہاں گلی گلی دعوت دینے والا ایک شخص' کہاں ایک فوج کی کمان کرنے والا قائد — کوئی

ہے مناسبت؟

اس حوالے سے ایک بڑی اہم بات نوٹ کیجیے کہ ٹائن بی پچھلی صدی کا ایک بہت بڑا فلاسفر آف ہسٹری گزرا ہے۔ اس نے حضورﷺ کے بارے میں ایک بڑا زہر میں بجھا ہوا جملہ کہا ہے:

"Muhammad failed as a prophet, but succeeded as a statesman."

یعنی ''محمد (ﷺ) ایک نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے (نقلِ کفر' کفر نباشد) البتہ ایک سیاست دان کی حیثیت سے کامیاب ہو گئے۔''

ٹائن بی کے اس ایک جملے کی شرح میں انگلینڈ کے پروفیسر ڈاکٹر منٹگمری واٹ نے دو کتابیں لکھ دیں: Muhammad at Mecca اور Muhammad at Madina— ''محمد ایٹ مدینہ'' میں اُس نے بظاہر حضورﷺ کے لیے تعریف کے جو الفاظ ممکن تھے superlative ڈگری میں استعمال کیے' لیکن بباطن اس نے ایک تضاد (contrast) ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مکہ والا محمدؐ تو کچھ اور تھا اور یہ مدینہ والا محمدؐ کچھ اور ہے۔ ان تعریفی الفاظ سے دھوکہ کھا کر ضیاء الحق مرحوم نے اس منٹگمری واٹ کو مرکزی سیرت کانفرنس کے اجلاس میں چیف سپیکر کی حیثیت سے بلالیا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے کس عیاری سے سیرتِ طیبہ میں یہ تضاد دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دو محمد (ﷺ) علیحدہ علیحدہ ہیں' ان کی تصویریں مختلف ہیں۔

دراصل جب یہ لوگ حضورﷺ کی مکہ کی زندگی دیکھتے ہیں تو اگرچہ وہ آپ ﷺ کو نبی یا رسول نہیں مانتے لیکن وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ آپؐ کی زندگی نبیوں سے کچھ مشابہ ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام گھوم پھر کر تبلیغ کرتے تھے' ایسے ہی حضرت محمد ﷺ دکھائی دے رہے ہیں۔ جیسے حضرت عیسیٰؑ کو جو کچھ کہا گیا انہوں نے برداشت کیا' کوئی جواب نہیں دیا' اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت محمد ﷺ نے بھی اختیار کیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ تو کچھ نبیوں والا نقشہ ہے' جس میں آپؐ (معاذ اللہ) فیل ہو گئے۔ یہاں سے تو' بقول ان کے' جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ وہ ہجرت کو flight (فرار) کا نام دیتے ہیں' حالانکہ

flight تو کسی خوف کی بنیاد پر ہوتی ہے‘ جبکہ ہجرت خوف کی وجہ سے نہیں تھی‘ بلکہ یہ ایک حکمت عملی (strategy) تھی اور اس کا مقصد اپنے لیے متبادل Base تلاش کرنا تھا۔ بہرحال ان مستشرقین کو مدینہ میں فروکش ایک بالکل نئے محمد (ﷺ) نظر آ رہے ہیں جو بڑے مدبر سیاستدان ہیں‘ جو ایک ریاست کے حکمران ہیں‘ جو فوج کے کمانڈر ہیں۔ یہاں آ کر آپؐ یہودیوں سے معاہدے کر رہے ہیں۔ یہاں پر ان کے تدبر‘ statesmanship اور موقع شناسی کا کمال ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا تضاد ہے۔

اس کا حوالہ صرف اس لیے دے رہا ہوں کہ حضور ﷺ کی زندگی اس اعتبار سے واقعتاً contrast کی حامل ہے کہ ایک انقلابی دعوت کا آغاز بھی آپؐ نے کیا اور اسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی خود پہنچایا۔ دنیا کے انقلابات میں سے کوئی بھی دوسرا انقلاب ایک حیاتِ انسانی کے عرصے (span) میں پورا نہیں ہوا‘ بلکہ فکر دینے والے مرکھپ گئے‘ بعد میں کہیں وہ فکر پروان چڑھا اور اس کی بنیاد پر کہیں انقلاب آ گیا۔ جبکہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا انقلاب اس اعتبار سے منفرد اور لاثانی ہے کہ ایک انسانی زندگی کے اندر‘ کُل ۲۳ سال کے عرصے میں‘ الف سے ی تک انقلاب کے تمام مراحل طے ہو گئے۔

اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ آج عہدِ حاضر میں اجتماعیات‘ سوشیالوجی یا پولیٹکل سائنس کا کوئی طالب علم پوری دیانت داری سے انقلاب کا صحیح طریق کار اخذ کرنا چاہے تو اسے صرف محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے مکمل راہنمائی مل سکتی ہے۔ مارکس‘ اینجلز‘ لینن یا والٹیئر کی زندگیوں سے اس ضمن میں قطعاً کوئی راہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گویا طریق انقلاب کے لیے اب دنیا کے سامنے صرف ایک ہی منبع و سرچشمہ (source) ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔ چنانچہ میں انقلاب کے طریقِ کار پر جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کے لیے میرا ماخذ (source) صرف سیرتِ محمدیؐ ہے۔ میں اسلامی اصطلاحات دین‘ اسلام‘ ایمان‘ جہاد اور قتال استعمال کیے بغیر جدید اصطلاحات میں انقلاب کے مراحل آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اس

کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دورِ زوال کے دوران ان اصطلاحات کا مفہوم محدود اور مسخ (limited and perverted) ہو گیا ہے اور ہم جب بھی کوئی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کا وہی مسخ شدہ تصور ذہن میں آتا ہے۔ لہٰذا اگر ان اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جدید terminology میں بات کی جائے تو انقلاب کا خاکہ نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کے بعد مناسب ہوگا کہ اس خاکہ میں قرآن وحدیث کی اصطلاحات' سیرت النبی ﷺ اور واقعات کا رنگ بھر دیا جائے۔

انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

ایک مکمل انقلاب کے چھ یا سات مراحل ہیں

(۱) انقلابی نظریہ

ہر انقلاب کی پہلی ضرورت ایک ایسا انقلابی نظریہ اور انقلابی فلسفہ ہوتی ہے جو پہلے سے موجود Politico-Socio-Economic System کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ اور جب تک اس کے اندر ایسی کاٹ موجود نہ ہو کہ یہ موجودہ سیاسی نظام کو کاٹتا ہو' معاشی نظام کو کاٹتا ہو' سماجی نظام کو کاٹتا ہو اس وقت تک وہ انقلابی نظریہ نہیں محض وعظ (sermon) ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ نظریہ اور فلسفہ نیا ہے تو معاملہ آسان ہے۔ وہ اپنی اصطلاحات خود وضع کرے گا اور ان اصطلاحات کے معنی خود معین کرے گا۔ لیکن اگر وہ کوئی پرانا نظریہ ہے تو اب اُس کی جدید تعبیر پیش کرنا ہوگی اور اس کی وضاحت دورِ حاضر کی جدید اصطلاحات کے مطابق وقت کی علمی سطح پر کرنا ہوگی۔ پھر اس نظریے کو پھیلایا جائے' عام کیا جائے اور اس کے لیے دورِ جدید کے تمام میسر ذرائع ابلاغ استعمال کیے جائیں۔ پہلے کبھی صرف گلیوں بازاروں میں گھوم پھر کر لوگوں کو جمع کر کے دعوت دی جا سکتی تھی یا لوگوں کو کھانے پر بلا لیا جاتا اور ان کے سامنے کوئی بات رکھی جاتی۔ لیکن اب جلسے ہو سکتے ہیں' کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا سمیت دورِ جدید کے تمام ذرائع ابلاغ انقلابی نظریے کی تشہیر و اشاعت کے لیے استعمال کیے جانے چاہئیں۔

(۲) تنظیم

دوسرے مرحلے کے طور پر جو لوگ اس نظریئے کو قبول کر لیں انہیں ایک ہیئتِ اجتماعی کے تحت منظم کیا جائے۔ اس ہیئت اجتماعی یا تنظیم کی بھی دو شرطیں ہیں۔ اوّلاً یہ بڑی مضبوط ڈسپلن والی تنظیم ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ جب مقابلہ پیش آئے گا اور آپ موجودہ نظام کو ختم کرنے کے لیے میدان میں آئیں گے تو مراعات یافتہ طبقات جن کے اس نظام سے مفادات وابستہ ہیں' اس نظام کی پاسبانی کی خاطر آپ کو کچلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے ع ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے!'' تب آپ کو ان کے مقابل ایک فوجی ڈسپلن کی ضرورت ہوگی۔ محض ہجوم (mob) مقابلہ نہیں کر سکے گا' بلکہ یہاں ''listen & obey'' کے اصول کے تحت منظم ہونے والی مضبوط جماعت درکار ہوگی جس کے ڈسپلن کا یہ عالم ہو کہ ؎

Their's not to reason why?
Their's but to do and die!

ثانیاً یہ کہ اس تنظیم میں کارکنوں کی حیثیت اور مرتبے کا تعین تحریک کے ساتھ وفاداری اور قربانی کی بنیاد پر ہونا چاہیے' نہ یہ کہ کوئی برہمن ہو تو اونچا ہے اور شودر ہو تو نیچا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ انقلابی تنظیم نہیں۔ انقلابی تنظیم میں تو ہر شخص کی commitment کی گہرائی اور تحریک کے ساتھ اس کی وابستگی اور وفاداری کی بنیاد پر اس کی حیثیت کا تعین ہوگا' یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اس نے کتنی قربانی دی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک شودر کمیونسٹ پارٹی میں اوپر چلا جائے اور برہمن نیچے رہ جائے۔

(۳) تربیت

تیسرا مرحلہ کارکنوں کی تربیت کا ہے۔ اس مرحلے میں انقلابی جماعت کے کارکنوں کے ذہنوں سے انقلابی نظریہ ایک لحظہ کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اسی نظریے پر تو ساری انقلابی جدوجہد کا دارومدار ہے۔ اگر وہ انقلابی نظریہ ذہنوں میں راسخ ہے تو عمل کا جذبہ بھی بیدار رہے گا اور اگر وہ نظریہ مدھم پڑ گیا تو جذبۂ عمل بھی

ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ڈسپلن کا عادی بنایا جائے کہ سنیں اور مانیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے بڑی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر۔

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی!

لیکن تسلیم کی خوڈالنا آسان نہیں ہے۔ اس میں اپنی انا آڑے آجاتی ہے' بلکہ انا سے بڑھ کر انانیت راستے کا پتھر بن جاتی ہے۔ انقلابی تربیت کا تیسرا ہدف یہ ہے کہ تحریک کے کارکنوں میں اپنا تن' من' دھن سب قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا۔ بقول اقبال۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

یہ تین تو انقلابی تربیت کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان کے علاوہ چوتھا جزو یہ ہو گا کہ آپ انقلاب کے ذریعے سے جو نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اس میں اگر کوئی روحانیت کا پہلو بھی مطلوب ہے تو کارکنوں کی روحانی تربیت بھی کرنا پڑے گی۔ کارکنوں کی روحانی تربیت کے بغیر انقلاب کے اندر روحانیت کہاں سے آجائے گی؟

(۴) صبرِ محض (Passive Resistance)

یہ مرحلہ کہنے کو تو نمبر ۲ ہے لیکن حقیقت میں اس کا آغاز پہلے مرحلے کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ صبرِ محض (Passive Resistance) کا مطلب یہ ہے کہ انقلابی تحریک کے کارکن اپنے موقف پر ڈٹے رہیں' پیچھے نہ ہٹیں' لیکن تشدد و تعذیب کے جواب میں کسی قسم کی جوابی کارروائی نہ کریں۔ اس کی وجہ بہت منطقی (logical) ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ معاشرے کے اندر تصادم (conflict) پیدا کرنے والے یہی انقلابی لوگ ہوتے ہیں۔ ورنہ لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ امراء بھی تھے اور غرباء بھی۔ غرباء اپنی قسمت پر راضی تھے' امراء اپنے ہاں عیش کر رہے تھے۔ غلام بیچارہ اپنا کام کر رہا ہے' اس کو پتا ہے میری قسمت یہی ہے' مجھے خدا نے غلام بنا دیا۔ اسی لیے مارکس نے کہا تھا کہ

مذہب عوام کا افیون ہے' لہٰذا عوام اپنے حال پر صابر و شاکر رہتے ہیں اور انقلاب کے لیے نہیں اٹھتے۔ وہ نظام کے خلاف بغاوت نہیں کرتے۔ چنانچہ جیسے ایک پُرسکون تالاب جس میں کوئی لہریں نہ ہوں' اس میں آپ نے پتھر مار کر ارتعاش پیدا کر دیا ہو اسی طرح انقلابی لوگ پہلے سے قائم نظام کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں کہ یہ نظام غلط ہے' یہ ایک استحصالی (exploitative) اور استبدادی (repressive) نظام ہے۔ یہ انسانوں کے اندر امتیازات (discrimination) قائم کر رہا ہے۔ تو کس نے پتھر مارا؟ داعیانِ انقلاب نے! اب پتھر پانی میں جائے گا تو کچھ لہریں تو اٹھیں گی۔ تو معاشرے میں جو لہریں اٹھتی ہیں وہ انقلابی دعوت کا ایک فطری ردِّعمل ہیں۔ البتہ اس ردِّعمل کے بھی مختلف درجات اور stages ہوتی ہیں۔

ان میں دو stages بڑی اہم ہیں۔ پہلی stage میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو شخص داعیٔ انقلاب بن کر سامنے آیا ہے اس کی کردار کشی کی جائے' کسی نہ کسی طرح اس کی شخصیت کو مجروح کیا جائے' اس کی ہمت کو توڑ دیا جائے اور اس کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا تشدد اور تعذیب (persecution) کا واحد نشانہ داعی کی ذات بنتی ہے۔ اور یہ ایذا رسانی اوّلاً زبانی ہوتی ہے کہ یہ پاگل ہے' اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے' ہمارا نظام ٹھیک ٹھاک صدیوں سے چلا آ رہا ہے' ہمارے آباء واَجداد سے چلا آ رہا ہے' یہ اسے غلط کہتا ہے۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا شاید آسیب کا سایہ ہو گیا ہے' اس پر کوئی جن آ گیا ہے۔ اگر اس انداز سے داعی کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیا جائے تو اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔ اب کسی اور کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ درخت کی جڑ کٹ جائے تو سارا درخت خود بخود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ داعی کھڑا رہ گیا' اپنی کردار کشی کی کوششوں کو برداشت کر گیا' جواباً اُس نے یہ نہیں کہا کہ تم پاگل ہو' میں نہیں ہوں' تمہارا دماغ خراب ہے میرا نہیں ہے' اور مخالفین نے دیکھا کہ یہ دعوت تو آگے بڑھ رہی ہے اور لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں تو پھر زبانی ایذا رسانی سے آگے بڑھ کر جسمانی تشدد و تعذیب کی stage کا آغاز ہو جاتا ہے اور اب اس کا نشانہ صرف داعی کی ذات

نہیں بلکہ انقلابی تحریک کے تمام کارکن بالخصوص کمزور عوام اور اونچے گھرانوں کے نوجوان بنتے ہیں۔ اب انہیں مارا جاتا ہے' بھوکا رکھا جاتا ہے' گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے' انہیں قتل کیا جاتا ہے' فائرنگ سکواڈز کے سامنے کھڑے کر کے ان کو سینکڑوں کی تعداد میں گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔

اب یہاں ''صبرِ محض'' کی ضرورت ہے کہ اس سارے تشدد کو کسی جوابی کارروائی کے بغیر برداشت کیا جائے۔ اس لیے کہ شروع میں انقلابی تحریک کے کارکن تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ اگر وہ بھی مشتعل (violent) ہو جائیں تو اس سسٹم کو حق حاصل ہو گا کہ انہیں کچل کر ختم کر دیا جائے۔ لیکن اگر وہ کچھ نہیں کر رہے' کوئی جوابی کارروائی نہیں کر رہے تو انہیں تشدد و تعذیب کا نشانہ تو بنایا جائے گا لیکن انہیں کچلا نہیں جا سکے گا۔ اس طرح انہیں مہلتِ عمل حاصل ہو جائے گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی دعوت پہنچا سکیں اور اپنا تنظیمی Base زیادہ سے زیادہ وسیع کر سکیں۔ یہ موجودہ سسٹم سے اسی صورت میں براہ راست ٹکر لے سکیں گے اگر ان کے پاس طاقت ہو گی۔ اور طاقت حاصل کرنے کے لیے ابھی انہیں وقت چاہیے' جسے میں ''to buy time'' کہتا ہوں۔ لہٰذا ابھی انہیں اپنے تحفظ میں بھی ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس کا نہایت اہم نتیجہ یہ نکلے گا کہ انقلابی کارکنوں کو عوام الناس کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں گی۔ دیکھئے معاشرے میں جہاں چوہدری' سردار' سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں وہاں عوام بھی ہیں۔ چوہدری' سردار' تعلقہ دار' جاگیردار اور سرمایہ دار تو یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ ہمارے خلاف انقلاب کی جدوجہد ہو رہی ہے' جبکہ عوام تو یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے' لیکن ان میں انقلابیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہوتی' وہ ان کی حمایت میں بول بھی نہیں سکتے۔ اسی کو ہم خاموش اکثریت (silent majority) کہتے ہیں۔ عوام کی اکثریت خاموش ہوتی ہے' لیکن وہ اندھے بہرے تو نہیں ہوتے۔ وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے' انہیں کیوں مارا جا رہا ہے' کیوں قتل کیا جا رہا ہے' کیوں ان کے گھر بارود سے اڑائے جا رہے ہیں' کیوں ان کے پورے پورے خاندان کو لہوؤں میں

پلوائے جا رہے ہیں —— وہ سوچتے ہیں کہ ان کا آخر جرم کیا ہے؟ انہوں نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں کیا —— یہ تو محض ایک نظریے پر یقین رکھتے ہیں اور معاشرے سے ظلم و ناانصافی اور استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ عوام محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان پر واقعی ظلم ہو رہا ہے۔ چنانچہ اندر ہی اندر عوام کی ہمدردیاں ان انقلابیوں کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ گویا ع ''جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ!''

(۵) راست اقدام (Active Resistance)

انقلابی جِدّو جُہد کا پانچواں مرحلہ اقدام کا ہوگا۔ یہ انتہائی نازک فیصلے کا وقت ہے اور قیادت کی ذہانت کا امتحان ہے۔ اس مرحلے کے لیے مناسب وقت کا تعین بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کی تیاری نہیں ہے اور آپ نے اقدام کر دیا تو آپ ختم ہو جائیں گے۔ دوسری طرف اگر تیاری پوری ہونے کے باوجود اقدام میں تاخیر کر دی تو آپ نے موقع کھو دیا۔ You have missed the bus —— گویا اگر آپ نے موقع گنوا دیا تب بھی آپ ناکام ٹھہریں گے اور اگر آپ نے قبل از وقت اقدام کر دیا' تب بھی ناکام قرار پائیں گے۔ اقدام کا فیصلہ اس وقت کیا جانا چاہیے جب یہ محسوس ہو کہ ایک تو ہماری تعداد کافی ہے۔ ''کافی'' کا مطلب مختلف حالات میں مختلف ہوگا۔ ایک چھوٹے سے ملک میں جس کی ایک کروڑ کی آبادی ہے' شاید پچاس ہزار آدمی بھی ایسے تیار ہو جائیں تو کافی ہو جائیں گے' جبکہ پندرہ کروڑ کی آبادی کے ملک میں تین چار لاکھ تربیت یافتہ افراد درکار ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ اب ان کے اندر ڈسپلن کی پوری پابندی ہو' یہ ''سنو اور اطاعت کرو!'' (listen & obey) کے اصول کے خوگر ہو گئے ہوں کہ انہیں حکم دیا جائے گا تو حرکت کریں گے اور جب رُکنے کا کہا جائے گا تو رُک جائیں گے۔ ایسے انقلابی نہ ہوں کہ اوّل تو چلتے ہی نہیں اور اگر چل پڑیں تو رُکتے ہی نہیں۔ مالاکنڈ میں صوفی محمد صاحب کی جو تحریک نفاذِ شریعت چلی تھی اس میں قائد نے حکم ہی نہیں دیا تھا اور گولیاں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ پھر ان کے کارکنوں نے پہاڑوں پر جا کر مورچے بنا لیے تھے۔ ان کے قائد نے انہیں نیچے اترنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا: مولوی بک گیا۔ تو یہ

منظم جماعت نہیں تھی' اس میں ڈسپلن نہیں تھا' بلکہ یہ ایک ہجوم (mob) تھا جو ایک جذباتی اپیل کے تحت آگے آ گیا تھا۔ اس ضمن میں تیسری شرط یہ ہے کہ انقلابی کارکن اپنے مشن کی خاطر اپنے جان و مال سمیت ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب یہ تین شرطیں پوری ہوں تو یہ تحریک صبر محض (Passive Resistance) سے راست اقدام (Active Resistance) کے مرحلے میں منتقل ہو سکتی ہے۔

اب یہ سمجھ لیجیے کہ راست اقدام (Active Resistance) کا مطلب کیا ہے۔ اس کے لیے بھی میں باہر سے مثالیں دوں گا' ابھی میں حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے کوئی مثال نہیں دے رہا۔ اس لیے کہ پہلے آپ جدید اصطلاحات کے حوالے سے ایک خاکہ اپنے ذہن میں جما لیں' پھر ہم اس میں سیرتِ نبویؐ سے رنگ بھریں گے۔ لیکن واضح رہے کہ میرا دعویٰ یہ ہے کہ طریق انقلاب کے علم و ادراک کے لیے میرے نزدیک محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ Active Resistance یہ ہے کہ آپ نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑیں' اگرچہ آپ نے براہِ راست ابھی کوئی چیلنج نہیں کیا' کوئی الٹی میٹم نہیں دیا۔ مثال کے طور پر گاندھی نے انگریز حکمرانوں کے خلاف سب سے پہلے "عدم تشدد' عدم تعاون" کا نعرہ بلند کیا تھا۔ یعنی ہم تشدد نہیں کریں گے' مار دھاڑ نہیں کریں گے' لیکن ہم انگلینڈ کی ملوں کا بنا ہوا کپڑا استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم تو اپنا چرخہ چلائیں گے' اس پر سوت کاتیں گے اور اس سے کھدر بُنیں گے اور وہ پہنیں گے۔ چرخے کو انہوں نے اپنا قومی نشان قرار دے دیا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ بیسویں صدی میں ایک قوم اور اس کی ایک جماعت چرخے کو اپنا قومی نشان قرار دے رہی ہے۔ اب بتایئے کیا کوئی قانون ہو سکتا ہے کہ تم ضرور ولایتی کپڑا پہنو؟ اور کیا انہوں نے کسی اور کو کوئی نقصان پہنچایا؟ کسی کی جان اور مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا' لیکن حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس لیے کہ مانچسٹر کی ملیں بند ہونے لگیں۔ انڈیا برطانوی کپڑے کی بہت بڑی مارکیٹ تھا اور یہاں انگلینڈ سے آنے والے لٹھے' گرم کپڑے اور ململ کی بہت زیادہ کھپت تھی۔ لیکن اب یہاں صرف "کھادی" چل رہی تھی۔ یہ انگریز کے

خلاف Active Resistance کا پہلا قدم تھا۔ اس سے انگریزوں کو پتا چل گیا کہ اب کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اس تحریک کا دوسرا قدم عدم تشدد پر مبنی سول نافرمانی کی تحریک تھا کہ ہم کوئی تشدد نہیں کریں گے‘ کوئی توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ نہیں کریں گے‘ لیکن قانون توڑیں گے۔ اور قانون شکنی کا انداز ملاحظہ ہو کہ پرماتما کا سمندر ہے‘ پرماتما نے اس میں نمک پیدا کیا ہے‘ ہم پرماتما کے سمندر سے نمک نکالنے جا رہے ہیں۔ ہم نے تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے برطانوی حکومت کی ٹیکس پالیسی کو چیلنج کر دیا۔ اس لیے کہ نمک پر ایکسائز ڈیوٹی عائد تھی۔ چنانچہ اب لاٹھیاں پڑیں‘ بڑے بڑے لیڈروں کے سر پھٹے اور بڑے پیمانے پر جیلیں بھری گئیں۔ اگرچہ تحریک آزادی کے کارکنوں نے کوئی تشدد نہیں کیا!

(۶) مسلّح تصادم (Armed Conflict)

اقدام کے بعد چھٹا اور آخری مرحلہ براہِ راست تصادم کا ہوگا۔ یعنی موجودہ نظام اور اس کے محافظوں کے ساتھ انقلابی کارکنوں کا باقاعدہ جسمانی تصادم ہوگا۔ کیونکہ جب آپ نے Active Resistance شروع کر دی ہے تو گویا آپ نے پورے سسٹم کو براہِ راست چیلنج کر دیا ہے‘ لہٰذا اب موجودہ استحصالی نظام انقلابی تحریک کے کارکنوں کو مکمل طور پر کچلنے کے لیے اقدام کرے گا۔ اس مرحلے پر انقلابی تحریک کا امتحان ہوگا۔ اگر تحریک نے انقلاب کے لیے تیاری ٹھیک طور سے کی تھی‘ کارکنوں کی تنظیم و تربیت درست نہج پر کی گئی تھی‘ صحیح وقت پر اقدام کا فیصلہ کیا تھا تو یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی۔ اور اگر تیاری کے بغیر ہی اقدام کر دیا‘ ابھی نہ تو انقلابی کارکنوں کی معتدبہ تعداد موجود تھی‘ نہ ابھی ان کی تربیت تھی‘ نہ وہ listen and obey کے خوگر تھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ گویا تصادم کے اس مرحلے کے بعد تو تخت یا تختہ والی بات ہوگی‘ کوئی درمیانی بات نہیں ہوگی۔ اس تصادم کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں‘ وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

طریق انقلاب کے ضمن میں مَیں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس کو اگر آپ شعری انداز میں سمجھنا چاہیں تو علامہ اقبال کے ایک فارسی شعر کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد' گفتند کہ برہم زن!

اس شعر میں اقبال اللہ تعالیٰ سے اپنا ایک مکالمہ بیان کر رہا ہے۔ اللہ نے مجھ سے کہا: اے اقبال! میں نے تمہیں اپنی جس دنیا میں بھیجا ہے آیا وہ تمہارے ساتھ سازگار ہے؟ کیا تمہیں وہ پسند ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں' مجھے پسند نہیں! یہاں ظلم ہے' یہاں غریب پس رہا ہے۔ یہاں مزدور کے رگوں کے خون کی سرخی سے شراب کشید کر کے سرمایہ دار پیتا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں میں دوڑنے والے خون سے سرخ شراب کشید کی ہے اور جاگیرداروں کے ظلم وستم سے دہقان کی کھیتی خراب ہے۔ اس کے بچے بھوکے ہیں اور اس کی کھیتی سے ان کی غذا کا اہتمام نہیں ہو رہا۔ یہ اقبال کی بڑی عظیم نظم ہے جس میں اس نے انقلاب کا نعرہ لگایا ہے۔ تو اقبال کہتے ہیں کہ جب میں نے کہا کہ مجھے تیرا یہ جہان پسند نہیں' یہ میرے لیے سازگار نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "برہم زن!" یعنی اسے توڑ پھوڑ دو' درہم برہم کر دو! یہاں انقلاب برپا کر دو!!

اب اس انقلاب کا طریق کار کیا ہو؟ اسے اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں چار مراحل اور دوسرے میں دو مراحل بیان کیے ہیں۔

با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلے درویشی کی روش اختیار کرو اور اپنا کام کرتے رہو۔ دعوت و تبلیغ میں لگے رہو۔ کوئی پاگل کہے یا کوئی گالی دے تو اُسے جواب میں دعا دو۔ یہ درویشی ہے۔ گویا بدھ مت کے

بھکشو بنے ہوئے ہیں۔ مارا جا رہا ہے تو جواب نہیں دے رہے ہیں۔ اور جب تیار ہو جاؤ یعنی تعداد بھی کافی ہو، ٹریننگ بھی صحیح ہو چکی ہو، ڈسپلن کے بھی پابند ہو جائیں اور ہر شے قربان کرنے کو تیار ہوں تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم کے ساتھ ٹکرا دو۔ اس ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ وعظ سے انقلاب نہیں آیا کرتا۔ ٹکراؤ میں جانیں جائیں گی، خون دینا پڑے گا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے انقلاب نہیں آتا۔ یہ چھ مراحل جو میں نے گنوائے، یہ کسی ملک کے اندر انقلاب کی تکمیل کے مراحل ہیں۔

(۷) تصدیرِ انقلاب

مذکورہ بالا چھ مراحل کے علاوہ انقلاب کا ایک ساتواں مرحلہ بھی ہے اور یہ ایک حقیقی انقلاب کا litmus test ہے۔ ایک حقیقی انقلاب کبھی بھی اپنی جغرافیائی یا قومی و ملکی اور حکومتی سرحدوں کے اندر محدود نہیں رہتا۔ کیونکہ اگر انقلابی نظریہ زوردار، قوی، مضبوط، مدلل اور مبرہن ہے تو یہ لوگوں کے قلوب واذہان کو اپنی گرفت میں لے گا۔ چنانچہ حقیقی انقلاب لازماً برآمد (export) ہوتا ہے، وہ اپنی حدود میں نہیں رہ سکتا۔

یہ ہے انقلابی عمل کا وہ خاکہ جسے میں نے سیرتِ نبویؐ سے اخذ کیا ہے، لیکن دینی اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عمومی انداز میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب ہم اس خاکے میں سیرتِ نبویؐ اور انقلابِ نبویؐ کا رنگ بھرتے ہیں۔

رسولِ انقلاب ﷺ کا انقلابی نظریہ اور اس کے تقاضے

محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا انقلابی نظریہ کیا ہے؟ ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ ہے ''توحید'' جس کے بارے میں اقبال کہتا ہے۔

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے، فقط اک مسئلہ علمِ کلام!

جو کبھی انقلابی نظریہ تھا وہ آج ایک مذہبی بحث ونزاع کا موضوع بن کر رہ گیا ہے۔ اب اس نظریہ کے جو انقلابی نتائج ومضمرات ہیں ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیں۔

۱) انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت

میں نے عرض کیا تھا کہ انقلابی نظریہ کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ موجود الوقت نظام کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ نظریۂ توحید کے مضمنات میں سب سے پہلی بات اللہ کی حاکمیت ہے۔ اللہ کی زمین پر نہ کوئی انسان حاکم ہے اور نہ کوئی قوم حاکم ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

نظریۂ توحید انسانی حاکمیت کی ہر شکل میں نفی کرتا ہے۔ انسانی حاکمیت نہ تو فردِ واحد کی بادشاہت کی شکل میں قابلِ قبول ہے نہ کسی قوم کی دوسری قوم پر حاکمیت کی شکل میں' جیسے انگریز ہم پر حکمران ہو گیا تھا۔ اور نہ ہی عوام کی حاکمیت جائز ہے۔ حاکمیت (sovereignty) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور انسان کے لیے خلافت ہے۔ حاکمیت کی دوسری تمام صورتیں شرک ہیں اور دورِ حاضر میں حاکمیتِ جمہور (popular sovereignty) کا تصور بدترین شرک ہے۔ شارع (قانون ساز) صرف اللہ تعالیٰ ہے اور رسولؐ اس کے نمائندے ہیں۔ اب بتائیے اس سے بڑا کوئی انقلابی نعرہ ہوگا؟

۲) ملکیت کی بجائے امانت

توحید کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ انقلابی نعرہ سیاسی نظام کی جڑوں پر تیشے کی طرح گرتا ہے۔ کوئی شخص کسی شے کا مالک نہیں ہے' نہ انفرادی طور پر نہ قومی طور پر۔ اس طرح سرمایہ داری کی بھی نفی ہوگئی اور کمیونزم کی بھی۔ مالک صرف وہ ہے: ﴿لَـهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ ''اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ ہر شے کا مالک وہی ہے اور انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ امانت ہے۔

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست!

میں اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہوں‘ میرا یہ جسم بھی اللہ کی ملکیت ہے‘ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ہاتھ پاؤں‘ یہ آنکھیں‘ یہ دماغ سب کچھ میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اُس نے مجھے کوئی گھر دے دیا ہے تو وہ بھی اُس کی امانت ہے‘ اولاد دی ہے تو وہ بھی اُسی کی امانت ہے۔ چنانچہ ملکیتِ تامہ اُسی کے لیے ہے۔ ہم مالک ومختار نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا کہ ”اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اور یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟“ سرمایہ دار کا موقف یہ ہوتا ہے کہ یہ میرا مال ہے‘ میں اسے جیسے چاہوں تصرف میں لاؤں‘ خواہ اس سے سودی کاروبار کروں یا کسی کو سود پر قرضہ دوں۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو سرمائے کا مالک سمجھتا ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو امین سمجھیں گے تو آپ کا نقطۂ نظر یکسر مختلف ہوگا۔ پھر آپ اپنا ہاتھ بھی وہیں استعمال کریں گے جہاں اللہ کی اجازت ہے۔ آپ اپنے پاؤں سے بھی اسی راستے پر چلنا چاہیں گے جس پر اللہ چاہتا ہے کہ آپ چلیں۔ آپ کا مال وہیں خرچ ہوگا جہاں اللہ چاہتا ہے کہ آپ خرچ کریں۔

۳) کامل معاشرتی مساوات

سماجی سطح پر توحید کا تقاضا یہ ہے کہ بنیادی طور پر‘ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں‘ کوئی اونچا نہیں‘ کوئی نیچا نہیں۔ اس ضمن میں ایچ جی ویلز کی گواہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ ”انسانی اخوت‘ مساوات اور حریت کے وعظ تو پہلے بھی بہت کہے گئے‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان بنیادوں پر ایک معاشرہ قائم کیا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے“۔ اسلامی معاشرے میں اگر کوئی اونچ نیچ ہے تو وہ ان کمالات کی بنیاد پر ہے جو آپ نے از خود حاصل کیے ہیں۔ آپ نے علم حاصل کیا تو آپ اونچے ہو گئے‘ آپ کی عزت کی جائے گی۔ آپ نے تقویٰ کی روش اختیار کی‘ روحانی مقام حاصل کیا‘ اب آپ کی عزت کی جائے گی۔ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳) ”اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہو“۔ پیدائشی طور پر تمام

انسان برابر ہیں۔ شودر ہو یا برہمن ' کالا ہو یا گورا ' مرد ہو یا عورت ' کوئی فرق نہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان فرق انتظامی اعتبار سے ہے۔ جیسے کسی محکمے میں ایک انچارج اور ایک باہر کھڑے ہوئے قاصد میں بحیثیت انسان بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ' لیکن منصب کے اعتبار سے سربراہ شعبہ کا منصب اونچا ہے ' قاصد کا نیچا ہے۔ یہ انتظامی معاملہ ہے۔

ہمارے ہاں پٹھانوں میں بالعموم یہ مساوات نظر آتی ہے کہ سب ایک سا لباس پہنتے ہیں۔ بڑے سے بڑا زمیندار ہو یا اس کا ملازم ہو ' دونوں کا لباس ایک ہی طرح کا ہوگا ' اور یہ کہ کھانا بھی دونوں ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ عربوں کے ہاں بھی یہ مساوات قائم ہے اور لنچ ٹائم پر ایک منسٹر کا بوّاب (دربان) اور سوّاق (ڈرائیور) اس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ مرد اور عورت میں بھی بحیثیت انسان کوئی فرق نہیں ' صرف انتظامی اعتبار سے فرق ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (النساء: ٣٤) ''مرد عورتوں پر قوام ہیں''۔ یعنی مرد کو خاندان کے ادارے کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہے ' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد افضل ہے اور عورت کمتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے اخلاق اور کردار کے اعتبار سے کروڑوں مَردوں سے اوپر چلی جائے۔ کتنے مرد ہوں گے جو حضرت مریم ' حضرت آسیہ ' حضرت خدیجہ ' حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہن اجمعین) کے مقام کو اس طرح دیکھیں گے جیسے آپ آسمان کو دیکھتے ہیں۔ تو نظریۂ توحید کے یہ تین نتیجے ہیں جو سیاسی سطح پر ' معاشی سطح پر اور سماجی سطح پر نکلتے ہیں: حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے لیے ' ملکیتِ مطلقہ اللہ کے لیے اور کامل مساواتِ انسانی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس نظریۂ توحید کی تبلیغ مکہ کی گلیوں میں گھوم پھر کر کی۔ آپؐ نے لوگوں کو پکارا: یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا ''اے لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ' تم کامیاب ہو جاؤ گے''۔ ابتدائی دعوت میں ابھی آپؐ نے اپنی رسالت کا ذکر شامل نہیں کیا ' پورے کا پورا زور (emphasis) توحید پر ہی رکھا۔ اس انقلابی نظریے کی دعوت و اشاعت میں آپؐ نے اُس وقت کے جو بھی ذرائع میسر تھے '

انہیں استعمال کیا۔ آپؐ نے گھر گھر جا کر دعوتِ توحید پیش کی۔ پھر دو مرتبہ اپنے خاندان والوں (بنو ہاشم) کو کھانے پر بلا کر دعوت پیش کی۔ ایک مرتبہ تو لوگوں نے بات سنی ہی نہیں' شور مچا دیا۔ دوسری مرتبہ بات سن لی لیکن سب کے سب خاموش بیٹھے رہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ حاضرین میں سے صرف حضرت علی ؓ کھڑے ہوئے جو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ انہوں نے کہا: اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں' اگرچہ میں سب سے چھوٹا ہوں' اگرچہ میری آنکھیں بھی دکھتی ہیں' لیکن میں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔ اور اس پر سارا مجمع کھل کھلا کر ہنس پڑا کہ یہ چلے ہیں انقلاب لانے کے لیے اور یہ ان کے ساتھی ہیں۔ پھر آپ ﷺ کو حکم ہوا: ﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝۹۴﴾ (الحجر) "(اے نبی ﷺ!) جس چیز کا آپ کو حکم ہوا ہے اسے ڈنکے کی چوٹ بیان کیجیے اور مشرکین کی ذرا پروانہ کیجیے"۔ چنانچہ آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر واصباحا کا نعرہ لگایا۔ پھر عُکاظ اور دوسرے میلوں میں جا کر دعوت دی۔ حج کے اجتماعات میں لوگوں کے سامنے دعوت رکھی۔ الغرض جو طریقہ بھی ممکن تھا اسے استعمال کیا۔ اُس وقت نہ تو لاؤڈ سپیکر تھا نہ کوئی ٹیلی ویژن تھا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا بھی نہیں تھے۔ نہ کوئی چھاپہ خانہ تھا' نہ کتابیں نہ رسالے نہ اخبار! لیکن جو بھی میسر ذرائع اور وسائل تھے انہیں آپؐ نے استعمال کیا۔

اسلامی انقلابی تنظیم اور اس کی اساسات

جو لوگ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے' انہیں آپؐ نے منظم کیا اور ان کی تربیت کی۔ اس تنظیم کی سب سے پہلی بنیاد یہ تھی کہ جن لوگوں نے مان لیا کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں' آپ ﷺ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کہہ رہے ہیں' یہ آپؐ پر وحی آئی ہے تو پھر ان کے لیے آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی کیسے ممکن ہے؟ کیا نبی کی بات سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے؟ اس سے زیادہ مضبوط جماعت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جو نبوت کی بنیاد پر قائم ہو۔ آج کی دنیا میں بھی آپ کو مثال ملے گی کہ سچی نبوت تو تنظیم کی بہت بڑی بنیاد ہے ہی' جھوٹی نبوت بھی بہت بڑی بنیاد ثابت ہوئی ہے۔ غلام

احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کی بنیاد پر جو جماعت چل رہی ہے ذرا اس کا اندازہ کیجیے کہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اور ان کا لاہوری فرقہ' جس نے غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانا' وہ منتشر ہو کر ختم ہو گیا۔ تو مضبوط ترین جماعت جو دنیا میں ہو سکتی ہے وہ نبوت کے دعویٰ کی بنیاد پر ممکن ہے۔ چنانچہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سچی نبوت اور آخری نبوت کی بنیاد پر جو جماعت بنی وہ دنیا کی مضبوط ترین جماعت تھی' جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ ''اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں''۔ اس جماعت میں کسی نے رسول اللہ ﷺ کو جماعت کا صدر منتخب نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نبی ہونے کی حیثیت سے اور داعی ہونے کی حیثیت سے خود بخود امیر تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھی ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور مانا) کے اصول پر کاربند تھے۔ البتہ حضور ﷺ نے مستقبل کے لیے ایک مثال قائم کرنے کے لیے کہ آئندہ اگر اسی انقلابی جدوجہد کا مسلمانوں نے آغاز کیا تو اس کے لیے جماعت کیسے بنے گی' بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ملاحظہ کیجیے جو بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے اور سند کے اعتبار سے اس سے زیادہ صحیح حدیث ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ''ہم نے بیعت کی اللہ کے رسول ﷺ سے'' عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ''اس بات پر کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے'' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ ''تنگی اور سختی میں بھی اور آسانی میں بھی'' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَهِ ''طبیعت کی آمادگی کی صورت میں بھی اور طبیعت پر جبر کرنا پڑا تب بھی''۔ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا ''اور چاہے آپؐ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں''۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ آپؐ نے ایک نووارد نوجوان کو ہم پر امیر کیوں بنا دیا؟ ہم آپؐ کے پرانے خدمت گار اور جان نثار ساتھی ہیں' ہم پر اس نوجوان کو کیوں امیر بنا دیا؟ آپؐ کا اختیار ہو گا جو چاہیں کریں۔ وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ''اور جس کو بھی آپؐ امیر بنا دیں گے اس سے جھگڑیں گے نہیں''۔ وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ

لَآئِمٍ ’’اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں‘ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے‘‘۔ ہماری جو رائے ہوگی‘ ہمارے نزدیک جو بات حق ہوگی وہ ضرور کہہ دیں گے۔ اس لیے زبانیں بند نہیں کریں گے کہ لوگ کہیں گے کہ لو جی انہوں نے کیا کہہ دیا۔ یہ ہے آرگنائزیشن کی دوسری بنیاد۔ آپ بھی تجزیہ کر لیجیے کہ کیا حضور ﷺ کو اس کی ضرورت تھی؟ کیا آپ پر ایمان لانا ہی کافی نہیں تھا کہ آپ کی ہر بات ماننی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء: ٦٤) ’’ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے‘‘۔ اس کے باوجود آنحضور ﷺ نے بیعت لی تو یہ دراصل آئندہ کے لیے رہنمائی کے لیے تھی!

غزوۂ بدر سے پہلے حضور ﷺ نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی تھی کہ قریش کا ایک قافلہ شمال سے مالِ تجارت سے لدا پھندا آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف چالیس یا پچاس محافظ ہیں‘ جبکہ کیل کانٹے سے لیس ایک مسلح لشکر جنوب سے آ رہا ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح عطا فرما دے گا۔ بتاؤ‘ کدھر چلیں؟ کچھ ہم جیسے کمزور لوگ بھی موجود تھے‘ انہوں نے کہا کہ حضور! قافلے کی طرف چلیں‘ تھوڑے سے آدمی ہیں‘ ان پر ہم آسانی سے قابو پا لیں گے‘ مالِ غنیمت بہت ہاتھ آ جائے گا‘ اور ہتھیار بھی ملیں گے‘ جن کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ لیکن حضور ﷺ مزید مشورہ طلب فرماتے رہے۔ تب صحابہ کرام ؓ نے اندازہ کیا کہ حضور ﷺ کا اپنا رجحانِ طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر پہلے مہاجرین نے تقریریں کیں کہ حضورؐ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں‘ جو آپؐ کا حکم ہو ہم حاضر ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ نے تقریریں کیں‘ لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حضور ﷺ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ مہاجرین میں سے ہی حضرت مقداد بن اسود ؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ’’حضورؐ! جو آپ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے‘ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجیے جنہوں نے اپنے

نبیؑ سے یہ کہہ دیا تھا کہ ''اے موسیٰؑ آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جا کر جنگ کریں' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے' لیکن حضور ﷺ اب بھی انتظار کی کیفیت میں تھے۔

اب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں طے یہ ہوا تھا کہ اگر قریش آپ ﷺ کا پیچھا کرتے ہوئے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تو ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ لیکن صورتِ واقعہ یہ تھی کہ قریش نے مدینہ پر حملہ نہیں کیا تھا اور حضور ﷺ خود باہر نکل کر تصادم کا آغاز کر چکے تھے' لہٰذا انصار اس معاہدے کی رو سے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے پابند نہیں تھے۔ حضرت سعدؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! معلوم ہوتا ہے آپؐ کا روئے سخن ہماری جانب ہے۔ اب دیکھئے کس قدر عمدہ جملہ کہا: فَاِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ یعنی حضور! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ ہم نے آپؐ کو اللہ کا نبی اور رسول مانا ہے۔ اب ہمارا اختیار کہاں رہا؟ آپؐ جو بھی حکم دیں گے' سر آنکھوں پر! آپؐ ہمیں جہاں بھی لے جانا ہو لے چلیے۔ خدا کی قسم' اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم ڈال دیں گے......!

تو حضور ﷺ کو کسی کی بیعت کی ضرورت نہیں تھی' آپ ﷺ تو اللہ کے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے مطاع تھے —— لیکن اس کے باوجود آپؐ نے بیعت کیوں لی؟ اس لیے کہ آئندہ کوئی مسلمان جماعت بنانے کے لیے انگریزوں سے' روسیوں سے یا جرمنوں سے کوئی طریقہ مستعار نہ لیتا پھرے' بلکہ جماعت بنانے کے لیے وہ بنیاد اختیار کرے جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

انقلابی تربیت کا نبویؐ منہاج

تربیت کے لیے میں نے چار عنوانات مقرر کیے تھے۔ اوّلاً یہ کہ انقلابی فکر متحضر رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے انقلابی فکر کا منبع و سرچشمہ قرآن تھا اور اس منہج پر اب جو بھی دعوت اٹھے گی اس کا منبع و سرچشمہ بھی یہی قرآن ہو گا کہ اسے پڑھتے رہو تاکہ تمہارا فکر تازہ رہے۔ اس کے لیے اجتماعی مذاکرہ بھی کرو۔ مل کر بیٹھو اور قرآن پڑھو' سیکھو اور سکھاؤ۔ اسی سے تمہارا فکر تروتازہ رہے گا۔

ثانیاً سمع و طاعت —— جس کا سب سے بڑا امتحان یہی تھا کہ چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں تم نے ہاتھ نہیں اٹھانا۔ دیکھئے ایک شخص کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ مجھے مار دیں گے تو وہ ناامید (desperate) ہو کر (تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق) دو چار کو مار کر ہی مرے گا۔ بلی کو اگر آپ کارنر (corner) کر لیں اور اسے اندازہ ہو جائے کہ اب میرے لیے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو وہ سیدھی آپ کی آنکھوں پر جھپٹے گی۔ لیکن یہاں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ حضرت خباب بن ارتؓ کے سامنے دہکتے ہوئے انگارے بچھائے گئے' اور ان سے کہا گیا کہ کرتا اُتار کر ان پر لیٹ جاؤ۔ آپؓ لیٹ گئے۔ پیٹھ کی کھال جلی' چربی پگھلی تو اس سے وہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ جسے یہ نظر آ رہا ہو کہ یہ مجھے انگاروں پر بھوننے والے ہیں' زندہ کے کباب بنانے والے ہیں' وہ دو چار کو مار کر ہی مرتا ہے' یا کم از کم اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی کوشش کرتا ہے' لیکن یہاں اس کی اجازت نہیں تھی۔ میرے نزدیک سمع و طاعت کا اس سے بڑا کوئی مظہر ممکن ہی نہیں۔

ثالثاً —— اپنی جان' مال' تن' من' دھن' اولاد' غرض ہر شے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ ویسے تو دُنیوی انقلابات میں بھی لوگوں نے یہ سب کام کیے ہیں۔ کمیونسٹ انقلاب نہیں آ سکتا تھا جب تک کہ لوگ جانیں نہ دیتے اور لوگوں نے ساری سختیاں نہ جھیلی ہوتیں۔ لیکن مسلمان کے لیے اپنی جان اللہ کی راہ میں پیش کرنا اتنا آسان ہے کہ

دوسروں کو اُس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس کا ایمان آخرت پر ہے اور اُس کے نزدیک اصل زندگی آخرت کی ہے۔ لہٰذا وہ اگر اپنا سب کچھ اللہ کی خاطر لگا دے، کھپا دے تو اسے گھاٹا کس اعتبار سے ہے؟ وہ تو سوچتا ہے کہ مجھے آخرت میں اس کا کئی گنا مل جائے گا، سات سو گنا مل جائے گا، ہزار گنا مل جائے گا، تو اس معاملے میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ آدمی کو آخرت پر جتنا یقین ہوگا اتنا ہی آدمی اپنے آپ کو invest کر دے گا۔ میں اپنی جمع پونجی بینک میں بچا کر رکھوں تو مجھ سے زیادہ پاگل کون ہوگا؟ یہ مجھے زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ فیصد منافع دے دیں گے، لیکن اللہ کا بینک کھلا ہوا ہے جو سات سو گنا دیتا ہے۔ تو یہاں بچا بچا کر رکھنا یقیناً بے وقوفی ہے۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا: زمین پر جمع نہ کرو، یہاں کیڑا بھی خراب کرتا رہتا ہے، چوری بھی ہوتی ہے، ڈاکہ بھی پڑتا ہے۔ آسمان پر جمع کرو، جہاں نہ کیڑا خراب کر سکے، جہاں چوری نہیں، ڈاکہ نہیں، اور میں تم سے سچ کہتا ہوں جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل بھی ہوگا''۔ تم نے مال اگر یہاں جمع کیا تو دل یہیں اٹکا رہے گا۔ جب فرشتے جان نکالنے کے لیے آئیں گے تو سوائے حسرت و افسوس کے کچھ نہ کر سکو گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ فرشتے ایسے جان نکالیں گے جیسے گرم سلاخ کے اوپر سے کباب کھینچا جاتا ہے۔ اگر آپ کی جمع پونجی اللہ کے بینک میں جمع ہے تو آپ کا دل بھی وہیں اٹکا ہوگا۔ فرشتہ آئے گا تو آپ کے لبوں پر مسکراہٹ ہوگی ؏

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اگر آپ نے کروڑوں روپیہ سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں جمع کر رکھا ہو اور آپ سے کہا جائے کہ ''نکل جاؤ ملک سے'' تو آپ کو کوئی افسوس ہوگا؟ لیکن اگر ملک سے باہر آپ کا کچھ نہیں، نہ کوئی جاننے والا ہے، تب کہا جائے نکل جاؤ تو آپ کو یقیناً تشویش ہوگی۔ یہ دراصل عقیدۂ آخرت ہی ہے، جو آج دنیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جانیں دینے کے لیے اس طرح آمادہ ہیں۔ انہوں نے فلسطین، کشمیر، چیچنیا اور افغانستان میں مسلمانوں کا یہ جذبہ دیکھ لیا ہے۔ یہ سب عقیدۂ آخرت پر یقین کی علامتیں ہیں۔

ایک زمانے میں جب مولانا مودودی مرحوم کو سزائے موت ہوئی تھی میں اُس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ تھا۔ میں نے ''عزم'' کے ٹائٹل پر یہ نظم شائع کی تھی اور پھر جیل میں مولانا کو بھیجی تھی ؎

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی ' فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے
سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا' غموں سے اندوہ گیں نہ ہونا
انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے
رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے تھے آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

یہ رئیسؔ امروہوی کے اشعار تھے۔ میں نے رئیس کی اضافت کے ساتھ یہ اشعار ''رئیسِ اہلِ نظر'' کی خدمت میں پیش کیے۔

رابعاً روحانی تربیت —— نبی اکرم ﷺ کے انقلاب میں روحانی تربیت کو بھی انتہائی اہمیت دی گئی۔ روحانیت پیدا کرنے کے سب سے بڑے ذریعے قرآن حکیم کو دلوں میں اتارا گیا' اس سے سینوں کو منور کیا گیا' اور اس کے ساتھ ساتھ نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرائی گئی۔ نیند بہت عزیز ہے' اللہ کی راہ میں جاگتے رہنے کی ترغیب دلائی گئی اور تہجد میں قرآن کو اپنے اندر اتارنے کا حکم دیا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا ۝۶﴾ (المزمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کرلو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر

پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔"

قرآن تو ویسے ہی نور ہے' یہ دلوں کی تاریکیاں دور کر کے انہیں منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' اور رات کا جاگنا نفس کو کچلنے میں بہت مؤثر ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے جس تیسری شے کی ترغیب دی گئی ہے وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ تو یہ ہے نظام محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی تربیت کا۔ ہمارے ہاں بعد میں جو بھی خانقاہی نظام وجود میں آیا اس میں تربیت اور تزکیہ کے اسلوب اور انداز اپنے ہیں۔ ان کے مراقبے' ان کے چلّے اور ذکر کے طریقے اپنے ہیں۔ میں اس نظام کی بات نہیں کر رہا' سلوکِ محمدیؐ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ انقلابی تربیت جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کی فرمائی اس کے عناصر ترکیبی میں نے بیان کر دیئے ہیں۔

آنحضور ﷺ کی انقلابی جِدّوجُہد میں صبرِ محض کا مرحلہ

میں نے عرض کیا تھا کہ صبر محض (Passive Resistance) کی ابتدا داعی کی کردار کشی سے ہوتی ہے کہ اس کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیا جائے۔ تین سال تک تنہا حضور ﷺ اس ایذا رسانی کا ہدف بنے رہے ہیں۔ اور یہ زبانی ہوتی رہی کہ پاگل ہو گئے ہیں' مجنون ہو گئے ہیں۔ ہم انہیں کہتے تھے مت جایا کرو غارِ حرا میں اور وہاں کئی کئی دن نہ رہا کرو' وہاں پر کوئی نہ کوئی آسیب سوار ہو گیا ہے' ان پر کوئی جن آ گیا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ انہوں نے شاعری شروع کر دی ہے' یا یہ کہ یہ ساحر بن گئے ہیں یا مسحور ہو گئے ہیں۔ یہ تمام تر آنحضور ﷺ کی کردار کشی (character assassination) اور آپؐ کی قوتِ ارادی کو مجروح کرنے کی کوششیں تھیں —— اور یہ مت سمجھئے کہ اس سے حضور ﷺ کو رنج نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کی گواہی ہے: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾﴾ (الحجر) "(اے نبی ﷺ!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو باتیں یہ کہہ رہے ہیں ان سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے"۔ ان سے آپؐ کو صدمہ ہوتا ہے' آپؐ کو اپنے سینے میں گھٹن محسوس ہوتی ہے کہ یہی ہیں جو مجھے الصادق اور الامین کہا کرتے تھے'

آج یہ مجھے ساحر اور کذاب کہہ رہے ہیں' مجھ پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہیں' مجھ پر دھوکے کا الزام لگا رہے ہیں کہ کسی سے ڈکٹیشن لے کر ہم پر دھونس جماتا ہے کہ یہ مجھ پر اللہ کی وحی آ گئی ہے۔ لیکن اس کیفیت میں آپ ﷺ کے لیے حکم یہ تھا کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾﴾ (المزمل) ''جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کیجیے اور بھلے طریقے سے ان کو چھوڑ دیجیے''۔ خوبصورتی کے ساتھ اپنا رخ موڑ لیجیے اور ان کو چھوڑ دیجیے' کسی اور سے بات کیجیے۔ لیکن علیحدگی لٹھ مار کر نہ ہو۔ ہو سکتا ہے جو شخص آج بات نہیں سن رہا' کل سننے پر آمادہ ہو جائے۔

تین سال کے بعد مشرکین کو محسوس ہوا کہ یہ تو چٹان کی طرح کھڑے ہیں اور دو باتیں بہت خطرناک ہو گئی ہیں۔ ایک تو ہماری نوجوان نسل ان کے گرد جمع ہو گئی ہے۔ یہ بنواُمیہ کا چشم و چراغ عثمان ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ مصعب بن عمیر اور سعد بن ابی وقاص جیسے نوجوان ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں' اور اس سے بھی بڑھ کر خطرناک معاملہ یہ کہ ہمارے غلام ان پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ تو ایسا معاملہ ہے جیسے کہیں پر بارود کا سٹور ہو اور وہاں پر چنگاری اڑ کر جا رہی ہو۔ ہمارے غلام اگر کہیں ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہم سے ہمارے مظالم کے بدلے چکانے شروع کیے تو کس بھاؤ بکے گی؟ لہٰذا اب جسمانی تشدد و تعذیب (physical persecution) کا آغاز ہو گیا کہ انہیں مارو' انہیں بدترین جسمانی سزائیں دو' ان کو گھروں میں بند کر دو اور زنجیروں میں جکڑ کر رکھو۔ کھانے کو کچھ مت دو' بھوکا رکھو۔ غلام ہے تو بری طرح مارو' پیٹو' گلیوں میں گھسیٹو۔ حضرت سمیہ اور حضرت یاسر (رضی اللہ عنہما) کو ابوجہل نے بدترین اور شرمناک ترین تشدد کر کے شہید کیا۔ جوان بیٹے' عمار بن یاسر کو ستون سے باندھا اور ان کے سامنے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ مار مار کر تھک گیا تو کہا ایک دفعہ کہہ دو کہ ''تمہارا معبود بھی سچا ہے'' میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ انہوں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ پھر اس نے شرمگاہ کے اندر برچھا دے مارا جو جسم کے آر پار ہو گیا۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے جسم کو چار وحشی اونٹوں کے ساتھ باندھ کر ان کو چار مخالف سمتوں میں دوڑایا گیا تو ان

کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔

اس صورتِ حال میں رسول اللہ ﷺ کا حکم یہی تھا کہ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ ابھی اپنے ہاتھ بندھے رکھو! اس کا فلسفہ میں بیان کر چکا ہوں کہ مسلمان اُس وقت تعداد میں بہت قلیل تھے۔ اگر اُس وقت وہ کوئی جوابی کارروائی کرتے تو انہیں کچل کر رکھ دیا جاتا۔ جبکہ انہیں ایک قوت بننے کے لیے مہلتِ عمل درکار تھی۔ دوسرے یہ کہ تشدد کا یکطرفہ نشانہ بننے سے انہیں عوام کی ہمدردیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ حضرت بلال ؓ کی گردن میں رسی ڈال کر ان کا آقا چھوکروں کے ہاتھ میں تھما دیتا کہ اسے کھینچو۔ جیسے ان دنوں عراق کی ابوغریب جیل میں قیدیوں پر تشدد کی تصویریں شائع ہوئی ہیں کہ قیدیوں کو برہنہ کر کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں زمین پر گھسیٹا جا رہا ہے‘ حضرت بلال ؓ کے ساتھ یہ معاملہ مکہ کی گلیوں کے اندر ہوا۔ انہیں نوکیلے پتھروں والی زمین پر اس طرح گھسیٹا جاتا جیسے مردہ جانور کی لاش گھسیٹی جاتی ہے۔ لوگ اس منظر کو دیکھتے اور سوچتے کہ بلال کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس نے چوری کی ہے یا آقا کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ وہ جانتے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بلال ؓ کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔

ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ دس نبوی تک حضور ﷺ پر کسی نے دست درازی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کو اپنے خاندان بنو ہاشم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اگرچہ بنو ہاشم سب ایمان نہیں لائے تھے‘ بلکہ ان میں ابولہب جیسے بدترین دشمن بھی تھے لیکن بنو ہاشم کے سردار ابوطالب تھے اور وہ حضور ﷺ کو تحفظ فراہم کر رہے تھے۔ قبائلی نظام میں قبیلے کا سردار جس کسی کو تحفظ دے دیتا‘ پورا قبیلہ اس کے پیچھے ہوتا۔ لہٰذا اگر شعب بنی ہاشم میں تین سال کی نظربندی ہوئی ہے تو پورا خاندانِ بنی ہاشم اس میں شریک تھا‘ صرف مسلمان محصور نہیں تھے۔ ابوطالب سے کفارِ مکہ کا مطالبہ تھا کہ وہ محمد (ﷺ) کی پشت پناہی چھوڑ دیں تاکہ ہم ان سے نمٹ سکیں‘ لیکن انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔

سن ۱۰ نبوی میں ابو طالب کا انتقال ہوگیا' اسی سال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا۔ حضور ﷺ جب باہر سے تھکے ہوئے گھر آتے' طبیعت میں انقباض ہوتا کہ آج فلاں شخص نے پاگل کہہ دیا' فلاں نے ساحر کہہ دیا' تو گھر میں ایک دلجوئی کرنے والی وفا شعار شریکۂ حیات تو موجود تھی' وہ بھی اللہ نے اٹھالی۔ ابو طالب خاندانی طور پر ساتھ دے رہے تھے' ان کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ اس سال کو آپ ﷺ نے ''عام الحزن'' کا نام دیا کہ یہ ہمارے لیے غم کا سال ہے۔ ابو طالب کے انتقال سے آپ ﷺ کو جو خاندانی تحفظ حاصل تھا وہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا اب دار الندوہ میں فیصلہ ہوگیا کہ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا جائے۔ مشورہ یہ ہوا کہ کوئی ایک آدمی قتل نہ کرے' ورنہ اس کے خلاف پورا خاندانِ بنو ہاشم کھڑا ہو جائے گا' بلکہ اس مقصد کے لیے تمام قبیلوں سے نوجوانوں کو چنا جائے جو بیک وقت جا کر حملہ کریں تا کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جائے کہ کس نے قتل کیا ہے۔ مکہ کی سرزمین تنگ ہوتی نظر آئی تو آپ ﷺ نے طائف کا سفر اختیار کیا کہ شاید وہاں کوئی امیر یا کوئی سردار ایمان لے آئے تو میں اپنا مرکز وہاں منتقل کر دوں۔ وہاں حضور ﷺ کے ساتھ تین دنوں میں جو کچھ بیتی' وہ مکہ میں دس سال میں نہیں بیتی تھی۔ آپ ﷺ پر پتھراؤ ہوا' شدید ترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جسم اطہر خون سے لہولہان ہوا۔ اس موقع پر آپ ﷺ کے قلب کی گہرائیوں سے جو فریاد نکلی ہے اسے نقل کرتے ہوئے بھی کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے اس کی۔''

اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ؟ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ اَوْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ اَمْرِيْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟''

اِنْ لَّمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِيْ!

''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی

ہوں، مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ

''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں۔''

اس سے گہری کوئی فریاد ہو سکتی ہے؟ لیکن دیکھئے، حضور ﷺ کی دو نسبتیں ہیں، مقامِ عبدیت اور مقامِ رسالت۔ (وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ) یہاں وہ نسبتِ عبدیت غالب آ رہی ہے: (اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِیْ) ''پروردگار! اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں!'' سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!!

انقلابِ نبویؐ میں اقدام اور چیلنج کا مرحلہ

اگلا مرحلہ اقدام (Active Resistance) کا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس مرحلے میں قدم رکھنے کا فیصلہ نہایت نازک ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے معاملے میں اس مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا لہٰذا غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن آئندہ جو بھی تحریک ہو گی اس کی قیادت یہ فیصلہ کرے گی اور اس میں غلطی کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔ نیک نیتی کے ساتھ غلطی کی صورت میں دنیا میں ناکامی کے باوجود آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔ تحریک شہیدینؒ انیسویں صدی کی سب سے بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اس تحریک میں سید احمد بریلویؒ سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے قبل از وقت (pre-mature) قدم اٹھا لیا اور پٹھانوں کے علاقے میں جا کر فوراً شریعت نافذ کر دی۔ انہوں نے اپنی ہجرت کو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ جیسے ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے شریعت نافذ کر دی تھی اسی طرح میں رائے بریلی سے چل کر ہجرت کر کے یہاں آ گیا ہوں لہٰذا شریعت کا نفاذ کر دینا چاہیے۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ حضور ﷺ کو تو مدینہ والے خود آ کر لے گئے تھے، آپ کو تو کوئی لینے نہیں گیا تھا۔ لہٰذا کچھ وقت لگانا چاہیے تھا کہ مقامی آبادی کا ذہن تیار ہو، ان کا فکر پختہ

ہو ان کے دلوں میں ایمان و یقین راسخ ہو اور پھر وہ اپنے رسوم و رواج کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ آپؒ سے غلطی ہوئی، لیکن چونکہ یہ غلطی پورے خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ ہوئی لہٰذا اللہ کے ہاں ان کا اجر و ثواب محفوظ ہو گیا' اگرچہ دنیا میں تحریک ناکامی سے دوچار ہو گئی۔ مولانا مودودیؒ سے بھی بہت بڑی غلطی ہوئی کہ وہ چھ سات سال تک جس طریق کار پر عمل پیرا رہے تھے جب تک ہندوستان ایک ملک تھا' اُسے پاکستان آ کر تبدیل کر دیا اور انتخابات کے میدان میں آ گئے کہ شاید لوگ ہمیں ووٹ دیں گے اور ہم حکومت بنا لیں گے اور جب حکومت ہماری ہو گی تو سارا نظام ہم خود ہی بدل دیں گے۔ نظامِ تعلیم بدل دیں گے' نظامِ معیشت تبدیل کر دیں گے۔ ذرائع ابلاغ ہمارے ہاتھ میں ہوں گے تو ہم پوری قوم کی ذہنی و فکری تربیت کریں گے۔ تو بظاہر بڑا عمدہ معاملہ تھا کہ اگر بلّی کے گلے میں گھنٹی لٹکا دی جائے تو چوہوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تو الیکشن کے ذریعے سے کامیابی کا یہ سراب سامنے آیا تو وہ دھوکہ کھا گئے۔ اس لیے کہ ابھی یہاں کی فضا تو تیار نہیں تھی۔ ابھی معدودے چند لوگ ان کی دعوت سے واقف تھے۔ لہٰذا عوام کی اکثریت انہیں ووٹ کیسے دے دیتی؟ بہرحال غلطیاں ہوتی ہیں اور غلطیوں کے نتیجے میں دنیا میں ناکامی ہو جاتی ہے' لیکن غلطی اگر نیک نیتی سے ہو تو آخرت کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی اقدامات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہاں اوس اور خزرج دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے۔ اُدھر مکہ سے جو جمعیت تیار ہو کر آئی تھی یہ سوڈیڑھ سو آدمی تھے جو آزمائش کی بھٹیوں میں سے گزر کر آئے تھے ۔

تُو خاک میں مل اور آگ میں جل' جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اقدام (Active Resistance) کا فیصلہ کیا' لیکن چھ مہینے میں آپؐ نے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کی خاطر تین کام کیے۔ اولاً مسجد نبویؐ تعمیر

فرمائی' جو عبادت گاہ بھی تھی' خانقاہ اور درس گاہ بھی تھی' پارلیمنٹ اور مشاورت کی جگہ بھی تھی' یہی گورنمنٹ ہاؤس کا مقام بھی رکھتی تھی' یہیں پر وفود بھی آ رہے تھے۔ گویا مسلمانوں کا ایک مرکز وجود میں آ گیا۔ ثانیاً آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین ''مواخات'' قائم فرمادی اور ہر مہاجر کو کسی ایک انصاری کا بھائی قرار دے دیا۔ چنانچہ انصارِ مدینہ نے اپنے ان مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں اور دکانوں میں سے حصے دیے اور اپنے ذرائع معاش میں ان کو شریک کیا۔ اس مواخات میں ایسی ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں کہ انصاری بھائیوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر کے انہیں نصف نصف تقسیم کر کے مہاجر بھائیوں کو دے دیا۔ یہاں تک کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں۔ اُس وقت پردے کے احکام ابھی نہیں آئے تھے' وہ تو کہیں پانچ چھ سال بعد آئے۔ وہ انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے گئے' اور کہا کہ یہ میری دو بیویاں ہیں' ان میں سے جو تمہیں پسند ہو اشارہ کرو' میں اسے طلاق دے دوں گا تم اس سے شادی کر لینا۔ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میرا بھائی قرار دیا ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارا گھر آباد نہ ہو اور میرے گھر میں دو دو بیویاں ہوں۔ یہ مواخات کا درس تھا۔

ہجرت کے بعد چھ ماہ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے تیسرا اہم کام یہ کیا کہ مدینہ میں آباد یہودی قبائل کے ساتھ مشترکہ دفاع کے معاہدے کر لیے۔ آپ ﷺ کے اس اقدام کی منٹگمری واٹ اور ٹائن بی نے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور اسے آپ ﷺ کے حسنِ تدبر اور statesmanship کا عظیم مظہر قرار دیا ہے۔ مدینہ میں یہود کے تین قبائل بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ آباد تھے جو بڑی تزویراتی (strategic) پوزیشن میں تھے۔ مدینہ کے باہر ان کی گڑھیاں اور قلعے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے ان تینوں قبائل سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کر لیا۔ آج بعض لوگ احمقانہ طور پر میثاقِ مدینہ کو اسلامی ریاست کے دستور کا نام دیتے ہیں' حالانکہ یہ مشترکہ دفاع کا ایک معاہدہ (Joint Defence Pact) تھا کہ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو مسلمان اور یہودی مل

کر حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔ اس معاہدے سے رسول اللہ ﷺ کی پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی۔

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات

مدینہ میں اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے بعد آپ ﷺ نے راست اقدام (Active Resistance) کا آغاز کرتے ہوئے چھوٹے چھاپہ مار قسم کے گروپ بھیجنے شروع کر دیے۔ غزوۂ بدر سے پہلے پہلے آپؐ نے ایسی آٹھ مہمات روانہ کیں' جن میں سے چار میں حضور ﷺ خود بھی شریک ہوئے اور چار میں آپؐ شریک نہیں ہوئے۔ لہٰذا ان مہمات میں سے چار غزوات اور چار سرایا کہلاتی ہیں۔ اس عرصے میں مکہ والوں کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یعنی اب جو initiative لیا گیا وہ حضور ﷺ کی طرف سے لیا گیا۔ افسوس کہ اس بات کو چھپانے کے لیے ہمارے ہاں سیرتِ نبویؐ میں تحریف کی گئی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح آج کل مغربی میڈیا پروپیگنڈا کرتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے' اسلام تو خونی مذہب ہے' اسلام دہشت گردی کا درس دیتا ہے' اسی طرح جب یورپ کی استعماری طاقتیں عالمِ اسلام پر قابض ہوئیں تو مستشرقین نے اسلام کے خلاف اسی طرح کا زہریلا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس پر ہمارے مصنفین نے معذرت خواہانہ (apologetic) انداز اختیار کیا کہ نہیں نہیں' حضور ﷺ نے کوئی جنگ خود شروع نہیں کی تھی' یہ تو حضور ﷺ نے اپنے دفاع میں جنگیں کی تھیں۔ حالانکہ یہ بات سو فیصد جھوٹ ہے۔ مکہ کے پُرسکون تالاب میں بھی ہلچل حضور ﷺ نے پیدا کی تھی۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

ورنہ وہاں کے لوگ سب کے سب اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہ رہے تھے۔ اسی طرح ہجرت کے بعد مکہ والوں کے خلاف راست اقدام (Active Resistance) اور بالآخر مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز بھی محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

غزوۂ بدر سے قبل ایک سال کے عرصے میں آپ ﷺ نے جو آٹھ مہمات روانہ کیں ان کے دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کے حوالے سے پہلا مقصد

مکہ کی معاشی ناکہ بندی (economic blockade) اور دوسرا مقصد قریش کی سیاسی ناکہ بندی (isolation or political containment) تھا۔ قریش کے قافلے جس راستے سے گزرتے تھے' آپؐ نے اس کو مخدوش بنا دیا اور قریش کو گویا یہ پیغام دے دیا کہ اب ہم یہاں موجود ہیں اور آپ کے تجارتی قافلے ہماری زد میں ہیں۔ جو راستہ مکہ سے شام جاتا تھا' وہ بدر سے گزرتا تھا۔ بدر مکہ سے دو سو میل دور ہے جبکہ مدینہ سے اس کا فاصلہ صرف نوے میل ہے۔ آپؐ نے قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنے کے لیے کئی مہمیں ادھر بھیجیں۔ خود ایک بڑی مہم لے کر گئے اور اس بڑے قافلے کا پیچھا کیا جو ابوسفیان لے کر شام جا رہا تھا' لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ اسی طرح مکہ سے یمن جانے والے قافلے طائف سے ہو کر گزرتے تھے۔ ادھر بھی آپؐ نے ایک مہم بھیج دی۔ پھر آپؐ جہاں گئے وہاں کے قبیلوں سے آپؐ نے معاہدے کر لیے۔ یا تو وہ پہلے قریش کے حلیف تھے اب حضور ﷺ کے ہو گئے' یا انہوں نے غیر جانبدارانہ حیثیت اختیار کر لی کہ نہ ہم قریش کے خلاف آپؐ کی مدد کریں گے' نہ آپؐ کے خلاف قریش کی مدد کریں گے۔ ان دونوں طرح کے معاہدوں سے قریش کی طاقت کم ہوئی۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے متذکرہ بالا دونوں مقاصد حاصل کر لیے۔

ہر قوم میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں انہیں عقابی مزاج کے لوگ (hawks) اور فاختائی مزاج کے لوگ (doves) کہا جاتا ہے۔ مکہ میں بھی ہر دو طرح کے لوگ موجود تھے۔ جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگوں (hawks) میں ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط بہت نمایاں تھے' جبکہ ٹھنڈے مزاج اور بردبار طبیعت کے حامل لوگوں (doves) میں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام نمایاں تھے۔ مقدم الذکر طبقے کا کہنا تھا کہ چلو اب مدینہ پر حملہ کرو اور محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع کر دو' جبکہ مؤخر الذکر اس طرح کے اقدام کے حق میں نہیں تھے۔ عتبہ بن ربیعہ بہت زیرک انسان تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد قریش سے کہا تھا کہ دیکھو محمدؐ اور اس کے ساتھی یہاں سے چلے گئے (ان کے خیال میں وہ بلا ان کے سر سے تو ٹل گئی)' اب مدینہ

جا کر بھی محمد (ﷺ) آرام سے تو نہیں بیٹھے گا بلکہ اپنے دین کی تبلیغ کرے گا۔ اس سے عرب اس کے خلاف ہوں گے اور بقیہ عربوں سے اس کی کشمکش ہوگی۔ تو اگر باقی عرب کو محمد (ﷺ) نے فتح کر لیا تو ہمارا کیا نقصان ہے، وہ ہمارا قریشی بھائی ہے، اس کی جیت ہماری جیت ہے، اس کی فتح سے عرب پر ہماری حکومت قائم ہو جائے گی، اور اگر عربوں نے محمد (ﷺ) کو ہلاک کر دیا تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا بغیر اس کے کہ تم اپنے بھائیوں کے خون سے اپنی تلواریں آلودہ کرو۔ آخر ابوبکر کون ہے؟ ہمارا بھائی نہیں ہے کیا؟ عمر کون ہے؟ اور یہ عثمان کون ہے؟ بنوامیہ میں سے ہے۔ حمزہ کون ہے؟ عبدالمطلب کا بیٹا ہے۔ اور محمد (ﷺ) کون ہے؟ عبدالمطلب کا پوتا ہے۔ تم اپنی تلواروں سے ان کی گردنیں اڑاؤ گے؟ تم محمد (ﷺ) کو اور عربوں کو آپس میں نمٹنے دو۔ اگر محمد (ﷺ) جیت گیا تو ہمارا راج پورے عرب پر ہوگا۔ یہ وہ بات تھی جو فی الحقیقت ہو کر رہی۔ خلافت راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت میں پھر وہی عرب تھے جن کی حکومتیں قائم ہوئیں، چاہے بنواُمیہ تھے، چاہے بنوعباس تھے۔ اس قدر گہری بات اُس شخص نے کہی جس نے اہلِ مکہ کو متاثر بھی کیا۔

ان فاختائی مزاج لوگوں (doves) کا مکہ میں خاصا اثر و رسوخ تھا، لیکن دو واقعات ایسے وقوع پذیر ہو گئے کہ جنگجو اور مشتعل مزاج لوگوں (hawks) کا پلڑا بھاری ہو گیا اور یہ doves بالکل خاموش ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ ابوسفیان کا وہ قافلہ جس کا حضور ﷺ نے پیچھا کیا تھا اور وہ بچ کر نکل گیا تھا، اب مالِ تجارت سے لدا پھندا شام سے واپس آ رہا تھا۔ ابوسفیان نے قریش کو SOS کال بھیج دی کہ مجھے خطرہ ہے کہ محمد (ﷺ) کے آدمی قافلے پر حملہ کریں گے اور ہمیں لوٹ لیں گے، لہٰذا فوری طور پر مدد بھیجی جائے۔ ابوسفیان کا پیغام لے کر ایک آدمی چیختا چلاتا ہوا مکہ پہنچا کہ تمہارا قبیلہ، تمہارا خاندان اور تمہارا مال خطرے میں ہے، لہٰذا فوراً مدد کو پہنچو۔ دوسری طرف ایک اور واقعہ ہو گیا۔ حضور ﷺ نے بارہ افراد کا ایک چھوٹا سا دستہ نخلہ بھیجا تھا جو طائف اور مکہ کے درمیان ایک مقام ہے اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہاں قیام کرو اور ہمیں وہاں سے مکہ

کے لوگوں کی نقل و حرکت سے مطلع کرتے رہو۔ وہاں ایسی صورت حال پیش ہوئی کہ مکہ والوں کے ایک قافلے کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہوگئی' جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک مارا گیا' دو کو وہ گرفتار کر کے لے آئے اور ایک بھاگ گیا۔ مسلمان کئی اونٹوں کے اوپر لدا ہوا مال بطور غنیمت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس پر حضور ﷺ ناراض ہوئے کہ میں نے تمہیں جنگ کا حکم تو نہیں دیا تھا۔ لیکن اب جو ہونا تھا' ہو چکا تھا۔ جو مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں بچ کر بھاگا تھا وہ کپڑے پھاڑ کر چیختا چلاتا ہوا مکہ پہنچا کہ لوگو دیکھو محمد (ﷺ) کے آدمیوں نے ہمارا آدمی مار دیا۔ یہ دو خبریں بیک وقت مکہ پہنچیں' ایک شمال سے اور دوسری جنوب سے۔ ہجرت کے بعد اب تک مشرکین نے کسی مسلمان کو نہیں مارا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضرت سُمیہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما کو ابوجہل نے شہید کیا تھا' لیکن ہجرت کے بعد اہلِ مکہ کی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا تھا۔

انقلابِ نبویؐ کا چھٹا مرحلہ: مسلّح تصادم

متذکرہ بالا دو واقعات کی وجہ سے doves کو خاموش ہونا پڑا اور اس کے نتیجے میں غزوۂ بدر سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کا آغاز ہو گیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ اور قریش کے مابین دو طرفہ جنگ تھی جو قریباً چھ سال جاری رہی اور اس دوران حق و باطل کے مابین کئی معرکے ہوئے۔ غزوۂ بدر میں قریش کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور چودہ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے۔ اُحد میں الٹا معاملہ ہو گیا کہ بعض صحابہؓ کی غلطی سے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ تفاصیل کے لیے میری کتاب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کا مطالعہ کیجیے۔ یہ تو میں اس خاکے میں رنگ بھر رہا ہوں' لیکن آپ کو سیرت نہیں پڑھا رہا' فلسفۂ سیرت سمجھا رہا ہوں۔ قریش مکہ سے آپؐ کی چھ سالہ طویل جنگ ۱۷ رمضان المبارک سن دو ہجری کو شروع ہوئی اور دس رمضان المبارک ۸ ہجری کو فتح مکہ پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس دوران بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ مختلف غزوات میں سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ غزوۂ اُحد

میں حضور ﷺ خود بھی مجروح ہوئے اور دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔ تلوار کا وار چہرہ مبارک پر پڑا تو جو خود آپؐ پہنے ہوئے تھے اس کی دو کڑیاں رخسار مبارک کی ہڈی کے اندر گھس گئیں۔ ایک صحابیؓ نے دانتوں سے پکڑ کر کھینچ کر نکالنا چاہا تو ان کے دانت اُکھڑ گئے مگر وہ نہیں نکلیں۔ کسی طریقے سے انہیں نکالا گیا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اتنا خون بہا کہ آپ ﷺ بے ہوش ہو کر گر گئے اور مشہور ہو گیا کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے۔ ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ان کے حضور ﷺ کے ساتھ کئی رشتے تھے —— وہ آپ ﷺ کے چچا بھی تھے، خالہ زاد بھائی بھی اور دودھ شریک بھائی بھی، جو عربوں کے ہاں سگے بھائی شمار ہوتے تھے۔ پھر وہ آپ ﷺ کے بچپن کے ہم جولی اور دوست تھے۔ اور ان کی لاش اس حالت میں آئی کہ ناک کٹی ہوئی ہے، کان کٹے ہوئے ہیں، پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبایا گیا ہے۔ چنانچہ جان لیجیے کہ انقلاب برپا کرنے کا یہ کام گھر بیٹھے نہیں ہوا۔ اس کے لیے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں۔

بہرحال چونکہ یہ کام بھرپور تیاری کے بعد کیا گیا تھا لہٰذا چھ سال کے عرصے پر محیط اس مسلح تصادم کا نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نکلا اور انقلابِ نبویؐ کی تکمیل ہو گئی۔ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جو جنگیں لڑیں ان کی حیثیت ملٹری کی اصطلاح میں mopping-up operation کی تھی، جس کے ذریعے مخالف قوتوں کا آخری قلع قمع کر دیا جاتا ہے۔ فتح مکہ پر اندرونِ عرب انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔

انقلابِ نبویؐ کی توسیع و تصدیر

اب مجھے دو باتوں کی مزید وضاحت کرنی ہے۔ پہلی بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ سے قبل نہ کوئی مبلغ عرب سے باہر بھیجا، نہ اپنا کوئی خط یا پیغام کسی سربراہ حکومت کے نام بھیجا۔ دس سال تک سارا کام مکہ ہی میں کیا۔ اس کے بعد طائف کا سفر فرمایا۔ انقلابی عمل کا خاصہ یہ ہے کہ یہ ابتدا میں پھیلتا نہیں ہے۔ مشنری اور تبلیغی کام

خربوزے یا ککڑی کی بیل کی طرح زمین پر پھیلتا ہے‘ جبکہ انقلابی عمل ایک ہی مقام پر اپنی جڑیں جما کر اوپر اٹھتا ہے۔ جیسے آم کی گٹھلی پھٹتی ہے تو اس سے دو پتے نکلتے ہیں‘ اس سے آم کا پودا بنتا ہے جو تناور درخت بن کر برگ و بار لاتا ہے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد مشنری انداز کی نہیں تھی بلکہ انقلابی انداز کی تھی۔ مکی زندگی کے ابتدائی دَور میں آپؐ کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ اُس وقت حضرت خدیجہ ؓ کی دولت موجود تھی جو انہوں نے آپؐ کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ اُس وقت آپؐ چاہتے تو قیصر و کسریٰ اور دوسرے حکمرانوں کو خطوط بھیج سکتے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں‘ مجھ پر ایمان لاؤ! لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ ﷺ نے عرب کے مخالف قبائل سے معاہدے کیے‘ لیکن عرب سے باہر کوئی وفد نہیں بھیجا۔ وہ تو جب صلح حدیبیہ ہو گئی اور قریش نے گویا آپ ﷺ کو مخالف قوت کے طور پر تسلیم (recognize) کر لیا‘ جسے قرآن حکیم نے ”فتح مبین“ قرار دیا تو آپ ﷺ نے کسریٰ‘ ہرقل‘ مقوقس‘ نجاشی اور ان رؤسائے عرب کی طرف جو جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر آباد تھے اور انہوں نے اُس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا‘ اپنے دعوتی و تبلیغی نامہ ہائے مبارک چند صحابہ کرام ؓ کے ہاتھ روانہ کیے۔ ان نامہ ہائے مبارک کے نتیجہ میں ملوک و سلاطین کی جانب سے مختلف ردِ عمل سامنے آئے۔ ملک غسان نے‘ جو ہرقل کے تابع تھا‘ آپ ﷺ کے سفیر حارث بن عمیر ؓ کو شہید کر دیا۔ حضور ﷺ نے ان کے قصاص کے لیے لشکر تیار کر کے بھیجا اور غزوۂ مُوتہ کا معرکہ ہوا۔ اس کے بعد پھر غزوۂ تبوک کا معاملہ ہوا۔ اس طرح محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں تصدیر انقلاب (یعنی Exporting of Revolution) کے مرحلے کا آغاز بھی ہو گیا۔ یعنی حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نہ صرف اندرونِ ملک عرب انقلاب کی تکمیل ہو گئی بلکہ عرب سے باہر کام کا آغاز آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے کیا اور پھر یہ ذمہ داری امت کے سپرد فرمائی کہ تم نے اس کام کو آگے بڑھانا ہے۔

منہجِ انقلابِ نبویؐ کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

دوسری بات یہ کہ آج وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور حالات میں بہت تبدیلی آ چکی ہے۔ لہٰذا اس وقت ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب پر جوں کا توں عمل کیا جائے گا یا اس کے لیے کسی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اوپر بیان کیے گئے پہلے پانچ مراحل میں قطعاً کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا انقلابی نظریہ آج بھی وہی نظریہ توحید ہے اور آج بھی ہمیں ایمان کی دعوت دینی ہے' جس کا منبع وسرچشمہ قرآن ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو ہمارے اندر ایمان تو موجود ہے۔ اس لیے کہ اسلام اور شے ہے' ایمان اور شے ہے۔ ہم مسلمان اس لیے ہیں کہ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوگئے ہیں۔ ایمان ہمیں اپنے قلوب واذہان میں خود پیدا کرنا ہے۔ توحید پر' آخرت پر' رسالت پر یقین والا ایمان ہماری اولین ضرورت ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن تھا۔ آج بھی یہی قرآن ہمارا آلۂ انقلاب ہے۔ لہٰذا رجوع الی القرآن کی دعوت وسیع پیمانے پر عام کی جائے۔ میرے نزدیک قرآن کی حیثیت مقناطیس کی ہے جو سلیم الفطرت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے' اور جن لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہو ان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو تو کھینچ لے گا لیکن لکڑی کے ٹکڑوں کو نہیں کھینچے گا۔ لہٰذا قرآن کے مقناطیس کو اس معاشرے میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ الحمد للہ کہ میں نے چالیس برس تک اس شہر لاہور میں قرآن کی چکّی پھیری ہے۔ مجھے یہ خطاب بھی دے دیا گیا تھا کہ یہ قرآن کا قوّال ہے اور میں نے خوشی سے اس خطاب کو قبول کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

”ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم“

کے مصداق میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا۔ میڈیکل پڑھی تھی سب بھلا دی۔ ہاں یہ حدیثِ دوست ہے‘ اللہ کا کلام ہے‘ اس کی تکرار میں کر رہا ہوں۔ بہرحال پہلا زینہ یہی ہوگا۔ پھر جو لوگ اس میگنٹ کے ساتھ چمٹ کر آ جائیں انہیں بیعت کی بنیاد پر منظم کیا جائے‘ جو محمد رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے بطور اُسوہ چھوڑ گئے ہیں۔ تنظیم کی بنیاد کسی انگریزی نظام پر نہ ہو‘ کوئی دو تین سال کی امارت کا معاملہ نہ ہو‘ کوئی انتخابِ امیر کا معاملہ نہ ہو‘ بلکہ جس داعی نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اس کی بات کو صحیح تسلیم کیا‘ اس کی دعوت پر اعتماد کیا‘ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ اس عہد کے ساتھ دے دو کہ ہم شریعت کے دائرہ کے اندر اندر آپ کا حکم مانیں گے۔ اپنا مشورہ ضرور دیں گے‘ لیکن فیصلہ آپ کا ہوگا۔ جو لوگ اس بنیاد پر جمع ہو جائیں اب ان کی تربیت کی جائے۔ قرآن ان کے اندر اتارا جائے۔ راتوں کو جاگنے کی تشویق دلائی جائے۔ اللہ کی راہ میں انفاقِ مال اور بذلِ نفس کی تلقین کی جائے۔ بلاشبہ نفاق کو ختم کرنے والی شے اِنفاق ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ صبرِ محض (Passive Resistance) کا مرحلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ آج صبرِ محض کی شکل کیا ہوگی؟ ہم ابھی حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہیں۔ مکہ کی چھوٹی سی آبادی میں تو سو پچاس آدمی بھی خطرہ بن کر نظر آ گئے تھے‘ لیکن یہاں پندرہ کروڑ میں دو چار ہزار آدمی ایسے ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ لہٰذا ابھی ان پر حکومت کی طرف سے یا اس نظام کی طرف سے کوئی داروگیر شروع نہیں ہوگی۔ البتہ ان کا امتحان شریعت پر عمل کرنے میں ہوگا۔ انہیں رشوت چھوڑنی ہوگی‘ لیکن اس سے اپنے گھر والے دشمن ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ ناشتے میں پہلے پراٹھے اور انڈے کھاتے تھے‘ اب انہیں روکھی سوکھی پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ سورۃ التغابن میں ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ وَ اَوۡلَادِکُمۡ عَدُوًّا لَّکُمۡ فَاحۡذَرُوۡہُمۡ﴾ (آیت ۱۴) ”اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں‘ پس ان سے بچ

کر رہو"۔ آپ اپنے گھر میں شرعی پردہ نافذ کریں گے تو آپ کی پوری برادری آپ کا سوشل بائیکاٹ کر دے گی۔ تو یہ ہے وہ صبرِ محض (Passive Resistance) کا مرحلہ جس سے ابھی ہم گزر رہے ہیں' لیکن اللہ کرے کہ وہ وقت بھی آئے کہ اتنے لوگ مجتمع ہوں کہ حکومت کو ان سے اندیشہ لاحق ہو جائے کہ یہ اس نظام کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ پھر دار و گیر ہو گی' دار و رسن کا معاملہ ہو گا۔

دورِ حاضر میں حالات واقعتاً اِس درجے تبدیل ہو گئے ہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کے بارے میں اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کفار تھے' اور حربی کافر کی گردن مارنے میں کسی کو کیا جھجک ہو سکتی تھی۔ جبکہ آج صورت حال یہ ہے کہ اِدھر بھی مسلمان ہیں اور اُدھر بھی مسلمان۔ ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں' ہیں تو مسلمان۔ بھٹو' بے نظیر' ضیاء الحق' نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں طاقت کا فرق صرف تعداد کے اعتبار سے تھا۔ اِدھر ۳۱۳ رضا کار (volunteers) تھے تو اُدھر ایک ہزار رضا کار۔ اُدھر بھی باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح فوج نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُدھر ٹینک' توپیں' میزائل اور بم ہوں اور اِدھر مجاہدین صرف تلواریں لیے کھڑے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی فوج کا رسالہ دو گھوڑوں پر مشتمل تھا' اُدھر سو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا۔ چنانچہ تعداد میں فرق ضرور تھا' نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔

مزید برآں عمرانی ارتقاء (social evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ آج یہ مانا جاتا ہے کہ ریاست اور ہے' حکومت اور ہے۔ شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں' حکومت کے نہیں۔ حکومت کی تبدیلی تو عوام کا حق ہے۔ اُس وقت تک ابھی عمرانی ارتقاء اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' لہٰذا حکومت اور ریاست گڈمڈ تھے۔ اب یہاں پر بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں' ایک الیکشن کا راستہ اور ایک احتجاجی تحریک (agitation) کا

راستہ۔ الیکشن کے راستے سے نظام نہیں بدل سکتا' خواہ الیکشن کتنا ہی شفاف اور منصفانہ ہو۔ اس سے تو صرف نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے معاشرے میں طاقت کے جو ستون موجود ہیں الیکشن میں انہی کا انعکاس ہوگا۔ اگر ملک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو کوئی جاگیردار ہی منتخب ہو کر آئے گا۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام ہے تو کوئی سرمایہ دار ہی آئے گا۔ یہ تو شہروں میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے کہ کبھی کراچی میں جماعت اسلامی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی' کبھی ایم کیو ایم کی ہوگئی۔ کیونکہ شہروں میں نہ جاگیردار ہیں نہ قبائلی سردار۔ البتہ ہمارے دیہی علاقوں میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام قائم ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار الیکشن کے ذریعے منتخب ہو کر اقتدار میں آئیں گے تو کیا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری ختم کر دیں گے؟ اس طرح تو وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔ تو جان لیجیے کہ الیکشن کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتا ہے' اسے بدلنے کے لیے نہیں ہوتا۔ امریکہ میں دو پارٹیز ہیں' ری پبلیکنز اینڈ ڈیموکریٹس۔ ان دونوں کے مابین امریکہ کے نظام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ ہم اس نظام کو اچھے انداز سے چلا سکتے ہیں۔ ان کے منشور میں فرق ہوگا تو ٹیکسیشن پالیسی' ہیلتھ پالیسی یا امیگریشن پالیسی کا ہوگا۔ برطانیہ میں کنزرویٹوز اور لیبر پارٹی کے نام سے دو پارٹیاں ہیں۔ نظام کے بارے میں ان کے مابین بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں' اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ نظام کے خلاف بولیں گے۔ چنانچہ سی ایٹل اور واشنگٹن میں گلوبلائزیشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے یہ پتا دیتے ہیں کہ وہاں کمیونسٹ عنصر موجود ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے وہ لوگ الیکشن کا راستہ کبھی بھی اختیار نہیں کریں گے' الیکشن کے ذریعے ان کی کامیابی کا سوال ہی نہیں۔

موجودہ دور میں اقدام کی نوعیت

دریں حالات ایک ہی راستہ باقی ہے۔ وہ یہ کہ ایک پُرامن' منظم عوامی تحریک اٹھے جو توڑ پھوڑ نہ کرے اور سرکاری یا غیر سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچائے۔ البتہ یہ لوگ خود جانیں دینے کو تیار ہوں۔ اس کو میں ''یک طرفہ جنگ'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ سڑکوں پر

آ کر منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے کریں۔ یہ لوگ حکومت پر اپنا موقف واضح کریں کہ ہم نے منکرات کے انسداد کے لیے آپ سے بہت درخواستیں کیں' آپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدارا سود ختم کر دو' لیکن اب ہم picketing کریں گے' دھرنا دیں گے' بینکوں کا گھیراؤ کریں گے اور اس سودی نظام کو جیتے جی نہیں چلنے دیں گے۔ چلاؤ ہم پر گولیاں!

میرے خیال میں اس وقت انقلاب کے لیے یہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیے تھے؟ اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔ جہاں ممکن ہو دو طرفہ جنگ بھی ہو سکتی ہے' کسی پہاڑی ملک میں کوئی چھاپہ مار جنگ بھی ہو سکتی ہے' یہ حرام نہیں ہے۔ دین کو قائم کرنے کے لیے حضور ﷺ نے جنگ لڑی ہے تو ہم بھی لڑ سکتے ہیں اور کلمہ گو کے خلاف بھی لڑ سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے مطابق مسلمان حکمران اگر فاسق و فاجر ہوں تو ان کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ پہلے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر زبان سے کیا جائے۔ اگر یہ زبان سے کہنا مؤثر ثابت نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جا سکتا ہے۔ تو جنگ اگرچہ جائز ہے' لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔ آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔

اگر کسی حکومت کے خلاف اس طرح کی ایک احتجاجی تحریک چلتی ہے تو ظاہر ہے اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ شروع میں فوج حکومت کا حکم مانے گی اور مظاہرین پر گولیاں چلائے گی۔ لیکن ایک وقت میں آ کر فوج ہاتھ اٹھا دے گی کہ ہم اپنے ہم وطنوں کا مزید قتل نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی قابض فوج نہیں ہے' قومی فوج ہے' اور جو سامنے کھڑے ہیں وہ بھی کہیں اور سے نہیں آئے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے اگر سینکڑوں ہزاروں افراد بھون کر رکھ دیے تھے تو اسے ان کا کیا دکھ تھا؟ وہ انگریز تھا اور

مرنے والے ہندوستانی تھے' چاہے مسلمان ہوں چاہے ہندو یا سکھ ہوں۔ لیکن اپنی قوم کے لوگوں کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک حد تک تو حکم کی تعمیل کی جاتی ہے' پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اپنے فوجی افسر ہاتھ کھڑے کر دیتے ہیں۔ جیسے لاہور میں بریگیڈیئر محمد اشرف گوندل' اللہ تعالیٰ انہیں اجر و ثواب دے' کھڑے ہو گئے کہ اب ہم لوگوں پر مزید گولیاں نہیں چلائیں گے۔ پھر دو اور بریگیڈیئر کھڑے ہو گئے اور بھٹو صاحب کو پیغام مل گیا۔ چند دن پہلے انہوں نے ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے اپنی کرسی کے بازو پکڑ کر اکڑتے ہوئے کہا تھا کہ میری یہ کرسی بہت مضبوط ہے۔ مجھے آج تک وہ نقشہ یاد ہے۔ لیکن جب لاہور سے پیغام پہنچ گیا کہ فوج کا اب یہ نقطہ نظر ہے تو وہ کرسی ڈول گئی۔ پھر انہوں نے پی این اے کو مذاکرات کا پیغام بھجوایا۔ بہر حال اسلامی انقلاب کے لیے جانیں تو دینی ہوں گی' اس کے بغیر یہ کام نہیں ہو گا۔

دورِ حاضر میں ہمارے سامنے ایرانیوں کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے اپنی جانیں دے کر انقلاب برپا کر دکھایا۔ اگرچہ ایرانی انقلاب کو میں صحیح اسلامی انقلاب نہیں سمجھتا' بلکہ میرے نزدیک تو وہ ایک حقیقی انقلاب بھی نہیں تھا' اس لیے کہ وہ اپنی سرحدوں سے باہر نکل نہیں سکا' جبکہ ''تصدیرِ انقلاب'' ایک حقیقی انقلاب کا لازمی خاصہ ہے۔ ۸۵۔۱۹۸۴ء میں مَیں نے مسجد دار السلام باغ جناح میں اس موضوع پر خطابات کیے تھے کہ کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟ اور پھر اس کے بعد ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے موضوع پر گیارہ تقریریں کی تھیں' جن کا خلاصہ آج آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ وہ تقریریں اب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوتی ہیں۔ اگر آپ کے دل میں ذرا بھی کوئی جذبہ اُبھرا ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

وقت کی اہم ترین ضرورت

آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ طریقِ انقلاب واضح ہو جائے۔ آج مسلمانوں میں جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ جانیں دے رہے ہیں۔ اپنے

جسموں سے بم باندھ کر اپنے جسموں کو اڑا رہے ہیں۔ کشمیر کے اندر جو جذبہ ابھرا اسے پوری دنیا نے دیکھ لیا۔ کشمیریوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تو لڑنے والی قوم ہے ہی نہیں' مگر اب اس کے اندر جان پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان سے جا کر کتنے لوگوں نے وہاں پر جامِ شہادت نوش کر لیا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طریقے سے آپ صرف اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ آپ نے جا کر افریقہ میں امریکہ کے دو سفارت خانوں کو بم سے اڑا دیا' اس سے امریکی تو دس پندرہ مرے' جبکہ ۲۰۰ وہاں کے لوکل افریقی مر گئے۔ فائدہ کیا ہوا؟ بس یہی کہ آپ نے اپنا غصہ نکال لیا۔ تو ان طریقوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ الیکشن سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح اسلامی انقلاب کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ آپ کا خلوص اپنی جگہ' لیکن یہ طریقہ غلط ہے۔ اسلامی انقلاب کے لیے طریقہ محمدیؐ اختیار کرنا ہوگا۔ کیا حضورﷺ عرب میں الیکشن کے ذریعے سے کامیاب ہو سکتے تھے؟ قرآن تو کہتا ہے:

﴿وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ﴾ (الانعام:۱۱۷)

''اگر تم زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے''۔ الیکشن میں تو صرف اکثریت اقلیت کا مسئلہ ہے۔ میں اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہوں' کیا آیت اللہ خمینی الیکشن کے ذریعے ایران میں برسرِ اقتدار آ سکتے تھے؟ قطعاً ناممکن! خدا کے لیے اپنے آپ کو دھوکہ دینا چھوڑ دو۔ آج پوری امت عذابِ الٰہی سے صرف اسی صورت میں نکل سکتی ہے کہ کم از کم کسی ایک ملک میں اللہ کے دین کو قائم کر کے پوری دنیا کو دعوت دے سکے کہ آؤ دیکھو' یہ ہے اسلام! اس کی برکتیں دیکھو —— اس کی سعادتیں دیکھو —— یہاں کی مساوات اور یہاں کا بھائی چارہ دیکھو —— یہاں کی آزادی دیکھو —— یہاں کا امن و امان دیکھو!! اگر ہم یہ نہ کر سکے تو پھر اللہ کا عذاب سخت سے سخت تر ہوگا۔ ع ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا!'' عذاب کی شدت بڑھے گی' گھٹے گی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر عالمِ عرب پر عذابِ خداوندی کے کوڑے برسیں گے۔ اس لیے کہ ان پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہوا تھا۔ رسولِ

عربی محمد رسول اللہ ﷺ ان میں سے تھے ع ''یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!'' پھر یہ کہ ان کی زبان میں اللہ نے اپنی آخری کتاب نازل فرمائی۔ ہم تو چٹائی توڑ تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی سیکھ کر قرآن کو سمجھ سکتے ہیں' لیکن ان کی یہ مادری زبان ہے۔

بہر حال پاکستان کی بقا اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے۔ یہی اس کی وجہ جواز ہے۔ ورنہ پاکستان کا حال تو اس وقت یہ ہے جیسے سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب کسی پر نزع کا عالم ہوتا ہے اور اس کے رشتے دار کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ جا رہا ہے' لیکن بے بس ہوتے ہیں —— فرمایا: ﴿فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٨٧﴾﴾ ''پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو؟'' اسی طرح میں کہہ رہا ہوں کہ یہ پاکستان جا رہا ہے۔ پھر آپ کے محل آپ کے نہیں' کسی اور کے ہوں گے۔ آپ کی ملیں' آپ کے کارخانے کسی اور کے ہوں گے ع ''دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!'' اگر یہاں اسلام نہ آیا تو پاکستان کو باقی رہنے کا حق حاصل نہیں رہے گا۔ میں نے ''موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام اور پاکستان کا مستقبل'' کے جامع عنوان کے تحت دو تقریریں کی تھیں —— (۱) موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل (۲) کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟ اور کیا ابھی نجات کی کوئی راہ کھلی ہے؟ —— نجات کی واحد راہ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظام لایا جائے۔ لیکن اس کی خواہش اور جذبہ رکھنے والوں کے سامنے چونکہ طریق کار واضح نہیں ہے لہٰذا وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

میں نے سیرتِ نبویؐ سے استفادہ کرتے ہوئے' اس سے استنارِ نور کرتے ہوئے آپ کے سامنے وہ طریق انقلاب رکھ دیا ہے کہ اس کو اختیار کریں گے تو کامیابی کا امکان ہے' ورنہ آپ کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ پر' کامیابی ممکن نہیں!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

ختمِ نبوّت کے دو مفہوم
اور
تکمیلِ رسالت کے عملی تقاضے

ترتیب

❁ ختمِ نبوت کے دو مفہوم 474

❁ ختمِ نبوت کے قانونی تقاضے 480

❁ تکمیلِ نبوت کے دو مظاہر 483

❁ ختمِ نبوت کے خلاف غلام احمد قادیانی کی دلیل
اور اس کی تردید! 488

❁ تکمیلِ رسالت کے دو مظاہر 493

❁ معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم! 500

❁ تکمیلِ رسالت کا منطقی نتیجہ 501

❁ تکمیلِ رسالت کا تشنہ تکمیل مظہر 504

❁ پس چہ باید کرد؟ 508

❁❁❁

’’ختمِ نبوت کے دو مفہوم اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے‘‘ کے موضوع پر بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا زیر نظر خطاب ۲۳/جون ۲۰۰۲ء کو لاہور کے الحمرا ہال نمبر 1 میں ہوا۔ سامعین کی کثرتِ تعداد کے باعث یہ وسیع و عریض شاندار ہال اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگ دامانی پر شکوہ سنج نظر آ رہا تھا۔ بانی تنظیم کا یہ مفصل خطاب قریباً دو گھنٹوں پر محیط تھا۔ (مرتب)

خطبۂ مسنونہ‘ قرآنی آیات کی تلاوت اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا:

معزز حاضرین اور محترم خواتین! آپ کے علم میں ہے کہ آج ہماری گفتگو کا عنوان اور موضوع نہایت اہم بھی ہے اور کسی قدر طوالت طلب بھی۔ آج کی اس نشست کے لیے جو ہینڈ بل شائع ہوا ہے اس میں مَیں نے ذیلی عنوانات بھی معین کر دیے ہیں تاکہ آپ کے سامنے بھی یہ رہے کہ آج کن کن موضوعات پر کن کن عنوانات کے تحت گفتگو ہونی ہے۔ وہ ذیلی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ختمِ نبوت کے دو مفہوم
۲) ختمِ نبوت کے قانونی تقاضے
۳) تکمیلِ نبوت کے دو مظاہر
۴) ختمِ نبوت کے خلاف غلام احمد قادیانی کی دلیل اور اس کی تردید
۵) تکمیلِ رسالت کے دو مظاہر
۶) معراجِ انسانیت کا مظہرِ اَتم
۷) تکمیلِ رسالت کا منطقی تقاضا‘ جو ابھی تشنۂ تکمیل ہے‘ اور اس ضمن میں اُمت کی ذمہ داری — اور اس اعتبار سے پاکستان اس وقت فیصلہ کن دوراہے پر۔

اور آخری عنوان ہو گا ’’پس چہ باید کرد؟‘‘ یعنی ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ عنوانات سے آپ کو

اندازہ ہوا ہوگا کہ بات کافی طوالت طلب ہے۔ میں نے ان موضوعات پر علیحدہ علیحدہ گفتگوئیں مختلف مواقع پر کئی بار کی ہیں' اپنے خطاباتِ جمعہ اور خطاباتِ عام میں بھی ان موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے' لیکن ایک جامع (compact) انداز میں اس پورے موضوع کو سمو لینے کی آج جو ہمت اور کوشش کر رہا ہوں اس کے لیے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر رہا ہوں کہ اس کی ہمت اور توفیق سے میں ان تمام موضوعات کو آج ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) میں سمو کر آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اور یہ اسی طریقے سے ممکن ہوگا کہ نہ تو بہت زیادہ تفاصیل میں جایا جائے اور نہ ہی خطابت کا انداز اختیار کیا جائے بلکہ سائنٹیفک انداز میں جیسے یہ عنوانات مرتب ہو گئے ہیں اسی انداز میں ان کی وضاحت کی جائے۔

۱) ختمِ نبوت کے دو مفہوم

اب آیئے سب سے پہلی بات کی طرف۔ ختمِ نبوت کے یہ دو مفہوم کیا ہیں' اس کو آپ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری اپنی زبان اردو میں بھی ختم کے دو مفہوم ہیں۔ مثلاً ''پیسے ختم ہو گئے'' یعنی پہلے پیسے تھے' اب نہیں رہے۔ کسی شے کا پہلے وجود تھا' اب نہیں ہے۔ یا پنجابی میں کوئی کہے کہ ''دانے مک گئے'' یعنی پہلے گندم یا کوئی اور جنس تھی' اب نہیں ہے۔ یہ ختمِ نبوت کا ایک مفہوم ہے کہ وہ نبوت جو حضرت آدم علیہ السلام سے چلی آ رہی تھی (اس لیے کہ پہلے نبی حضرت آدمؑ تھے) وہ ختم ہو گئی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں۔ لیکن ختم کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے سکول کا طالب علم کہتا ہے: ''میں نے اپنا ہوم ورک ختم کر لیا''۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنا کام مکمل کر لیا' پورا کر لیا۔ ختم کا یہ دوسرا مفہوم ہے جس کی رو سے نبوت اور رسالت حضور ﷺ پر کامل ہوئی۔

ذرا نوٹ کیجیے' پہلا مفہوم اپنی جگہ پر ایک واقعہ ہے' حقیقت ہے' لیکن اس میں فضیلت کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ایک زنجیر چلی آ رہی تھی' آتے آتے ختم ہو گئی' تو اس کی آخری کڑی میں فضیلت کا کیا مفہوم ہوا؟ اس اعتبار سے حضور ﷺ کی عظمت کا کوئی پہلو سامنے نہیں آتا۔ بلکہ آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ نبوت رحمت ہے' نبوت تو نوعِ

انسانی کی ہدایت کا ایک سلسلہ تھا۔ چنانچہ جہاں سے وہ شروع ہوئی اس کی فضیلت زیادہ ہونی چاہیے بنسبت اس کے کہ جہاں آ کر وہ ختم ہوگئی۔ میری بات کو دوبارہ نوٹ کیجئے کہ اپنی جگہ پر یہ واقعہ ہے' لیکن اس اعتبار سے حضور ﷺ کی عظمت کا کوئی انکشاف نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ کی عظمت اور فضیلت کا پہلو تو اس اعتبار سے ہے کہ نبوت آپ پر کامل ہو گئی' رسالت کی آپؐ پر تکمیل ہوگئی۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں قرآن مجید اور حدیث شریف میں حضور ﷺ کے ضمن میں خاص طور پر تکمیل' اِکمال' اِتمام اور تتمیم جیسے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ''آج کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا''۔ ﴿وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ ''اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام فرما دیا''۔ ﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳) ''اور اب (قیامت تک کے لیے) اسلام کو تمہارے لیے بطورِ دین پسند کر لیا''۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (الصف) ''اللہ اپنے نور کا اِتمام فرما کر رہے گا چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اور ﴿وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (التوبہ) ''اللہ کو ہرگز یہ منظور نہیں مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اِتمام فرما کر رہے گا' چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) ''مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اخلاق کے جو بلند مقامات ہیں ان کا اِتمام کر دوں''۔ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اِکمال' تکمیل' اتمام اور تتمیم' یہ الفاظ کثرت کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت اور آپؐ کی بعثت کے ضمن میں آ رہے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی اصل فضیلت اسی اعتبار سے ہے اور آپؐ کی نبوت کی عظمت کا انکشاف اسی پہلو سے ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایسا نہیں ہے کہ ایک فصیل جس کی اونچائی برابر تھی چلی آ رہی تھی اور ایک جگہ آ کر ختم ہوگئی۔ یہ ختم نبوت کا پہلا مفہوم ہے۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ ایک چیز تدریجاً ترقی کرتے کرتے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی اور ختم ہوگئی۔ ان دونوں میں

زمین آسمان کا فرق ہے۔

ختمِ نبوت کا جو پہلا مفہوم ہے اس کی قانونی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد اگر کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو وہ کذاب' دجال' جھوٹا اور کافر ہے' اور جس کسی نے بھی اس کی تصدیق کی' اس کو مان لیا وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج اور مرتد شمار ہوگا۔ یہ اس کی قانونی اہمیت ہے۔ کوئی شخص مسلمان رہا یا نہیں رہا' یہ تو بڑا اہم مسئلہ ہے جس کی حیثیت قانونی ہے۔ اگر کسی نے حضور ﷺ کے بعد کسی نبی کی نبوت کا اقرار کر لیا یا خود اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تو وہ مرتد ہے' واجب القتل ہے' اس کی بیوی کا اس سے نکاح ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کے اس مفہوم پر علماء کرام نے بڑی تفصیل سے گفتگوئیں اور تقاریر کیں' خطبات دیئے' اور تصانیف تحریر کیں۔ اس موضوع پر مولانا سید انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کی کتاب میرے نزدیک حرفِ آخر ہے' جس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

ختمِ نبوت کا دوسرا مفہوم کہ حضور ﷺ پر نبوت اور رسالت کی تکمیل ہوئی ہے' چونکہ اس کی کوئی قانونی اہمیت نہیں تھی لہٰذا اس پر کماحقّہٗ توجہ نہیں ہوئی۔ اس پہلو کو نمایاں کرنا درحقیقت میری آج کی گفتگو کا اصل موضوع ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ علماء کرام کی تقاریر میں ختم نبوت پر گفتگو ہوتی ہے تو قرآن مجید کی یہی ایک آیت پیش کی جاتی ہے: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب: ۴۰) ''(اے مسلمانو! حضرت) محمد (ﷺ) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں' مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی مہر ہیں''۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اگر حضور ﷺ نے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا تو واضح کیا جا رہا ہے کہ منہ بولا بیٹا کوئی حقیقت نہیں رکھتا' ورنہ آپؐ کسی مرد کے والد نہیں ہیں —— آپ کو اللہ تعالیٰ نے ابتدا میں بیٹے دیے بھی لیکن وہ جلد ہی فوت ہو گئے۔ آپ ﷺ کی عمر کے آخری دور میں بھی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی' وہ بھی بچپن ہی میں فوت ہو گئے لیکن آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کی مہر ہیں۔ یعنی مہر لگ گئی اور یہ راستہ بند ہو گیا۔

یہاں سے اب کسی اور نبوت کے اِجرا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

غور کیجیے کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے۔ عرب میں ہمیشہ سے ایک رواج چلا آ رہا تھا اور یہ ان کی تہذیب و ثقافت کا جزوِ لازم تھا کہ کسی کا اگر مُنہ بولا بیٹا ہے اور اس کا انتقال ہو گیا یا اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو مُنہ بولے بیٹے کی بیوہ یا مطلّقہ بیوی سے وہ شخص کبھی نکاح نہیں کر سکتا۔ وہ گویا حرامِ مطلق ہے۔ شریعت میں یہ حکم نہیں ہے۔ شریعت میں صُلبی بیٹے کی بیوی حرامِ مطلق ہے۔ وہ بیوہ ہو جائے یا مطلقہ ہو جائے تو باپ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ وہ محرماتِ ابدیہ میں سے ہے' لیکن منہ بولے بیٹے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ اس رسم کو توڑنے کے لیے اگر خود حضور ﷺ اس پر عمل نہ کرتے تو کسی طرح بھی یہ صورت ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت زینب ؓ کو جب زید بن حارثہ ؓ نے طلاق دے دی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کا حضور ﷺ کے ساتھ آسمان پر نکاح کر دیا۔ زمین پر یہ نکاح بعد میں ہوا ہے —— یہاں فرمایا کہ اب اگر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یہ کام (یعنی اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح) نہ کرتے تو اس غلط رسم کی اصلاح کی کوئی شکل نہ ہوتی' اس لیے کہ آپؐ کے بعد تو کوئی نبی آنے والا ہے نہیں۔ چنانچہ ختم نبوت کا جو قانونی مفہوم ہے اس کے اعتبار سے یہ متعلقہ آیت ہے' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن میں نے جو دوسری آیات تلاوت کی ہیں' وہ ختم نبوت کے دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اہم ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی فضیلت اور آپؐ کی عظمت والا مفہوم کہ آپؐ پر رسالت اور نبوت کی تکمیل ہوئی ہے۔ ان آیات پر گفتگو بعد میں ہو گی۔ پہلے میں چاہتا ہوں کہ ختم نبوت کے جو دو مفاہیم میں نے بیان کیے ہیں' ان کے اعتبار سے ہم بعض احادیثِ نبویہؐ کا مطالعہ کر لیں۔

(۱) جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں حضرت ثوبان ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ ثَلَاثُوْنَ كَذَّابُوْنَ' كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِیٌّ' وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ))

"میری اُمت میں تیس افراد ایسے اٹھیں گے جو کذاب (انتہائی جھوٹے) ہوں گے' ان میں سے ہر شخص اپنے بارے میں یہ گمان کرتا ہوگا کہ وہ نبی ہے' حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں' اب میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔"

اس حدیث میں اس قانونی مفہوم کو بہت ہی عمدگی کے ساتھ واضح کر دیا گیا کہ اگرچہ دجال اٹھیں گے' نبوت کے جھوٹے مدعی پیدا ہوں گے' لیکن میں آخری نبی ہوں۔ حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں مدعیانِ نبوت اٹھ گئے تھے' پھر اس دور میں تو ان کی رفتار بڑی تیز ہو گئی ہے' آخری زمانہ آ رہا ہے' تیس کی تعداد اب پوری ہونی ہے۔ بہاء اللہ ایران میں اٹھا' غلام احمد قادیانی ہندوستان میں اٹھا' ابھی آپ کے ہاں ایک یوسف کذاب سامنے آیا تھا جس کو ایک شخص نے ساہیوال جیل میں گولی ماردی ہے' وہ بھی کہتا تھا کہ میں محمد ہوں' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ...... پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ ملتان میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ وہ گرفتار کیا گیا ہے اور اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ یہاں حضور ﷺ نے فرما دیا کہ میری اُمت میں تیس افراد ایسے ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے مگر وہ جھوٹے ہوں گے' حقیقت یہ ہے کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

(۲) بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يُبْعَثَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ قَرِيْبٌ مِّنْ ثَلَاثِيْنَ كُلُّهُمْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ)) (متفق علیہ)

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تیس کے قریب ایسے افراد نہ اٹھا دیے جائیں جو دجال ہوں گے' کذاب ہوں گے' ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی اس مفہوم کی حدیث سنن ابی داؤد میں بایں الفاظ آئی ہے:

((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی يَخْرُجَ ثَلَاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ' كُلُّهُمْ يَزْعَمُ اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ))

''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تیس دجال ظاہر نہ ہو جائیں‘ جن میں ہر شخص یہ کہے گا اور سمجھے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔''

یہ تین حدیثیں ختمِ نبوت کا قانونی مفہوم دوٹوک انداز میں بیان کر رہی ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے۔ اس میں تکمیلِ نبوت کا تصور آ رہا ہے‘ یہ بڑی پیاری حدیث ہے۔ یہ حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کی سند بہت قوی ہے۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے‘ یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

((اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بُنْیَانًا‘ فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِیَةٍ مِنْ زَوَایَاهُ‘ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَیَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَیَقُوْلُوْنَ: هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ؟ قَالَ: فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ))

''یقیناً میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کی‘ اس نے اس عمارت کو بہت عمدہ اور خوبصورت بنایا‘ سوائے اس کے کہ اس کے کونوں میں سے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ پھر لوگ آ کر اس عمارت کے چکر لگانے لگے اور (اس کی خوبصورتی اور عظمتِ شان پر) تعجب کا اظہار کرنے لگے۔ اور لوگ کہتے: بھلا یہ اینٹ کیوں نہ لگائی گئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔''

مسلم کی ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں: ((فَاَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ‘ جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْاَنْبِیَاءَ)) ''پس اُس اینٹ کی جگہ (مکمل کرنے والا) میں ہوں‘ میں آیا تو میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا۔''

ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ((خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَخُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ)) ''میرے ذریعے سے اس عمارت (قصرِ رسالت) کی تکمیل ہو گئی اور مجھ پر رسولوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔''

اب یہاں محل اور محل میں ایک کمی اور اس کمی کا آپ ﷺ کے ذریعے پورا ہو جانا' یہ ہے تکمیلِ نبوت ورسالت کا معاملہ۔

۲) ختمِ نبوت کے قانونی تقاضے

ختم نبوت کا یہ پہلو کہ جس شخص نے بھی حضور ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہے یا کرے گا' وہ کذاب' دجال' جھوٹا' کافر مرتد اور واجب القتل ہے' یہ اس کا قانونی تقاضا ہے۔ چنانچہ عالمِ اسلام میں اس سے پہلے جب بھی کسی نے ایسا دعویٰ کیا تو جب تک مسلمانوں کی حکومتیں تھیں' ایسے افراد کو قتل کر دیا گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کے فوراً بعد مسیلمہ کذاب اور جو دوسرے بڑے بڑے مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے تھے' ان کے خلاف جہاد کیا گیا اور انہیں تہ تیغ کیا گیا۔ ایران میں بہاء اللہ اٹھا تو وہاں چونکہ مسلمانوں کی حکومت تھی لہٰذا اسے قتل کر دیا گیا۔ اب بھی کوئی بہائی ایران میں نہیں رہ سکتا' سب وہاں سے بھاگ چکے ہیں' کوئی وہاں آئے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کے وقت ہندوستان میں انگریز کی حکومت تھی' لہٰذا ہر شخص کو کھلی چھوٹ تھی۔ اکبر الٰہ آبادیؒ نے بڑے خوبصورت الفاظ میں وہ نقشہ کھینچا ہے:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں' وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر
''انا الحق'' کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

اگر اسلامی حکومت ہوتی یا مسلمان حکومت ہی ہوتی تو مرزا کو یہ جرأت نہ ہوتی۔ مسلمان حکومتوں کے دوران جس نے ''انا الحق'' کہا (منصور) وہ سولی چڑھا دیا گیا اور جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا وہ قتل کر دیے گئے' لیکن یہاں انگریز کی حکومت تھی' جس میں کھلی چھوٹ تھی کہ چاہو تو خدائی کا دعویٰ کر دو' نبوت کا دعویٰ کر دو' رسالت کا دعویٰ کر دو' کوئی پوچھنے والا نہیں' کوئی پکڑنے والا نہیں' کسی دار و گیر کا کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ اسی زمانے میں غلام احمد قادیانی نے ایک دعوتی خط امیرِ کابل کو لکھا کہ وہ اس کی نبوت پر

ایمان لائیں۔ جب وہ خط وہاں پہنچا تو امیرِ کابل نے اسی خط پر دو الفاظ لکھ کر خط واپس کر دیا: ''ایں جا بیا!'' یعنی ذرا یہاں آ ؤ! یہاں آ کر تم نبوت کا دعویٰ کرو تو پتا چل جائے کہ کس بھاؤ بکتی ہے۔ تم انگریز کی چھتری تلے بیٹھے ہوئے دعوے کر رہے ہو اور انگریز تمہاری پشت پناہی کر رہا ہے۔ تم نے جہاد کو ختم کر دیا' حرمتِ قتال کا فتویٰ دے دیا۔ انگریز کو اور کیا چاہیے؟ Glad Stone جبکہ برطانیہ کا وزیر اعظم تھا' اُس نے اپنی پارلیمنٹ میں قرآن کو لہرا کر کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب موجود ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا' یہ تو جہاد اور قتال کی بات کرتی ہے۔ تو انگریز کو اور کیا چاہیے تھا کہ اگر کوئی اس قتال کو منسوخ کر دے اور مسلمانوں میں سے جذبہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کو نکال دے تو اس سے بڑی اور کیا خدمت ہو گی! امیر کابل کے دو لفظی جواب میں یہ پیغام مضمر تھا کہ اگر تمہیں یہ دعوت دینی ہے تو ذرا یہاں آ کر مجھے دعوت دو تا کہ تمہارے چودہ طبق روشن ہوں اور تمہیں معلوم ہو کہ اس دعویٰ کرنے کا مطلب کیا ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پر اللہ کا بڑا کرم ہوا تھا کہ اس ملک میں ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار پانے کا فیصلہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت ہی مبارک فیصلہ تھا۔ اس کے لیے جو تحریک اٹھی وہ بھی بہت ہی عمدہ تھی' بہت پُر امن تھی' بہت منظم تھی۔ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ اس کے قائد تھے۔ کوئی سیاسی لیڈر اس میں نمایاں نہیں تھا' خالص دینی تحریک تھی۔ پھر اُس وقت ہمارے ہاں حکمران ذوالفقار علی بھٹو تھا جو خالص سیکولر ذہن کا آدمی تھا' اور قادیانیوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اس کی حمایت کی تھی۔ قادیانی سمجھتے تھے کہ وہ تو ہمارا اپنا آدمی ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھوں بہترین طریقے سے' جس پر اعتراض کیا ہی نہیں جا سکتا' پارلیمنٹ کے ذریعے سے فیصلہ کرایا۔ کوئی آرڈی نینس' کوئی حکم یا فرمان جاری نہیں ہوا تھا۔ پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور قادیانیوں اور لاہوریوں کو اپنا موقف کھل کر پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ ان دونوں گروہوں کے سرکردہ لوگوں نے اس کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر بیانات دیے اور وضاحت سے اپنا موقف بیان کیا۔ اُس وقت ان کا خلیفہ مرزا طاہر احمد کا غالباً بڑا بھائی

مرزا ناصر احمد تھا' اس نے کہا کہ غلام احمد قادیانی کو ہم ڈنکے کی چوٹ پر نبی مانتے ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ یہ غیر مسلم ہیں۔

یہ ایک صحیح فیصلہ تھا' لیکن یہ فیصلہ ادھورا تھا۔ اس لیے کہ اس فیصلے سے قادیانیت کے فتنے کو کوئی گزند نہیں پہنچا ہے۔ غیر مسلم قرار دیے جانے کے فیصلے کے باوجود وہ فتنہ جوں کا توں پنپ رہا ہے' جوں کا توں پھیل رہا ہے اور اپنے سرطان کی جڑیں ہمارے معاشرے میں پھیلا رہا ہے۔ ویسے تو عالمی سطح پر انہیں بڑی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے' پوری مغربی دنیا ان کی سرپرستی کر رہی ہے' لیکن اندرونِ ملک بھی اس فتنے کا قلع قمع اگر ہوسکتا تھا تو صرف اُس وقت جبکہ اس فیصلے کا جو قانونی اور منطقی تقاضا ہے' وہ بھی پورا کیا جاتا' اور وہ یہ کہ مرتد کی سزا قتل نافذ کی جاتی۔ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدعیانِ نبوت سے قتال کیا گیا' اور اسلامی تاریخ میں جتنے بھی لوگوں نے نبوت کے دعوے کیے انہیں ہمیشہ قتل کیا گیا۔ لہٰذا مرتدین کی سزا قتل جب تک نافذ نہیں ہوگی' اس فتنے کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا' بلکہ وہ تو اس فیصلے کے بعد اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں اور دنیا کے سامنے مظلوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آپ جتنے چاہیں آرڈی نینس نافذ کرلیں لیکن وہ سارے اسلامی شعائر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مسجد کی شکل نہیں بنا سکتے' ماڈل ٹاؤن میں ایک بڑی کوٹھی کے اندر اُن کا جمعہ ہوتا ہے' ان کے عید کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ وہ سارے شعائر اسلامی کو استعمال کر رہے ہیں اور الٹا مظلومیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے' جیسے دنیا میں یہودیوں نے Holocaust کی مظلومیت کا لبادہ اپنے اوپر اوڑھا ہوا ہے کہ ہم جو چاہیں نوعِ انسانی پر ظلم کرلیں یہ ہمارا حق ہے' اس لیے کہ ہم نے Holocaust کی صورت میں بہت بڑا ظلم سہا تھا۔ جرمنوں نے ہمارے ساٹھ لاکھ آدمی ختم کر دیے تھے' تو ہم اگر آٹھ' دس لاکھ فلسطینی اور دوسرے مسلمانوں کو قتل کر دیں گے تو کون سی بڑی بات ہے؟ اسی طرح قادیانیوں نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس روز بھی یہ فیصلہ ہوا' ساتھ ہی واضح کر دیا جاتا کہ آج کی اس تاریخ سے پہلے پہلے جو

قادیانی ہیں وہ تو اقلیت قرار پائیں گے‘ لیکن اس فیصلے کے نفاذ کے بعد جو شخص بھی قادیانیت اختیار کرے گا اس پر قتلِ مرتد کی حد جاری کی جائے گی۔ جب تک یہ نہیں ہوگا اس فتنے کا استیصال تو دور کی بات ہے‘ اس کو کوئی گزند بھی نہیں پہنچ سکتا۔

۳) تکمیلِ نبوت کے دو مظاہر

محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کامل ہوئی اور آپ ﷺ پر رسالت کامل ہوئی‘ ان دونوں باتوں کو اب میں علیحدہ علیحدہ بیان کر رہا ہوں‘ ذرا اس کو سمجھ لیجیے۔ دراصل نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ ہر رسول لازماً نبی بھی ہے‘ مگر ایسا نہیں کہ ہر نبی لازماً رسول بھی ہو۔ نبی اور رسول میں فرق کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں کہ اس فرق کی بنیاد کیا ہے‘ یہ میرا اس وقت کا موضوع نہیں ہے‘ لیکن جو شخص نبی بھی ہے اور رسول بھی اس کی شخصیت میں جو دونوں چیزیں جمع ہو گئیں ان کی باہمی نسبت کیا ہے؟ دیکھئے نبوت اللہ سے لینے والا پہلو ہے۔ یعنی اللہ سے receive کرنا‘ وحی حاصل کرنا‘ وحی کو وصول کرنا‘ یہ نبوت ہے۔ جبکہ رسالت ہے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا‘ عوام تک ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کر دینا۔ تو ایک پہلو نبوت ہے‘ دوسرا پہلو رسالت ہے۔ نبوت وہ کھڑکی ہے جہاں سے وحی آ رہی ہے اور اس کو اللہ کا نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) وصول کر رہا ہے۔ اب اس کا کام بحیثیت رسول اس وحی کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ﴾ ”اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ بھی نازل کیا گیا ہے آپؐ پر آپؐ کے ربّ کی طرف سے“ ﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧) ”اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو پھر آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔“

نبوت کی تکمیل کے دو مظاہر ہیں اور اس کے لیے میرے نزدیک قرآن مجید کی جو متعلقہ (relevent) آیت ہے وہ الفاظ قرآن میں تین مرتبہ آئے ہیں‘ سورۃ التوبۃ میں‘ سورۃ الفتح میں اور سورۃ الصف میں: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر‘ تاکہ اسے کل جنسِ دین پر غالب کر دے“۔ یہاں

قرآن حکیم کے لیے ''الہدیٰ'' کا لفظ آیا ہے' یعنی The Total Guidance, The Final Guidance. اور ''الہدیٰ'' اور ''دین الحق'' کے درمیان حرفِ عطف ''وَ'' آیا ہے۔ یعنی یہ دو چیزیں الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا۔ کس لیے بھیجا؟ ﴿لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ﴾ تاکہ وہ غالب کر دے اسے تمام ادیان پر' تمام نظاموں پر' پورے کے پورے جنس دین پر۔ اس کے بعد دو جگہ ﴿وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی ''خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسند ہو''۔ اور ایک جگہ آیا: ﴿وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا﴾ ''اور اللہ کافی ہے بطورِ گواہ (یا بطورِ مددگار)''۔

حضور ﷺ کو جو دو چیزیں دی گئیں' الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق' نوٹ کیجیے کہ یہ دونوں چیزیں ابتدا سے چلی آ رہی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جب زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا تو ساتھ ہی فرما دیا گیا: ﴿فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾﴾ (البقرۃ) ''پھر جو بھی تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہوگا''۔ تو ہدایت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ شروع ہوگیا' لیکن جیسے جیسے بحیثیت مجموعی نوعِ انسانی کے شعور نے ترقی کی' ذہنی اور فکری سطح بلند ہوئی ویسے ہی اس ہدایت کے اندر بھی ارتقا ہوتا چلا گیا۔ ظاہر بات ہے کوئی بچہ اگر پرائمری کا طالب علم ہے اور آپ اس کے لیے پی ایچ ڈی ٹیچر رکھ دیجیے تو کیا وہ اسے پی ایچ ڈی کی تعلیم دے گا؟ یا ایم اے کا نصاب پڑھائے گا؟ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ ابھی عہد طفولیت میں ہے اور اس کے لیے ایک خاص حد سے آگے بات کا سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ تو نوعِ انسانی جب تک عہدِ طفولیت میں تھی ہدایت بلکہ ہدایات آتی رہیں کہ یہ کرو' یہ نہ کرو۔ نوٹ کیجیے' میں یہاں ''ہدایت'' کی جگہ ''ہدایات'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ تورات ''احکامِ عشرہ'' (Ten Commandments) پر مشتمل تھی کہ یہ dos ہیں اور یہ donts ہیں' یہ تمہیں کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ جب تک نوعِ انسانی شعور کے اعتبار سے' اپنے فلسفیانہ فکر کے اعتبار سے' اپنے ذہن اور شعور

کی ارتقائی منازل کے اعتبار سے پختہ کار(mature) نہیں ہوگئی تو اس عبوری دَور (interim period) کے لیے ہدایات آتی رہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، لیکن جب نوعِ انسانی شعور کے اعتبار سے بلوغ کو پہنچ گئی تو اسے ہدایات کے بجائے ہدایتِ کاملہ عطا کر دی گئی۔

تاریخ اور فلسفہ کے ماہرین خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ نوعِ انسانی کا فلسفیانہ شعور (Philosophical Consciousness) بارہ سو سال میں ترقی کی منازل طے کرتا ہوا اپنے بلوغ کی منزل کو پہنچا ہے۔ یہ دَور ۶۰۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۶۰۰ بعد مسیح پر ختم ہو گیا۔ سارے کے سارے فلسفے انہی بارہ سو سالوں میں پیدا ہوئے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو بھی اسی دَور میں پیدا ہوئے اور گوتم بدھ، مہاویر، کنفیوشس اور تاؤ نے بھی اسی دَور میں جنم لیا۔ اس بارہ سو سالہ دَور میں انسان کا ذہنی، خاص طور پر فلسفیانہ شعور اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے پختگی (maturity) کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا۔ یادش بخیر پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ کا ذکر کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے، جب میں کرشن نگر میں پریکٹس کرتا تھا تو وہ شام کو میرے پاس آکر بیٹھ جایا کرتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ پھلجھڑیاں ہوتی تھیں جو اُن کے منہ سے نکلتی تھیں، جو گویا فلسفیانہ اور تاریخی معلومات اور مذہبی مسائل کا ایک خزانہ تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا عجیب بات ہے ۶۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ بعد مسیح تک جتنے مذاہب اور جتنے فلسفے پیدا ہونے تھے ہو چکے، اس کے بعد کوئی نیا مذہب یا نیا فلسفہ دنیا میں نہیں آیا۔ یہ تو پرانی شراب ہے جو نئے لیبلوں کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔ اس پر میرا ذہن فوراً منتقل ہوا اور میں نے کہا: چشتی صاحب! اس کا تو پھر براہِ راست تعلق ختم نبوت کے ساتھ ہے! کہنے لگے: کیوں؟ میں نے کہا: جب انسان جو کچھ از خود سوچ سکتا تھا سوچ چکا تو پھر اسے ہدایتِ کاملہ سے نواز دیا گیا، اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ۶۰۰ عیسوی تک انسان کا فلسفیانہ شعور اپنی پختگی اور بلوغ کو پہنچ گیا تھا تو ۶۱۰ ء میں حضرت محمد ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا:

﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ① خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ② اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ ③ الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ④ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ ⑤﴾ (العلق) اور شاید

سیرت النبی ﷺ کا یہ پہلو بہت کم لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

اس ''اقرأ'' کی وحی کے آنے سے متصلاً قبل (مدت کا ہمارے پاس تعین نہیں ہے کہ کتنے مہینے یا کتنا لمبا عرصہ لگا ہے) حضور ﷺ غارِ حرا میں جو مراقبہ کیا کرتے تھے وہ کس چیز پر مشتمل ہوتا تھا؟ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کھانے پینے کا کچھ سامان کر دیتیں اور آپؐ غارِ حرا میں چلے جاتے اور وہاں کئی کئی روز دن رات قیام فرماتے۔ اس دوران آپ ﷺ کیا کرتے تھے؟ حدیث میں الفاظ آتے ہیں: یَتَحَنَّثُ فِیْهِ ''وہاں آپ عبادت کیا کرتے تھے''۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی عبادت؟ آپؐ اگر یہودیوں کے ہاں پیدا ہوتے تو یہودیوں والی عبادت کرتے اور عیسائیوں کے ہاں پیدا ہوتے تو عیسائیوں والی عبادت کرتے' لیکن آپؐ تو عرب کے اندر مکہ میں مشرکانہ ماحول میں پیدا ہوئے اور ظاہر بات ہے کہ مشرکین والی عبادت کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ آپؐ سلیم الفطرت انسان تھے اور آپؐ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ تو آپؐ کون سی عبادت کرتے تھے؟ شارحینِ حدیث نے اس کا حل نکالا ہے: کان صفة تعبّده فی غار حراء التفکر والاعتبار ۔ یعنی غارِ حرا میں حضور ﷺ کی جو عبادت تھی وہ غور و فکر اور سوچ بچار پر مشتمل تھی۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو پوری انسانی فلسفیانہ سوچ کے مراحل طے کرائے ہیں اور اس کے بعد وحیِ نبوت کا آغاز ہوا ہے: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ①﴾ یہ سارا مرحلہ اسی لیے تھا کہ حضور ﷺ اپنی سوچ اور غور و فکر سے' اپنی سلامتیٔ طبع' اپنی سلامتیٔ فطرت اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں غور و فکر کریں' تدبر کریں۔ اور اس کے نتیجے میں پھر آپؐ اس مقام پر پہنچے کہ ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ⑦﴾ (الضحیٰ) یعنی اے نبی ﷺ! ہم نے پایا آپ کو کہ آپ ہدایت کی تلاش میں سرگرداں ہیں' تو ہم نے آپؐ کو ہدایتِ کاملہ سے سرفراز فرما دیا۔

اب یہاں ایک اہم نکتہ نوٹ کیجیے۔ یہ ایک بہت اہم حقیقت ہے جو نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور نگاہوں کے سامنے آ جائے تو بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ کیا تورات اللہ کی کتاب نہیں تھی؟ اس میں تحریف کیوں ہوگئی؟ اگر اللہ نے

ضمانت ملی ہوتی کہ اس میں تحریف نہیں ہوسکتی تو کیا تحریف ہوسکتی تھی؟ کیا انجیل اللہ کی کتاب نہیں تھی؟ یقیناً تھی۔ اس میں تحریف کیوں ہوگئی؟ اس لیے کہ اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت کا ذمہ نہ لیتا تو کیا ہم اسے تحریف کے بغیر چھوڑ دیتے؟ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

قرآن کے ترجموں میں بھی تحریفیں ہوئی ہیں اور تفسیروں میں بھی ہوئی ہیں' ہاں ایک متنِ قرآن ہے جس میں تحریف نہیں ہوسکتی' اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹﴾ (الحجر) ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ'' کے الفاظ کا مصداق تورات بھی ٹھہرتی ہے' انجیل بھی اور زبور بھی۔ اللہ ہی نے سابقہ آسمانی کتب بھی نازل کی تھیں۔ خاص طور پر سورۃ المائدۃ کے ساتویں رکوع کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ﴾ ''ہم نے اتاری تھی تورات' اس میں ہدایت بھی تھی' نور بھی تھا''۔ پھر انجیل کے بارے میں بھی فرمایا: ﴿فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ﴾ ''اس میں ہدایت بھی تھی' نور بھی تھا''۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اللہ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ لے لیا؟ بلکہ میں ذرا لطیف انداز میں اس بات کو آپ کے ذہن کی گہرائیوں تک لے جانے کے لیے عرض کروں گا۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ سے شکوہ کریں کہ اے اللہ! ہم بھی تیری کتابیں تھیں' قرآن بھی تیری کتاب تھی' تو ہمارے ساتھ یہ سوتیلی بیٹیوں والا سلوک کیوں ہوا کہ آپ نے قرآن کو تو تحفظ دیا' ہمیں نہیں دیا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجیے' جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں' سابقہ کتب سماویہ کے نزول کے وقت ابھی ہدایت اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی' ابھی اسے اپنے نقطۂ عروج اور نقطۂ کمال تک پہنچنا تھا۔ چنانچہ اس درمیانی عرصے کے لیے' عبوری دَور کے لیے جو ہدایات آ رہی تھیں ان کو مستقل

طور پر محفوظ کر دینے کی چنداں حاجت نہ تھی۔ جب وہ کامل اور مکمل ہدایت آ گئی اور ہدایت کی تکمیل ہو گئی تو اب یہ ہدایت ''ھُدًی'' نہیں رہی ''اَلْھُدٰی'' (The Guidance) ہو گئی۔ اب اس کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا۔

ختم نبوت کے خلاف غلام احمد قادیانی کی دلیل اور اس کی تردید

ایک قادیانی سے جب میں نے اس معاملے پر بحث کی تو سورۃ البقرۃ میں وارد شدہ الفاظ ﴿فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ﴾ کے مصداق وہ میری دلیل کے آگے بالکل مبہوت ہو کر رہ گیا اور اس کے لیے دائیں بائیں بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ دیکھئے غلام احمد قادیانی نے اپنے فتنے کا آغاز کہاں سے کیا تھا۔ یہ سمجھ لیجئے' پہلے وہ ایک بہت اچھا مناظر تھا۔ اس نے آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کیے' جن میں فتح حاصل کی اور نتیجتاً مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا' محبوب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک شوشہ چھوڑا کہ نبوت اور وحی تو رحمت ہیں' رحمت بند کیسے ہو سکتی ہے؟ وحی تو انسانوں کی ہدایت کے لیے ہے' انسان ختم نہیں ہوئے تو وحی کیسے ختم ہو گئی! دیکھئے بظاہر یہاں بات جی کو لگتی ہے۔ یہیں سے آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا کہ بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس فتنے کا شکار کیونکر ہو گئے۔ دنیا میں ایک ہی مسلمان نام کا سائنس دان ٹاپ پر آیا ہے' اور وہ قادیانی ہے۔ ایک ہی مسلمانوں کا نام رکھنے والا انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس ہیگ کا جج بنا ہے' وہ بھی قادیانی ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹرز اور انجینئرز قادیانی ہیں ـــــ آخر کیوں؟ یہ بات ایسی تھی جو بظاہر دل کو اپیل کرتی ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے وحی کا راستہ کھولا گیا تھا' ابھی انسان ختم نہیں ہوئے' وحی کا دروازہ کیسے بند ہو جائے گا؟ پہلے اجراءِ وحی کا شوشہ چھوڑا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اگر وحی جاری ہے تو نبوت بھی جاری ہے۔ لہٰذا پھر اُس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے عوام الناس کی نفسیات کو متاثر کرنے کے لیے ایک اور شوشہ چھوڑا کہ دیکھو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ فوت بھی ہو گئے اور زیر زمین دفن ہیں جبکہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے اور وہ آسمان پر ہیں! اس سے تو گویا ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم حضرت

محمد ﷺ سے افضل ہو گئے! حالانکہ افضلیت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اصحابِ کہف اگر ۳۰۰ برس تک سوتے رہے تو اس میں کون سی افضلیت کی بات ہے! اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ۱۰۰ برس تک مُردہ رکھ کر دوبارہ زندہ کر دیا تو اس میں افضلیت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کی قدرت ہے‘ اللہ ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن مرزا قادیانی نے عام آدمی کو گمراہ کرنے کے لیے ایسے شوشے چھوڑے اور کہا کہ نہیں نہیں‘ غلط ہے‘ یہ مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں‘ رفعِ مسیح قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہے‘ حدیثوں کے اندر ہے‘ اور حدیثوں کے بارے میں ہم اطمینان نہیں کر سکتے کہ حضرت مسیحؑ سولی نہیں چڑھائے گئے۔ مرزا کے بقول وہ سولی چڑھائے گئے‘ لیکن فوت نہیں ہوئے‘ البتہ زخمی ہونے کے بعد صلیب سے اتار لیے گئے تھے‘ پھر ان کا علاج معالجہ ہوا‘ پھر وہ علاقہ چھوڑ کر کشمیر میں آ گئے‘ یہاں آ کر ان کا انتقال ہو گیا اور یہاں دفن ہوئے‘ یہاں کشمیر میں ان کی قبر بھی موجود ہے۔ یہ دو ایشو ہیں جو اس شخص نے خصوصی طور پر اٹھائے اور اس طرح عوام الناس کو متاثر کیا۔

ابھی میں نے جس قادیانی کا ذکر کیا اس سے میں نے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ: کیا تم یہ مانتے ہو کہ اللہ کی ہدایت قرآن میں کامل ہو گئی؟ اس نے کہا: ہاں‘ ہم مانتے ہیں کہ ہدایت کامل ہو گئی۔ میں نے کہا: کیا تم یہ مانتے ہو کہ قرآن محفوظ ہے‘ اس میں تحریف نہیں ہوئی؟ اُس نے کہا: ہاں‘ ہم مانتے ہیں کہ قرآن محفوظ ہے‘ اس میں تحریف نہیں ہوئی۔ پھر میں نے کہا: مجھے منطقی وجہ بتاؤ کہ پھر اس وحی کی کھڑکی کو کھلے رکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ وہاں سے جو آنا تھا وہ مکمل ہو گیا‘ یعنی قرآن۔ ہاں‘ قرآن میں اگر تحریف ہو جاتی‘ اس کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا گیا ہوتا تو کسی نبی کی ضرورت تھی کہ جو آ کر اس کی تصحیح کرتا کہ یہ بات یوں نہیں‘ یوں تھی۔ منطقی اعتبار سے ایک جواز پیدا ہوتا ہے وحی اور نبوت کے جاری رہنے کا‘ بشرطیکہ ان دو باتوں میں سے کسی ایک کو مانا جائے —— یا تو یہ کہو کہ قرآن میں ہدایت مکمل نہیں ہوئی اور یا کہو کہ ہو تو گئی تھی لیکن قرآن گم ہو گیا یا قرآن کے اندر تحریف ہو گئی‘ یہ وہ اصل قرآن نہیں ہے۔ یہ دونوں باتیں نہیں مانتے تو مجھے بتاؤ کہ عقلی اور منطقی اعتبار

سے اس کھڑکی کو کھلے رکھنے کا کہاں کوئی جواز پیدا ہوتا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو بتایا' اس پر وہ قادیانی بالکل مبہوت ہو گیا کہ واقعتاً آپ کی دلیل بہت مضبوط ہے۔ تو تکمیلِ نبوت کا پہلا مظہر یہ ہے کہ وہ ہدایت' فلسفیانہ ہدایت' ایمان کی ہدایت' فکری اور نظری ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دینی تھی' وہ قرآن میں مکمل ہو گئی۔

تکمیل نبوت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ دین حق کی بھی تکمیل ہوئی ہے حضرت محمد ﷺ پر۔ جیسا کہ سورۃ المائدۃ میں آیا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (آیت ۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا''۔ لیکن تکمیل دین کا پس منظر بھی سمجھ لیجئے۔ جیسے انسان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل آئے ہیں' فلسفیانہ شعور میں ترقی ہوئی ہے اور ہوتے ہوتے وہ اپنے بلوغ اور پختگی کو پہنچا ہے' ایسے ہی انسان کے اندر تمدنی طور پر ارتقاء ہوا ہے۔ ایک دور وہ تھا جب ہمارے آباء واجداد غاروں میں رہتے تھے۔ کہیں کوئی سٹریٹ لائٹ کا سوال نہیں' کہیں کوئی سڑکوں کو صاف کرنے کا سوال نہیں' کہیں کسی کارپوریشن اور میونسپلٹی کا سوال نہیں۔ انفرادیت ہی انفرادیت تھی۔ میں اپنی غار کا مالک ہوں' جو چاہوں کروں' میرے اوپر کوئی قانون نہیں' کوئی قدغن نہیں۔ یہ نظام تھا۔ اجتماعیت تھی ہی نہیں' انفرادیت ہی انفرادیت تھی۔ پھر قبائلی نظام قائم ہوا کہ قبیلے کا ایک سردار ہے' اس کا حکم ماننا ہوگا۔ تم فلاں قبیلے سے ہو' اس قبیلے کی یہ روایات ہیں' تمہیں ان پر عمل کرنا ہوگا۔ اب جیسے جیسے اجتماعیت آنی شروع ہوئی انفرادیت کے اوپر قدغنیں لگنی شروع ہوئیں۔ یہ نہیں کہ جو چاہو کرو۔ تمہارا تعلق اس قبیلے کے ساتھ ہے' اس کی یہ رسم ہے' یہ ریت ہے' اس کا یہ رواج ہے' تمہیں اس کو پورا کرنا ہوگا' اور تمہارا جو شیخِ قبیلہ ہے' سردار ہے' اس کا حکم ماننا ہوگا۔

آگے چلیے! شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ دو' تین' چار قبیلے ایک شہر میں آکر آباد ہو گئے۔ ہر قبیلہ تو اپنی جگہ پر ایک اجتماعی یونٹ ہے' اس کا سردار ہے' اس کا کہنا سب مانتے ہیں' لیکن اب ان قبیلوں کے آپس کے معاملات کیسے طے ہوں گے؟ یہاں سے

دستور سازی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ کچھ اصول طے کیے جاتے تھے کہ ہمارے بین القبائلی معاملات ان اصولوں کے تحت ہوں گے۔ اب میں یہاں ایک مثال دیتا چلوں' حضورﷺ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ ایک قبیلے کا شہر تھا جہاں صرف قریش رہتے تھے' اور کوئی وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ یہاں یا قریشی رہے گا یا قریشی کا غلام رہے گا' وہ کوئی بھی ہو' یا قریشی کا حلیف رہے گا' یعنی باہر سے کوئی آئے گا تو کسی مکہ والے کا حلیف بن کر ٹھہر سکتا ہے' ورنہ نہیں۔ لیکن مدینہ منورہ سماجی ارتقاء کے ایک بلندتر درجے پر تھا۔ وہاں پانچ قبیلے آباد تھے۔ دو تو اصل عرب قبیلے (Sons of the soil) تھے: اَوس اور خزرج۔ تین یہودی قبائل تھے جو وہاں آ کر آباد ہو گئے تھے: بنو قریظہ' بنو قینقاع اور بنو نضیر۔ ان پانچوں قبیلوں کے آپس میں معاہدات تھے۔ اَوس کا قبیلہ چھوٹا تھا' خزرج کا بڑا تھا۔ (حضورﷺ نے بھی جب ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے تو نو خزرج میں سے تھے اور تین اوس میں سے۔) اَوس اور خزرج کے درمیان یہ طے تھا کہ اگر کوئی خزرجی کسی اَوسی کو قتل کر دے گا تو دیت ایک تہائی ہوگی' جبکہ اگر کوئی اَوسی کسی خزرجی کو قتل کر دے گا تو تین گنا دیت دینا ہوگی۔ یقیناً اَوسی نوجوان کا خون کھولتا ہوگا کہ کیا میرے خون اور میری جان کی قیمت اس خزرجی نوجوان کے مقابلے میں ایک بٹا تین ہے! لیکن اگر مدینے میں رہنا ہے تو اس اصول کو ماننا پڑے گا' یہ اصول یہاں طے ہو چکا ہے' اب تمہیں اس کی پابندی کرنی ہے۔

اس سے اگلا قدم کیا تھا! جیسے آپ افغانوں کو دیکھتے ہیں کہ افغان کا چہرہ تھوڑا اور پگڑ بہت بڑا ہوتا ہے' ایسے ہی جزیرہ نمائے عرب کے اوپر جو بہت بڑا پگڑ (Turban) ہے یہ شامِ عرب اور عراقِ عرب ہے۔ یہ بھی عرب ممالک ہیں۔ اس جزیرہ نما کے اوپر دو عظیم مملکتیں قائم تھیں' قیصر کی سلطنتِ روما اور کسریٰ کی سلطنتِ ایران۔ یہ تمدن کی آخری سٹیج تھی جبکہ حکومتیں بن گئیں' بادشاہتیں قائم ہو گئیں' محلات بن گئے' standing armies وجود میں آ گئیں۔ لاکھوں کی تعداد میں فوجیں ہیں' ٹیکس لگ رہے ہیں' دہقان محنت کر رہا ہے اور اس سے ٹیکس لیا جا رہا ہے' جاگیردار اپنا حصہ رکھ کر باقی بادشاہ کو پہنچاتا

ہے۔ کرگے پر بیٹھا ہوا کوئی شخص کپڑا بن رہا ہے تو اس سے بھی ٹیکس لیا جا رہا ہے۔ عوام کو ظلم وستم کی چکی میں پیسا جا رہا ہے اور بادشاہ عیش کر رہے ہیں' اونچے اونچے محلات بنا رہے ہیں۔ یہ زمانہ تھا جبکہ انسانیت پر ایسی پابندیاں لگیں کہ انسان مجبور و مقہور ہو کر رہ گیا۔ اس دَور میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے۔ اُس وقت تمدنی ارتقاء اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ اجتماعیت کا دَور دورہ تھا' انفرادیت پس گئی تھی' اس کی آزادیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اب بادشاہ تھا اور بادشاہ کا نظام تھا۔ عوام میں کہیں ذرا سی بھی بغاوت ہوتی تو سلطنتِ روما کے غرقِ آہن فوجی اسے بری طرح کچل دیتے تھے۔ اسی طرح ایرانی فوجی کسی کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتے تھے' اس وقت محمدؐ رسول اللہ ﷺ آئے اور آپؐ کو نوعِ انسانی کے لیے دین حق کی صورت میں ایک مکمل نظامِ حیات عطا کر دیا گیا کہ سماجی سطح پر یہ ہدایات ہیں' معاشی سطح پر یہ ہدایات ہیں اور سیاسی سطح پر یہ ہدایات ہیں۔ الغرض ایک مکمل Politico- Socio-Economic System کی حیثیت سے دین کو کامل کر کے حضرت محمد ﷺ کو عطا کر دیا گیا۔ حالانکہ دین ہمیشہ سے ایک تھا' موسیٰؑ کا دین بھی یہی تھا' عیسیٰؑ کا دین بھی یہی تھا' ابراہیمؑ کا بھی یہی تھا' نوحؑ کا بھی یہی تھا (علیہم الصلوٰۃ والسلام)۔ سورۃ الشوریٰ (آیت ۱۳) میں فرمایا:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ......﴾

سب کا دین ایک تھا' لیکن ابھی دین مکمل نہیں ہوا تھا۔ ابھی اجتماعیت محدود تھی' ابھی انفرادیت کا بول بالا تھا۔ ابھی ایک نظام کا تصور نہیں تھا۔ ابھی کوئی پولیٹیکل سسٹم وجود میں نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ standing armies کے دَور نہیں آئے تھے۔ وہ دَور جب آ گیا تو عدل وقسط پر مبنی ایک ''Politico-Socio-Economic System'' اسلام کی شکل میں' دین حق کی تکمیل کر کے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا گیا۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾

یہ تکمیلِ نبوت کے دو مظاہر ہیں۔ ایک یہ کہ ہدایت ''ھُدًی'' سے بڑھ کر

''الھُدٰی'' بن گئی۔ یعنی قرآن کی صورت میں کامل اور مکمل ہدایت عطا کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ دین کامل ہوگیا۔ یہ دونوں چیزیں حضور ﷺ پر اپنے عروج اور نقطۂ کمال کو پہنچ گئیں۔ چنانچہ اللہ سے لینے والا حصہ جو ہے یعنی وحی اور دین' دونوں کی تکمیل ہوگئی محمد رسول اللہ ﷺ پر۔

تکمیلِ رسالت کے دو مظاہر

نوٹ کیجئے! میں نے کہا تھا کہ نبوت اللہ سے لینے والا حصہ ہے اور رسالت دینے والا حصہ ہے۔ اس دینے والے حصے کے بارے میں فرمایا: ﴿لِیُظْھِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ تاکہ اسے غالب کردے کل کے کل دین پر' پورے نظامِ زندگی پر۔ اللہ کا دین ایک مکمل ''Politico-Socio-Economic System'' کی حیثیت سے قائم ہو' یہ رسالت کی تکمیل ہے۔ رسالت کا ایک درجہ تبلیغ ہے۔ بہت سے نبی ہیں کہ تبلیغ کرتے ہوئے ان کی پوری زندگی گزر گئی' کہیں کوئی نظام قائم ہوا ہی نہیں۔ نظام تو صرف محمدِ عربی ﷺ کے دستِ مبارک سے قائم ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں نہیں ہوا' حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں نہیں ہوا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں نہیں ہوا۔ تاہم تبلیغ کا حق انہوں نے ادا کر دیا' بات کو پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ایک ہے اتمامِ حجت۔ دین حق کے ضمن میں اتمامِ حجت یہ ہے کہ دین کو قائم کر کے اس کی عملی شکل دنیا کے سامنے پیش کرنا۔ ورنہ کتاب میں بہت اچھی باتیں لکھی جا سکتی ہیں کہ یہ یوں ہونا چاہیے' یہ ایسا ہونا چاہیے' اس کا یہ اصول ہونا چاہیے۔ آپ اپنے دماغ سے کام لیجئے' اعلیٰ سے اعلیٰ باتیں نکلیں گی' لیکن جب تک آپ اسے قائم کر کے اس کا نمونہ نہ دکھائیں' یہ ثابت نہ کریں کہ یہ قابل عمل ہے' یہ نافذ کیا جا سکتا ہے' اُس وقت تک وہ حجت اپنے درجہ اتمام کو نہیں پہنچ سکتی۔ افلاطون نے ایک کتاب لکھی تھی: ''The Republic''۔ اس میں اس نے نقشہ کھینچا کہ نظام ایسا ہونا چاہیے' حکومت ایسی ہونی چاہیے' فلاں معاملات ایسے ہونے چاہئیں۔ اور وہ کتاب' ایک کتاب کی حیثیت سے' اس قدر وقیع ہے کہ ۲۳۰۰ برس سے دنیا میں موجود ہے۔ ورنہ لاکھوں کتابیں چھپتی ہیں' ختم ہو جاتی ہیں' ان کا نام و

نشان تک نہیں رہتا۔ کتاب تو وہی باقی رہتی ہے جس کے اندر کوئی وزن ہو‘ جس میں کوئی ٹھوس مواد ہو۔ اور ’’Republic‘‘ آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ لیکن اس کتاب میں افلاطون نے جو نظام پیش کیا تھا وہ کہیں ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں ہوا۔ لہٰذا وہ حجت نہیں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یوٹوپیا ہے‘ ایک خیالی جنت کا نقشہ کسی نے کھینچ دیا ہے‘ لیکن یہ ہونے والی بات نہیں ہے بابا! کیا کہہ رہے ہو؟

اب میں بڑی سادہ سی مثال دے رہا ہوں۔ آنحضورﷺ کا ارشاد ہے: ((سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ)) ’’قوم کا سردار اس کا خادم ہوتا ہے‘‘۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ جی ہاں‘ بہت اعلیٰ بات ہے‘ بڑی اچھی شاعری کی ہے آپ نے‘ لیکن یہ ہونے والی بات نہیں ہے‘ سردار‘ سردار ہوتا ہے‘ خادم کیسے ہوگا؟ لیکن کیا محمد رسول اللہﷺ نے اس کا عملی نمونہ دکھا دیا یا نہیں؟ کیا خلیفہ وقت کی حیثیت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اٹھا کر اس خاندان کو نہیں پہنچائی جس کے بچے بھوک کی وجہ سے بلبلا رہے تھے؟ لاکھوں مربع میل کے اوپر اُن کا حکم چل رہا ہے اور اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اور دیگر سامانِ خورد و نوش اٹھا کر انہیں پہنچا کر آتے ہیں۔ غلام نے کہا بھی کہ حضور میں حاضر ہوں‘ مَیں لیے چلتا ہوں۔ فرمایا: نہیں‘ قیامت کے دن تم میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ رات کے وقت گشت کر رہے ہیں اور ایک گھر سے ایک عورت کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ عورت دردِ زِہ میں مبتلا ہے اور اس کی تیمارداری کرنے والی کوئی عورت‘ کوئی دایہ نہیں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ گھر جا کر خاتونِ اوّل یعنی اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر آئے اور آپؓ کی اہلیہ نے جا کر وہاں دایہ گیری کی۔ تو ’’سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ‘‘ کا نقشہ دکھا یا یا نہیں؟ اسی طرح انسانی مساوات کا نقشہ پیش کر کے دکھایا یا نہیں؟ بیت المقدس کا سفر ہو رہا ہے‘ سرکاری سفر ہے‘ کوئی پرائیویٹ سفر نہیں ہے‘ کوئی علاج معالجے کے لیے نہیں جا رہے‘ معاذ اللہ‘ بلکہ بیت المقدس کا چارج لینے کے لیے جا رہے ہیں‘ اور کس شان کے ساتھ کہ صرف ایک اونٹ اور ایک خادم ساتھ لیا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دستہ ہونا چاہیے‘ کوئی باڈی گارڈ ہونے چاہئیں۔ آج کل کہا جاتا ہے کہ کوئی

باقاعدہ گروہ ساتھ جانا چاہیے' جس کو Entourage کہا جاتا ہے۔ ایک خلیفہ وقت ہے' ایک ان کا خادم اور ایک اونٹ۔ چونکہ راستے کا راشن بھی اسی اونٹ پر ہے لہٰذا ایک وقت میں صرف ایک آدمی سوار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک منزل حضرت عمر رضی اللہ عنہ اوپر بیٹھتے ہیں اور خادم نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتا ہے۔ اگلی منزل میں خادم اوپر بیٹھتا ہے اور خلیفہ وقت نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتے ہیں۔ جب بیت المقدس میں پہنچے ہیں تو وہاں غلغلہ مچ گیا کہ "آ گئے عمر' آ گئے عمر رضی اللہ عنہ"۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اس محاذ کے سپہ سالار تھے' وہ استقبال کے لیے آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اونٹ کی نکیل پکڑے چلے آ رہے ہیں اور خادم اونٹ پر بیٹھا ہے' اس لیے کہ آخری منزل میں سوار ہونے کی باری اس کی تھی۔ حالانکہ اس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے کہ خدا کے لیے امیر المومنین' آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں' لوگ کیا کہیں گے! لیکن آپؓ نے فرمایا: اَلدَّوْرُ دَوْرُکَ۔ نہیں! اب باری تمہاری ہے۔ یہ حساب کا معاملہ ہے' تمہاری باری ہے' تم بیٹھو۔ راستے میں کہیں کیچڑ بھی تھا' لہٰذا جوتے اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس پہنچے ہیں تو ایک ہاتھ میں جوتے اٹھائے ہوئے ہیں اور ایک میں اونٹ کی نکیل پکڑ رکھی ہے۔ اِس دَور میں یہ کہانیاں معلوم ہوتی ہیں' اَن ہونی باتیں معلوم ہوتی ہیں' لیکن یہ مصدقہ تاریخی واقعات ہیں۔ یہ کوئی پانچ چھ ہزار سال پرانی بات نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کے اندر چودہ سو برس کیا ہوتے ہیں! یہ تمام تاریخ محفوظ ہے' ایک ایک چیز محفوظ ہے۔ تو محمد رسول اللہ ﷺ پر رسالت کی تکمیل اس درجے میں یوں ہوئی کہ جو دین حق آپؐ پر کامل ہو گیا' اسے آپؐ نے عملاً قائم کر کے اور نافذ کر کے دکھایا۔ یہ ہے درحقیقت تکمیلِ رسالت کا مظہرِ اوّل۔

تکمیلِ رسالت کا مظہرِ ثانی' جو میں بیان کرنے لگا ہوں' یہ معمولی بات نہیں' بلکہ بہت بڑی بات ہے اور سیرت کا یہ حصہ اکثر و بیشتر لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔ ہمارے ہاں میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں' سیرت کے جلسے ہوتے ہیں' حضور ﷺ کے مناقب بیان کیے جاتے ہیں' حضور ﷺ کی فضیلتیں بیان ہوتی ہیں' آپؐ کے گیسوؤں کی بات ہوتی ہے'

آپ ؐ کا سایہ تھا یا نہیں تھا' اس کی باتیں ہوتی ہیں' حالانکہ یہ سب باتیں غیر متعلقہ ہیں' جبکہ اصل سیرت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد خالص انسانی سطح (Human Level) پر کی ہے اور اس میں معجزات کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ ﷺ نے تکلیفیں جھیل کر' مصائب برداشت کر کے' فاقے جھیل کر' زخم جھیل کر' اپنا خون زمین پر گرتا ہوا دیکھ کر' اپنے ۲۵۹ جان نثاروں کی لاشیں دیکھ کر اور خاک وخون سے گزر کر یہ کام کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بس دعا مانگی اور بیڑا پار ہو گیا۔ تین برس کی شعب بنی ہاشم کے اندر نظر بندی کو یاد کیجئے۔ یہاں کی جیل میں کھانے کو تو ملتا ہے' وہاں کھانے کی بھی پابندی تھی۔ اس دوران ایسا وقت بھی آیا کہ بنو ہاشم کے پھول جیسے بچے بھوک سے بلکتے تھے اور اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ سوکھا چمڑا ابال کر اس کا پانی ان کے حلق کے اندر ٹپکا دیا جائے۔

اور طائف میں جو نقشہ پیش آیا ہے ؎

رسوا سر بازارے آں شوخ ستم گارے

اور ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے' سو گزری
تنہا پسِ زنداں' کبھی رسوا سرِ بازار!

طائف پہنچ کر آپ ﷺ نے وہاں کے تینوں بڑے سرداروں سے گفتگو کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایسے چبھنے والے جملے کہے جو کلیجے کو چیر دیتے ہیں۔ پھر آوارہ لڑکوں کو اشارہ کیا کہ ذرا ان کی خبر لو' یہ نبی بنے پھرتے ہیں' نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور وہ پتھراؤ شروع کر دیتے ہیں۔ ساتھ صرف ایک جان نثار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ سامنے سے آ کر روک بنتے ہیں' ڈھال بنتے ہیں تو پیچھے سے پتھر آ رہے ہیں۔ وہ پیچھے کی طرف جاتے ہیں تو سامنے سے پتھر آتے ہیں۔ جسمِ اطہر لہولہان ہو گیا ہے' خون بہہ بہہ کر جا کر جوتیوں میں جم گیا ہے۔ غشی طاری ہوئی ہے' آپ ؐ تھک کر بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آئے ہیں۔ ایک نے ایک بغل میں ہاتھ ڈالا' دوسرے نے دوسری بغل میں

ہاتھ ڈالا کہ اٹھو جاؤ۔ محمدِ عربیؐ ہیں‘ سیّد المرسلین ہیں‘ محبوبِ ربّ العالمین‘ سیّد الاوّلین والآخرین ہیں اور یہ نقشہ ہے۔ یہ ہے سیرت‘ جسے بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر حضور ﷺ کے قلب کی گہرائیوں سے جو دعا نکلی ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے۔ جب وہاں سے نکل کر باہر آئے اور ایک باغ میں تھوڑی سی دیر کے لیے ستانے کو بیٹھ گئے تو وہاں اب آپؐ نے مناجات کی ہے: ((اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ)) ’’اے اللہ! تیری جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں اپنے وسائل اور طاقت کی کمی کی‘ اور لوگوں کے سامنے جو رسوائی ہو رہی ہے اس کی‘‘۔ کہاں جاؤں‘ کس سے فریاد کروں؟ تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں۔ ((اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟)) ’’تو نے مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے؟‘‘ ((اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟)) ’’کیا دشمن کے حوالے مجھے کر دیا ہے کہ جو چاہے کر گزرے؟‘‘ ذرا اندازہ کیجیے! یہ الفاظ کہاں سے نکل رہے ہیں۔ لیکن پھر یہ فریاد کیا رخ اختیار کرتی ہے: ((اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ)) ’’پروردگار! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے‘‘۔ ؏ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

یہ میں نے سیرت کا ایک نقشہ دکھایا ہے۔ وحی کے آغاز کے بعد سے حضور ﷺ کی ۲۳ برس کی زندگی دن رات کی مشقت اور محنت سے عبارت ہے۔ جو نکتہ سمجھنے کا ہے‘ وہ کیا ہے! اس جدّوجہد میں معجزات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حضور ﷺ کا اصل معجزہ قرآن مجید ہے۔ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ کفارِ قریش کہتے تھے کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات ملے‘ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو معجزے ملے ایسا کوئی معجزہ دکھاؤ۔ اللہ کا فیصلہ تھا کہ نہیں دکھائیں گے‘ ہمارا معجزہ قرآن ہے! حضرت موسیٰؑ کے معجزوں کو دیکھ کر کون ایمان لے آیا تھا؟ کیا فرعون نے مان لیا تھا؟ کیا یہودی حضرت عیسیٰؑ کے معجزے دیکھ کر ایمان لے آئے تھے؟ ایسے معجزے جن سے بڑے حسّی معجزے ممکن ہی نہیں ہیں۔ مردے سے کہا جائے ’’قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ‘‘ اور وہ کھڑا ہو جائے‘ چلنا شروع کر دے‘ یا یہ کہ گارے سے ایک پرندے کی شکل بنائی‘ اس میں پھونک ماری اور وہ اڑتا ہوا پرندہ ہو گیا۔ احیائے

موتی اور تخلیقِ حیات سے آگے کوئی شے ہے؟ باقی یہ کہ مادرزاد اندھے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اس کی بینائی آ گئی' یہ تو نسبتاً چھوٹی چیزیں ہیں۔ تو کیا مردوں کو زندہ ہوتے دیکھ کر وہ لوگ ایمان لے آئے؟ نہیں' بلکہ لوگوں نے کہا یہ جادوگر ہے اور جادو کفر ہے' لہٰذا کافر ہو گیا' مرتد ہو گیا' واجب القتل ہے' اس کو سولی پر چڑھا دو۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں طے کیا کہ اب معجزے نہیں دکھائے جائیں گے۔ کوئی ہدایت کا طالب ہے تو قرآن موجود ہے' جو سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اور کوئی ہدایت کا طالب نہیں ہے تو بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے گا۔

خاص طور پر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ جب بنی اسرائیل کو صحرا میں بھوک لگی تھی اور کھانے کو کچھ نہیں تھا تو من و سلویٰ نازل ہوئے تھے یا نہیں؟ لیکن یہاں جیش العسرہ' سفرِ تبوک کے دوران بھوک کا یہ عالم اور رسد کی کمی کا یہ حال کہ تین تین مجاہدین کو چوبیس گھنٹوں کا راشن ایک کھجور دی گئی۔ پہلے ایک شخص نے اسے مُنہ میں رکھا اور چوس لیا' پھر دوسرے کو دے دیا' اس نے چوس لیا' پھر تیسرے کو دے دیا۔ اس سے تینوں کو کچھ گلوکوز مل گیا' کچھ انرجی حاصل ہو گئی۔ بتایئے! من و سلویٰ کیوں نازل نہیں ہوا؟ کیا بنی اسرائیل اللہ کو زیادہ محبوب تھے حضرت محمد ﷺ کے ساتھیوں سے؟ کیا موسیٰ علیہ السلام زیادہ عزیز تھے محمد رسول اللہ ﷺ سے؟ غزوۂ خندق کے اندر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت یہ تھی کہ کئی کئی وقت کا فاقہ ہے' کمریں دوہری ہوئی جا رہی ہیں تو کمر سے پتھر باندھ لیے ہیں۔ پیٹ کے اوپر پتھر رکھا اور چادر سے کس لیا تاکہ کمر سیدھی رہے۔ پھر صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے آ کر فریاد کی کہ حضور! اب یہ فاقہ کشی ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے' دیکھئے ہم نے یہ پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ اپنا کرتہ مبارک اٹھا کر دکھاتے ہیں' وہاں دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ یہ سارے نقشے سیرت کے ہیں' لیکن ہمارے ہاں سیرت کے جلسے ہوتے ہیں تو ان کا موضوع کیا ہوتا ہے۔

حسنِ یوسف' دمِ عیسیٰ' یدِ بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

یعنی اے محمد ﷺ! تمام انبیاء کو جو خوبیاں دی گئیں وہ ساری کی ساری تنہا آپؐ کو دے

دی گئیں۔ یوسف علیہ السلام بہت حسین تھے' ان سے بڑھ کر حسن حضرت محمد ﷺ کو عطا کر دیا گیا' دمِ عیسیٰ اور یدِ بیضا جیسے معجزات آپ کو عطا کر دیے گئے!— لیکن حضور ﷺ کی یہ حدیث آپ کو کوئی نہیں سنائے گا کہ ''تمام نبیوں پر جو تکالیف آئی ہیں' میں نے تنہا وہ ساری جھیلی ہیں''۔ بہرحال اس پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا یہ معجزوں سے نہیں ہوا' یہ دعاؤں سے نہیں ہوا۔ یقیناً دعائیں بھی ہوئی ہیں' اس میں کوئی شک نہیں' اللہ کی مدد بھی آئی ہے' مثلاً غزوۂ بدر میں اللہ کی مدد آئی ہے اور مدد کا دروازہ آج بھی بند نہیں ہے۔

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!
فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

مدد تو اب بھی آئے گی۔ معجزہ صرف نبیوں کے لیے ہوتا تھا۔ حضور ﷺ کے لیے بھی بعض معجزے ہیں۔ بعض مواقع پر تھوڑا سا کھانا بہت سے لوگوں کے لیے کفایت کر گیا۔ ایسی کرامات کی نوعیت کی چیزیں ضرور ہوئی ہیں' لیکن ایسے معجزات نہیں آئے جیسے ہم بنی اسرائیل کے معاملے میں دیکھتے ہیں کہ دھوپ پریشان کر رہی ہے تو ساتھ کے ساتھ بادل چل رہا ہے: ﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ بنی اسرائیل چھ لاکھ تھے جو مصر سے نکلے تھے۔ اندازہ کیجیے کہ یہ قافلہ جب چلتا ہوگا تو کتنا بڑا ایریا ہوتا ہوگا' اور اس کے اوپر سائبان کی طرح مسلسل ابر ساتھ ساتھ جا رہا ہوتا۔ یہاں تو نہیں ہوا! یہاں جو کچھ ہوا ہے' زمین پر قدم بقدم چل کر ہوا ہے' عام انسانی سطح پر ہوا ہے' محنت اور مشقت سے ہوا ہے' تکلیفیں جھیل کر اور مصائب برداشت کر کے ہوا ہے' آزمائشوں اور امتحانات سے گزر کر ہوا ہے۔ حضور ﷺ کا اپنا خون دو مرتبہ گرا ہے۔ اگرچہ حضور اکرم ﷺ کی اپنی خواہش تو یہ تھی:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ' لَوَدِدْتُّ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ'

ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ)) (صحیح البخاری)

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ! میری شدید خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں۔''

لیکن اللہ کے رسول قتل نہیں ہو سکتے۔ میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ رسول اور نبی میں فرق ہے۔ ایک فرق یہ نوٹ کر لیجئے کہ نبی تو قتل ہو سکتا ہے لیکن رسول قتل نہیں ہو سکتا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام صرف نبی تھے' قتل ہو گئے' لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف نبی نہیں تھے' رسول بھی تھے ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ لہٰذا وہ قتل نہیں ہو سکتے تھے' وہ سولی نہیں چڑھائے جا سکتے تھے' انہیں زندہ آسمان پر اٹھایا گیا' اور وہ دوبارہ آئیں گے۔ بہرحال یہ ہے میرے نزدیک تکمیل رسالت کا دوسرا مظہر۔

معراجِ انسانیت کا مظہرِ اَتم

تکمیل رسالت کے دوسرے مظہر کے لیے میں نے یہ عنوان مزید قائم کیا ہے۔ دیکھئے اللہ نے انسان کو پیدا کیا' آدم علیہ السلام کو پیدا کیا' خلیفۃ اللہ بنایا' مسجودِ ملائک بنا دیا' تمام فرشتے ان کے سامنے جھکا دیے۔ قرآن حکیم میں ایک سے زائد مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ یہاں جمع کے تین اسلوب ہیں: فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ ''تمام فرشتوں نے سجدہ کیا''۔ كُلُّهُمْ ''سب نے کیا''۔ اَجْمَعُوْنَ ''سب نے مل کر کیا''۔ لیکن اس انسان کے اندر اللہ نے کیا کیا قوتیں رکھی ہیں' اس کا کامل ترین مظہر شخصیت محمدیؐ ہے۔ انسانیت کی عظمت کو دیکھنا ہو' اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ محمد عربی ﷺ ہیں۔ علامہ اقبال نے غالب کے بارے میں ایک شعر کہا تھا:؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا!

اے غالب! تیری شخصیت اور تیرے اشعار سے انسان کی سوچ پر یہ بات کھلی کہ انسان کا تخیل کہاں تک جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے یہ بات

واضح ہوئی کہ انسان میں اللہ تعالیٰ نے کتنی طاقت رکھی ہے۔ لہٰذا معراجِ انسانیت کا ظہور اور اس کا مظہرِ اَتم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

تکمیلِ رسالت کا منطقی نتیجہ

تکمیلِ رسالت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے جتنے رسول آئے وہ کسی قوم کے لیے، کسی علاقے کے لیے یا کسی شہر کے لیے آئے، پوری نوعِ انسانی کے لیے کوئی رسول مبعوث نہیں ہوا۔ محمد عربی ﷺ اللہ کے واحد رسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖۤ﴾ ”ہم نے نوح کو بھیجا اس کی قوم کی طرف“۔ حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں صراحت ہے کہ آپؑ قومِ عاد کے لیے بھیجے گئے: ﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا﴾ حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے: ﴿وَاِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا﴾ اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام قومِ مدین کی طرف بھیجے گئے ﴿وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا﴾۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اشکال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اس وقت پوری دنیا میں ہیں اور ساری نسلوں کے لوگ ہیں۔ مشرقِ بعید میں چلے جایئے، عیسائیت موجود ہے۔ تاریک براعظم افریقہ کے گھنے ترین جنگلات میں کانگو کے تاس میں پہنچ جایئے، وہاں آپ کو عیسائی مل جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائی مشنریز نے تبلیغ کے ضمن میں بہت کارنامے کیے ہیں اور عیسائیت کو جہاں جہاں پہنچایا ہے، عام انسانوں کا وہاں پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ آپ کے ملک میں جیکب آباد میں عیسائی مشن قائم ہیں۔ وہاں اتنی شدید گرمی ہے کہ ہم بھی وہاں پر جاتے ہوئے گھبراتے ہیں، لیکن وہاں انہوں نے اپنے مشن قائم کیے۔ تو اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہو، لیکن اس نکتے کو سمجھ لیجیے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اور منصوص اور منقول ہونے کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں کہا گیا:

﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ﴾ ''وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف''۔ قرآن کی اس نصِ قطعی کے علاوہ خود انجیل میں موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں''۔ پھر جب آپ نے اپنے بارہ حواریوں کو بھیجا ہے کہ جاؤ' اب جو چیز تمہیں مجھ سے ملی ہے اسے تقسیم کرو' لوگوں میں پہنچاؤ' تبلیغ کرو' تو ساتھ ہی فرمادیا کہ تمہیں Gentiles میں تبلیغ نہیں کرنی ہے۔ یہ Goyems اور Gentiles یہود کی اصطلاحیں ہیں۔ یہودی سمجھتے ہیں کہ دراصل انسان تو صرف ہم یہودی ہیں' باقی جو مختلف نسلوں کے انسان ہیں' یہ انسان نما حیوان ہیں۔ ان کی شکلیں انسانوں کی سی ہیں' حقیقت میں یہ حیوان ہیں۔ اور ان کے لیے یہودی Goyems اور Gentiles کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ انجیل میں موجود ہے کہ Gentiles کو تبلیغ کرنے سے حضرت مسیح علیہ السلام نے روکا۔ بلکہ انجیل میں جو الفاظ ہیں وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ نہیں ہو سکتے' اس میں یقیناً کسی اور نے نمک مرچ ملا دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ ''کوئی شخص بھی اپنے بچوں کے حصے کی روٹی کُتّے کے آگے نہیں ڈالتا۔''

بہرحال یہ بات قرآن سے بھی ثابت ہے اور انجیل سے بھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ یہ تو اصل میں سینٹ پال تھا' جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دین کو ختم کر دیا اور مسیحیت کے نام پر اپنا خود ساختہ مذہب دنیا میں پھیلا دیا' جیسے ہمارے ہاں عبداللہ بن سبا یہودی' اسلام کا شدید دشمن' ایک موقع پر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آ گیا اور اس نے مسلمانوں کے اندر رخنہ پیدا کیا' بنواُمیہ اور بنو ہاشم کی پرانی چپقلش کو زندہ کیا اور کہا کہ اللہ کے رسولؐ کے وصی تو علی ہیں' خلافت ان کا حق ہے' یہ عثمان جو بیٹھا ہے یہ غاصب ہے' اور اس سے پہلے ابوبکر اور عمر بھی غاصب تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین' نقلِ کفر' کفر نباشد) بہرحال اسی کے پھیلائے ہوئے فتنے کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی۔ پھر ساڑھے چار برس تک مسلمان آپس میں لڑتے رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے دوران ساڑھے چار سال میں ایک لاکھ

مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور نیزوں سے ختم ہوئے۔ تو وہ جو اسلامی فتوحات کا سیلاب پوری طرح دنیا پر چھا رہا تھا' جس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں ع

تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!

وہ سیلِ رواں تھم گیا۔ اسلام کی جو پیش قدمی دائیں اور بائیں دونوں طرف ہو رہی تھی وہ رک گئی۔ ورنہ اُسی وقت پوری دنیا میں اللہ کے دین کا بول بالا ہو چکا ہوتا۔

اسی طرح نام نہاد سینٹ پال کا معاملہ تھا۔ جب تک حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں موجود رہے وہ آپؑ کا شدید ترین مخالف رہا۔ جب حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ نے اٹھا لیا تو اب وہ منافقت کا لبادہ اوڑھ کر آ گیا کہ مجھے مکاشفہ ہوا ہے' مسیحؑ سے ملاقات ہوئی ہے اور اب میں مسیحؑ پر ایمان لے آیا ہوں اور مسیحؑ نے مجھے یہ حکم دیا ہے' یہ مقام عطا کیا ہے۔ پھر وہ متبعین مسیحؑ کا سب سے بڑا لیڈر بن گیا اور اس نے مسیحیت میں وہ تبدیلیاں کیں کہ حضرت مسیحؑ کے دین کو یکسر ختم کر دیا۔ عبداللہ بن سبا بھی ہمارے دین کو ختم کر دینا چاہتا تھا' لیکن یہ آخری دین تھا' اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی ہے' جبکہ سینٹ پال نے توفی الواقع حضرت مسیحؑ کے دین کو ختم کر دیا۔ سب سے بڑا کام یہ کیا کہ توحید کو تثلیث سے بدل دیا۔ حضرت مسیحؑ کے کسی قول کے اندر تثلیث موجود نہیں ہے۔ آپ چاروں اناجیل پڑھ جائیے' اگرچہ یہ تحریف شدہ اناجیل ہیں پھر بھی کہیں بھی آپ کو تثلیث کا جملہ نہیں ملے گا۔ یہ سینٹ پال کی ایجاد ہے۔ دوسرے یہ کہ شریعت کو ساقط کر دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام یہ کہہ کر گئے تھے کہ جو موسیٰ کی شریعت ہے وہ تم پر بھی نافذ رہے گی' لیکن اُس نے شریعت موسوی کو ساقط کر دیا۔ تیسرے یہ کہ مسیحیت کی تبلیغ کا دائرہ Gentiles یعنی غیر اسرائیلوں کے اندر وسیع کر دیا' ورنہ از روئے قرآن اور از روئے انجیل' حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے قول کے مطابق آنجنابؑ کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اور آخری رسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہوئی ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں پانچ مرتبہ' مختلف الفاظ میں' آیا ہے۔ سب سے واضح انداز میں سورۂ سبا میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ

﴿اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (آیت ۲۸) ''(اے محمد ﷺ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ''ہم نے آپؐ کو (کسی ایک قوم یا کسی ایک علاقے کے لیے نہیں بلکہ) تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔ نبوت و رسالت ہمیشہ سے رحمت ہے، مگر آپؐ پر آ کر یہ رحمت ''رحمۃٌ لِّلعالمین'' بن گئی ہے، یہ تکمیلِ رسالت کا ایک مظہر ہے۔ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ میں خود نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ کہلوایا گیا: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ ''(اے محمد ﷺ! ڈنکے کی چوٹ) کہہ دو: اے لوگو! (اے بنی نوعِ آدم!) میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

تکمیلِ رسالت کا تشنۂ تکمیل مظہر

اب دیکھئے، مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات! ختم رسالت کا یہ پہلو اور یہ مظہر تا حال تشنۂ تکمیل ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ اللہ نے بھیجا حضرت محمد ﷺ کو غلبہ دین کے لیے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تاکہ دین حق کو غالب کر دیں تمام ادیان پر۔ اور بھیجا پوری نوعِ انسانی کے لیے۔ ان دونوں باتوں کو جوڑیے، صغریٰ کبریٰ ملا دیجئے تو بعثتِ محمدیؐ کا مقصد یعنی تکمیل رسالت کا آخری مرحلہ وہ ہوگا کہ جب کل نوعِ انسانی پر اللہ کا دین غالب آ جائے۔ علامہ اقبال نے ''جوابِ شکوہ'' میں بڑی پیاری بات کہی ہے: ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے!
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!!

یہ کام ابھی نہیں ہوا۔ پوری نوعِ انسانی تک تو یہ دین نہیں پہنچا۔ پوری نوع انسانیت پر اللہ کے دین کا غلبہ نہیں ہوا۔ لیکن نوٹ کر لیجیے کہ یہ ہو کر رہنا ہے۔ ''نوید خلافت'' نامی کتابچے میں وہ احادیث درج ہیں جن میں حضور ﷺ نے یہ خبریں دی ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اپنے زمانے سے لے کر تا قیامِ قیامت پانچ ادوار گنوا دیے

ہیں: (۱) دورِ نبوت (۲) خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' یعنی خلافت راشدہ (۳) ظالمانہ ملوکیت (۴) غلامی والی ملوکیت (۵) پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ۔ اس وقت نوعِ انسانی اس پانچویں دَور کی دہلیز تک پہنچی ہوئی ہے' گویا یہ دَور آیا چاہتا ہے' زیادہ دُور نہیں ہے۔ ''نوید خلافت'' نامی کتابچہ ہم نے لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا ہے۔ موجودہ ماحول میں اسلام اور مسلمانوں کے جو حالات ہیں' ان سے بڑی مایوسی ہوتی ہے اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ۔

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!

اس نا اُمیدی کے چکر سے نکلنے اور ''دامانِ خیالِ یار'' کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے ان احادیث کو حرزِ جان بنائیں' انہیں پڑھیں' یاد کریں' انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ اپنے طور پر اس کتابچے کو چھاپیں اور تقسیم کریں۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا ' وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا)) (صحیح مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا) تو میں نے اس کے تمام مشرق اور تمام مغرب دیکھ لیے۔ اور سن رکھو! میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو زمین کو سکیڑ کر اور لپیٹ کر مجھے دکھا دیے گئے۔''

کوئی شک ہے؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا ختم ہو جائے اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل رسالت کا یہ مظہر پورا نہ ہو کہ کل روئے ارضی پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین' دین الحق اسی طرح غالب ہو جائے جیسے آپؐ کے دست مبارک سے جزیرہ نمائے عرب میں ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ﴾ کی شان سے غالب ہوا تھا۔ اس کے لیے آپؐ نے تکلیفیں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں' قربانیاں دیں' سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ایک ایک صحابی کی جان ہم جیسے لاکھوں کی جانوں سے بڑھ کر قیمتی ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جان کی قیمت کا ہم کیا اندازہ لگائیں گے! یہ جانیں دی گئیں تب دین غالب ہوا۔ اور اسے پوری دنیا پر غالب ہونا ہے' ورنہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلِ

رسالت کا تقاضا پورا نہیں ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ دنیا ختم ہو جائے اور حضور ﷺ پر تکمیلِ رسالت کا یہ تقاضا کہ کل روئے ارضی پر آپؐ کالایا ہوا دین نافذ ہونا ہے' پورا نہ ہو!

ایک اور حدیث جو حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((لَا يَبْقَى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ ......)) (مسند احمد)

''اس روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ ہی کمبلوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ بچے گا جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے۔''

یہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی وقت واقعتاً حضور ﷺ کی ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت بمعنی تکمیلِ نبوت و تکمیلِ رسالت کا بتمام وکمال ظہور ہوگا۔ علامہ اقبال نے نبی اکرم ﷺ کی احادیث کے مضامین کو بھی اپنے اشعار میں پیش کیا ہے' جیسے کہ اپنے بے شمار اشعار کے اندر قرآن مجید سے استشہاد کیا ہے۔ چنانچہ اس آنے والے دَور کے بارے میں کہتے ہیں ۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

دیکھئے یہ کام پہلے جب ہوا تھا' محمد رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے جزیرہ نمائے عرب میں دین کا غلبہ ہوگیا۔ پھر آپؐ کے بعد اس کی توسیع ہوئی۔ اسلامی افواج مشرق و مغرب میں نکل کھڑی ہوئیں۔ مشرق میں عراق سے ہو کر ایران پہنچیں اور پھر یہ پورا

ملک جو اُس زمانے کا خراسان تھا' فتح ہوا اور پھر چین تک بات پہنچ گئی۔ مغرب میں اسلامی افواج شام اور جزیرہ نمائے سینا کو فتح کرتے ہوئے مصر اور لیبیا جا پہنچیں اور ہوتے ہوتے بحر اوقیانوس تک بات پہنچ گئی۔ از کجا تا بہ کجا! کہاں سے کہاں تک! وہ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا سبائی فتنے نے اندرونی خلفشار پیدا کیا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا جس سے ان کی قوت ٹوٹ گئی۔ جیسے کسی اونچائی پر ٹرک چڑھ رہا ہو اور کہیں موشن ٹوٹ جائے تو اس کے بعد مزید چڑھائی چڑھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ صورت کہ ع "تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا!" یکسر تبدیل ہو گئی' ہمارا وہ سیل رواں تھم گیا اور reversal شروع ہو گیا۔ اب بھی یہی ہو گا کہ کسی ایک خطے میں اللہ کا وہ نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو گا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایسا ہونا ہے' یہ یقینی ہے' اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ کب ہو گا؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کتنی قربانیاں دے کر ہو گا' یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ابھی کتنے نشیب و فراز آئیں گے' ہم نہیں کہہ سکتے۔ میرے مشاہدے میں کچھ اشارات ہیں کہ اب غلبۂ اسلام کا آغاز پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان سے ہو گا۔ اگرچہ موجودہ حالات بڑے تباہ کن ہیں' افسوس ناک ہیں' افغانستان میں طالبان کی قائم کردہ اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے' جہادِ کشمیر پر ریورس گیئر لگ چکا ہے۔ اللہ نہ کرے' لیکن بش صاحب نے اپنی سیکرٹ ایجنسیوں کو ایسی تیاریاں مکمل کرنے کا حکم دے دیا ہے کہ اگر ذرا سا بھی اندیشہ ہو کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیتوں تک بنیاد پرستوں کی رسائی ہو سکتی ہے' تو اُن پر فوراً قبضہ کر لیا جائے۔ سود کے خاتمے کے بارے میں ہمارے یہاں جو پیش رفت ہوئی تھی' اب اس پر بھی ریورس گیئر لگ گیا ہے اور اس ضمن میں ربع صدی کی مساعی پر خطِ تنسیخ پھیر دیا گیا ہے۔ تو حالات بڑے ناساعد اور ناموافق ہیں۔ لیکن ؎

اور بھی دَور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!

اور ؏ جو تھا' نہیں ہے' جو ہے' نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ!

ظاہر بات ہے کہ کوئی بھی حالات ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتے۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان شاء اللہ العزیز اسی خطۂ ارضی سے غلبۂ اسلام کا آغاز ہوگا' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے چار پانچ سو سال سے اس کی تمہید کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت میں پاکستان سے کوئی بڑا کام لینا مقصود ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ اللہ کے دین کے غلبے اور اس کی اقامت کے لیے کمر کس لے۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے' کیا نہیں ہوتا' یہ میرے اور آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں اس کے بارے میں جواب دہ ہوں' آپ جو کچھ کر سکتے ہیں' جو بھی آپ کے اختیار میں ہے اس کے لیے آپ عنداللہ مسئول ہیں' ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت محمد رسول اللہ ﷺ کی وفاداری کے ساتھ مشروط ہے۔ ؏ "کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں!" چنانچہ جن کو محمد ﷺ کے ساتھ وفا کا دعویٰ ہے وہ اپنے سر پر کفن باندھ کر اور یہ عہد کر کے کہ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) "یقیناً میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔" اللہ کے دین کو عملاً قائم کرنے کی جدّوجُہد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اس لیے کہ تکمیل رسالتِ محمدیؐ کا آخری مرحلہ ابھی باقی ہے' جس کی خبر دی ہے اللہ کے رسول ﷺ نے کہ یہ ہونا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ بعثتِ محمدی کا تقاضا بتمام وکمال پورا نہ ہو اور دنیا ختم ہو جائے!

دنیا کے خاتمے سے پہلے چہار دانگ عالم پر' کُل عالمِ انسانیت پر اللہ کا دین نافذ ہوگا۔ اسی کام کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ ہم نے اللہ سے پکار پکار کر' چیخ چیخ کر دعائیں کی تھیں کہ اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے' ہم تیرے نبی کے دین کا بول بالا کریں گے' پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ہم پاکستان میں اسلام کے اصولِ حریّت واخوّت ومساوات کا نمونہ دنیا

کے سامنے پیش کریں گے اور اسی لیے ہمیں معجزے کے طور پر یہ ملک ملا تھا' لیکن افسوس' صد افسوس! اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ' ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ' ۵۵ برس گزر گئے لیکن اسلام یہاں نہیں آیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ اللہ نے پہلے ۲۵ برس ہمیں مہلت دی تھی۔ جب ہم نے اسلام نافذ نہیں کیا تو اللہ نے عذاب کا ایک کوڑا ہماری پیٹھ پر برسایا۔ ہندوستان کے ہاتھوں ۱۹۷۱ء کی شکست عظیم یاد ہے؟ ہمارے ۹۳ ہزار فوجی اس ہندو کے ہاتھوں جنگی قیدی بنے جس پر ہم نے کہیں ہزار برس حکومت کی تھی' کہیں چھ سو برس اور کہیں آٹھ سو برس۔ اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ہم نے دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ:

"We have avenged our thousand years defeat."

کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔

غور کیجیے کہ اللہ کے عذاب کا یہ کوڑا کیوں پڑا؟ اس لیے کہ ہم نے اللہ کے دین کے ساتھ بے وفائی کی' اللہ کے ساتھ وعدہ خلافی کی اور اللہ کے دین کو نافذ نہیں کیا۔ اور اب جو حالات ہیں وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ ہم امریکہ کے ہاں گروی رکھے جا چکے ہیں' ہمارے Bases اس کے کنٹرول میں ہیں۔ ایف بی آئی' سی آئی اے اور موساد پاکستان میں موجود ہے۔ ہمارے ایئر پورٹس پر ان کے معین حصے ہیں' ہماری خود مختاری گویا گروی رکھ دی گئی ہے۔ دوسری طرف بھارت کی دھمکی آمیز روش اور اس کی رعونت کو دیکھئے کہ کتنے بڑے پیمانے پر اس نے ہماری سرحدوں پر فوجیں لا کھڑی کی ہیں اور ہم اس سے معذرت کر رہے ہیں کہ دراندازی بالکل بند ہو چکی ہے۔ حالانکہ پہلے ہم کہہ رہے تھے کہ یہ تو مجاہدین آزادی ہیں' آزادی کی جدوجہد اُن کا حق ہے' لیکن اب ہمیں اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑا ہے۔ یہ حالات ہیں جس میں اندیشہ ہے کہ کہیں اللہ کے عذاب کا بڑا کوڑا ہماری پیٹھ پر نہ برس جائے۔ آپ میں سے بہت سے لوگوں کے علم میں ہوگا کہ آج سے کوئی سال بھر پہلے امریکہ کے ایک بہت بڑے تھنک ٹینک کی طرف سے یہ بات آ چکی ہے کہ ۲۰۲۰ء میں پاکستان کے نام سے کوئی ملک دنیا میں موجود نہیں ہوگا۔ اللہ نہ

کرے کہ ایسا ہو! اللہ تعالیٰ ان کے عزائم کو خاک میں ملانے پر قادر ہے' لیکن اگر ہمارے چلن یہی رہے تو شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لے۔ ہم نے موٹر وے بنالی' ہم نے بڑے بڑے محل بنالیے۔ کراچی' لاہور اور پشاور کی ڈیفنس سوسائٹیاں ذرا جاکر دیکھئے کہ کیسے کیسے محلات تعمیر کیے گئے ہیں۔ اسلام آباد کے بنگلے دیکھئے کہ دو دو' تین تین کروڑ کا ایک ایک بنگلہ ہے' لیکن ہم اسلام نافذ نہیں کر سکے۔ یہ جرم ہمارا ایسا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس پر اللہ آخری سزا دے دے اور ہوسکتا ہے کہ ابھی کچھ مہلت باقی ہو۔ بہر حال ایک بات محاورے کے طور پر کہی جاتی ہے کہ ''جب تک سانس تب تک آس''۔ جب تک اللہ نے مہلت دے رکھی ہے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ کرنا کیا ہے' یہ جان لیجئے!

میرے اب تک کے بیان سے بھی یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ اسلامی نظام کا قائم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ محمدِ عربی ﷺ کو بھی اس راہ میں اپنے دندانِ مبارک شہید کروانے پڑے' اپنے خون کا فوارہ چھڑوانا پڑا' اور ۲۵۹ صحابہ کی جانوں کا نذرانہ دینا پڑا' جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی۔ آج بھی یہ کام آسان نہیں ہے۔ ؏ ''لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!'' آج اسلام کے نفاذ کے لیے ہماری تنظیم اسلامی کا جو طریقہ کار ہے' وہ میں اب آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

(۱) پہلا مرحلہ یہ ہے کہ خود اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اسلام نافذ کیا جائے۔ سب سے مشکل کام یہی ہے۔ ؏ ''منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!'' ہمارے عوام کی عمومی روش یہ ہے کہ ہم سے نعرے لگوا لو' چندے لے لو' جلوس نکلوا لو' جلسے کروا لو' لیکن ہماری زندگی کا جو نقشہ ہے وہ نہیں بدلے گا۔ اگر سودی کاروبار ہے تو وہ جاری رہے گا' اگر سودی قرضہ لے کر محل بنایا ہے تو وہ باقی رہے گا' اگر گھر میں شرعی پردہ نہیں ہے تو نہیں آئے گا' تو اسلام کیسے آجائے گا؟ لہٰذا جس کا بھی ارادہ ہو' جسے بھی اللہ تعالیٰ آپ میں سے قبول فرمالے اسے پہلا فیصلہ یہ کرنا ہوگا کہ مجھے اپنی زندگی سے حرام کو نکال دینا ہے' فرائض و واجبات کی پابندی کرنی ہے اور ارکانِ دین کی بجا آوری تمام شرائط کے ساتھ کرنی ہے۔ پھر یہ کہ اپنے وجود پر اور اپنے گھر پر شریعت کا مکمل نفاذ کرنا ہے۔

(۲) شریعت پر کاربند ہونے کا عزم کر لینے والے پھر مل جل کر ایک طاقت بنیں۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) یعنی اللہ کی تائید اور اللہ کی نصرت جماعت کے ساتھ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول تو یہاں تک ہے: ((لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ)) ''جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں ہے''۔ چنانچہ جماعت کی شکل اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم نے تنظیم اسلامی بنائی۔ ہمارا سیاست کا کھیل کھیلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو اپنی زندگی کے دس سال جماعت اسلامی کی تحریک کی نذر کر کے پھر وہاں سے نکلا تھا' اور اسی بنیاد پر نکلا تھا کہ آپ نے جو الیکشن کا راستہ اختیار کیا ہے اس سے آپ عام معنی میں سیاسی جماعت بن گئے ہیں' اب آپ وہ انقلابی جماعت نہیں رہے جس میں مَیں نے شمولیت اختیار کی تھی۔ ہماری دعوت یہ ہے کہ ہماری جماعت میں آنے والے لوگ پہلے اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اللہ کے دین کو نافذ کریں' جو بڑا مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری رفتار بڑی کمزور ہے۔ لوگ نعرے لگانے کو تیار ہیں' کسی کو کافر کہلانا ہو تو نعرے لگا دیں گے' کسی کے خلاف کوئی مہم اٹھانی ہو تو اٹھا دیں گے' مگر خود اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد:۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو نہ بدلے۔ تو پہلا قدم اپنے آپ کو بدلنا اور دوسرا قدم مل جل کر جماعت بنانا ہے۔

دنیا میں جماعت سازی کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ایک دستوری طریقہ ہے کہ اگر آپ کو کسی جماعت کا دستور منظور ہے تو آپ اس کے رکن بن گئے' پھر ارکان جو ہیں وہ صدر یا امیر کا ایک معین مدت دو سال' چار سال یا چھ سال کے لیے انتخاب کریں گے۔ پھر اس امیر یا صدر کے لیے شوریٰ یا مینیجنگ کمیٹی ہوگی۔ اس میں طے کیا جائے گا کہ کتنے اختیار امیر کے پاس ہیں اور کتنے شوریٰ یا مینیجنگ کمیٹی کے پاس ہیں۔ یہ طریقہ کار میرے نزدیک مباح ہے' جائز ہے' حلال ہے' حرام نہیں ہے' لیکن مسنون نہیں ہے۔ جماعت سازی کا مسنون طریقہ بیعت پر مبنی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر

حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت علی الموت لی کہ اپنی جانیں دے دیں گے لیکن یہاں سے نہیں ہلیں گے۔ غزوۂ احزاب میں خندق کھودی جا رہی تھی تو کئی کئی وقتوں کے فاقے کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب پھاوڑے چلا رہے تھے تو ان کی زبان پر ایک شعر تھا' جسے وہ آواز ملا کر پڑھ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے جہاد کی بیعت کی ہے' اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک جان میں جان ہے۔''

جب جان نکل جائے تو ہماری ذمہ داری ختم ہو جائے گی' جب تک جسم میں جان ہے' یہ جہاد جاری رہے گا۔

اب آپ بیعت کے بارے میں یہ متفق علیہ روایت ملاحظہ کیجئے جس کے راوی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس حدیث میں مذکور بیعت نو نکات پر مشتمل ہے اور اسی کو ہم نے تنظیم اسلامی میں اختیار کیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرُہِ ' وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا ' وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ ' وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا ' لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''ہم نے بیعت کی تھی اللہ کے رسول ﷺ سے اس پر کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' چاہے مشکل ہو چاہے آسانی ہو' چاہے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں چاہے ہمیں طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے' چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دی جائے (ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہم آپ کے پرانے خادم تھے اور آپ نے ایک نووارد کو ہمارے اوپر امیر کیوں بنا دیا؟ بلکہ یہ آپ کا اختیار ہو گا جسے آپ چاہیں امیر بنائیں) جنہیں امیر مقرر کیا جائے گا ان سے جھگڑیں گے نہیں (ان کی بھی اطاعت کریں گے) البتہ ہر موقع پر جو صحیح رائے ہو گی وہ ضرور پیش کر دیں گے' اللہ کے معاملے میں ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔''

یہ بیعت محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لی تھی۔ ہم نے اس کو ایک لفظ (فِی المَعْرُوف) کے اضافہ کے ساتھ اختیار کر لیا۔ اس لیے کہ امیر تنظیم اسلامی کی بیعت مطلق نہیں ہے' شریعت کے دائرے کے اندر اندر ہے۔ امیر تنظیم شریعت کے کسی حکم کے خلاف حکم نہیں دے سکتا' البتہ اس دائرے کے اندر اندر جو حکم دے گا وہ واجب التعمیل ہے۔

(۳) جو لوگ یہ بیعت کر لیں اور وہ اپنے گھر پر' اپنی ذات پر اللہ کا دین حتی المقدور نافذ کر چکے ہوں اب وہ یہی کام کریں کہ یہ دعوت لوگوں تک پہنچائیں —— زبان سے' کتابوں سے' رسالوں سے' ویڈیوز سے' آڈیوز سے' گفتگوؤں سے اور خطابات عام سے یہ پیغام عام کر دیں' تاکہ لوگ اس جماعت میں شامل ہوں' اور ان کی معتدبہ تعداد ہو جائے۔ پھر ان کی تربیت ہو۔ اور جب تک تعداد اتنی کافی نہ ہو جائے کہ پورے نظام کو چیلنج کیا جا سکے اُس وقت تک یہی کام باللسان کرنا ہے' زبان سے نیکی کی بات کرنی ہے' زبان سے برائی سے روکنا ہے اور ساتھ ساتھ تربیت کا عمل جاری رکھنا ہے۔ اور جب طاقت کافی ہو جائے' منظم بھی ہوں' واقعتاً اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار بھی ہوں' تو اب ہم چیلنج کریں گے کہ ہم یہ فلاں حرام کام یہاں نہیں ہونے دیں گے' یا ہم نہیں یا یہ نہیں! گھیراؤ کریں گے' پکٹنگ کریں گے' جلوس نکالیں گے' دھرنے ماریں گے' اپنے سینے کھول کر کہیں گے کہ چلاؤ ہم پر گولی!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت! نہ کشور کشائی!

جو کام ایرانیوں نے کیا وہ یہاں کرنا ہوگا۔ انہوں نے بیس ہزار سے تیس ہزار کے درمیان جانیں دے دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہنشاہ آریا مہر کو جان بچا کر بھاگنا پڑا اور آیت اللہ خمینی پیرس سے نازل ہو کر وہاں کا حکمران بن گیا۔ یہ تو ہماری زندگیوں میں ہوا ہے' کوئی بہت پرانا معاملہ نہیں ہے' ابھی اس کو رُبع صدی بھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ کوئی ازمنہ قدیمہ کی تاریخ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں غلطی یہ ہوئی کہ کچھ لوگوں نے سوچا کہ چلو الیکشن کا راستہ دیکھتے ہیں'

ہمیں زیادہ ووٹ مل جائیں گے‘ حکومت ہماری ہو جائے گی تو ہم اسلامی نظام قائم کر دیں گے۔ لیکن یہ راہِ یسیر راہِ عسیر بن گئی‘ یہ شارٹ کٹ longest کٹ بن گئی۔ جماعت اسلامی نے ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ الیکشن میں حصہ لیا تھا‘ اب ۲۰۰۲ء میں لے رہے ہیں‘ لیکن ان ۵۱ برسوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ اور سوچئے‘ کیا آیت اللہ خمینی کی حکومت ایران میں الیکشن کے ذریعے قائم ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں‘ ناممکن! اس اعتبار سے یہ نہ سمجھئے کہ میں آیت اللہ خمینی کی پوری دعوت اور ان کے عقائد کی تائید کر رہا ہوں۔ نہیں‘ وہ شیعہ ہیں‘ ہمارا ان کا بڑا اختلاف ہے‘ لیکن یہ کہ انقلاب برپا کرنے کے لیے اِس وقت دنیا میں آخری قدم الیکشن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ کسی طرح کی دہشت گردی کر کے اور کسی چھاپہ مار جنگ سے بھی اسلام نہیں آئے گا۔ لوگوں نے یہ راستے اختیار کر کے دیکھ لیے ہیں‘ لیکن کہیں کامیابی نہیں ہوئی‘ نہ الجزائر میں نہ مصر میں‘ حالانکہ بہت سے لوگوں نے جانیں دی ہیں اور خلوص کے ساتھ دی ہیں۔

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے دو ہی راستے ہیں‘ بیلٹ یا بلٹ۔ لیکن ان دونوں کے علاوہ تیسرا راستہ وہ ہے جو ایرانیوں نے دکھایا۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ ‘ فَحَيْثُ وَجَدَهَا هُوَ اَحَقُّ بِهَا)) یعنی حکمت کی بات‘ دانائی کی بات‘ عقل کی بات‘ سمجھ کی بات وہ تو مؤمن کی گمشدہ متاع کی مانند ہے‘ جہاں سے بھی مل جائے مؤمن اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ چنانچہ جہاں سے ملے لے لو! شیعہ حضرات نے تو پاکستان میں بھی اپنا مطالبہ منظور کروا کے دکھا دیا تھا۔ ضیاء الحق صاحب نے زکوٰۃ آرڈی نینس نافذ کیا تھا جس پر شیعہ بپھر گئے تھے کہ ہم حکومت کو زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ اندازہ کیجئے کہ مارشل لاء کی حکومت تھی‘ اور مارشل لاء ابھی بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء آیا تھا اور ابھی ۱۹۸۰ء تھا۔ اس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا‘ لیکن پچاس ہزار افراد نے اسلام آباد میں جمع ہو کر مرکزی سیکریٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا اور دھرنا مار کر بیٹھ گئے کہ ہمیں زکوٰۃ آرڈی نینس سے مستثنیٰ کیا جائے۔ چنانچہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ناک زمین پر رگڑی گئی اور اس نے یقین دہانی کرائی‘

تب وہ اٹھے۔ یہ طریقہ ہے کام کرنے کا۔ اگر گولی چلتی تو وہ جانیں دیتے۔ ایران میں گولیاں چلی ہیں اور مظاہرین نے جانیں دی ہیں۔ یہاں ضیاء الحق سمجھ دار آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شیعوں کے ایسے ہجوم پر اگر گولی چلادی گئی تو پاکستان میں طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ شیعہ آفیسرز آرمی میں' پولیس میں' بیوروکریسی میں اور ذرائع ابلاغ میں' ہر جگہ موجود ہیں۔ کہاں نہیں ہیں؟ اس لیے اس نے اپنی ناک نیچی کر لی اور ان کا مطالبہ مان لیا۔ یہ طریقہ ہے آج کی دنیا میں مطالبات منوانے کا! لیکن جیسا کہ میں نے کہا' اس کے لیے وہ لوگ تیار ہو جائیں جو خود دین پر کاربند ہو چکے ہوں۔

اس وقت دنیا کے جو حالات ہیں ان میں عالمِ اسلام خصوصاً ہمارے ملک میں شدید مایوسی کی کیفیت ہے۔ اس مایوسی کے ازالے کے لیے ہمیں ان احادیث کی ضرورت ہے جن کا میں نے حوالہ دیا ہے کہ ان میں حضور ﷺ نے روشنی کی کرنیں دکھائی ہیں — چنانچہ نہ بش صاحب اترائیں' نہ شیرون اترائے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ ایک ایک یہودی قتل ہوگا' اور عظیم تر اسرائیل بنانے کا جو یہ خواب دیکھ رہے ہیں' وہ ان کا عظیم تر قبرستان بنے گا۔ اس کی خبر دی ہے محمد رسول اللہ ﷺ نے' اور یہ ہو کر رہے گا۔ ابھی حالات ذرا خراب ہیں' لیکن درحقیقت جتنے بھی حالات خراب ہیں' اتنے ہی اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے مواقع زیادہ ہیں۔ حالات آسان ہو جائیں تو نیکی کا وہ اجر و ثواب نہیں ہوتا جو مشکل حالات میں کی گئی نیکی کا اجر و ثواب ہوتا ہے۔ مشکل حالات تو اہلِ ہمت کی ہمت میں مزید اضافہ کرتے ہیں ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

ان حالات میں ہمارے لیے موقع ہے کہ ہم تن من دھن اللہ کی راہ میں لگائیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے عظیم سے عظیم تر اجر و ثواب پائیں۔

یہ ہے تنظیم اسلامی کی دعوت جو میں نے پیش کر دی ہے۔ میری گفتگو کا خلاصہ ایک مرتبہ پھر دیکھ لیجیے۔ ختمِ نبوّت کے دو مفہوم: (۱) حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

(۲) حضور ﷺ پر نبوت و رسالت کی تکمیل ہو گئی —— تکمیلِ نبوت کے دو مظہر: (۱) ہدایتِ خداوندی قرآن مجید میں مکمل ہو گئی اور اسے محفوظ کر دیا گیا۔ (۲) دین حق کامل کر دیا گیا اسلام کی شکل میں: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ —— تکمیلِ رسالت کے دو مظہر: (۱) حضور ﷺ نے دین کو قائم کر کے دکھا دیا' وہ صرف نظری بات نہیں تھی' صرف کتاب میں لکھی ہوئی شے نہیں دی' بلکہ عملی نمونہ پیش کیا' حجت قائم کی۔ (۲) حضور ﷺ کی رسالت تمام دنیا کے لیے ہے۔ آفاقی اور گلوبل رسالت صرف حضرت محمد ﷺ کی ہے' نہ عیسیٰؑ کی تھی' نہ موسیٰؑ کی تھی اور نہ ابراہیمؑ کی تھی (علیہم الصلوٰۃ والسلام) —— لیکن اس آخری بات کے کچھ عملی تقاضے ہیں۔ اس وقت تو حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں ہم یہ کہہ سکیں کہ پورا اِسلام نافذ ہے اور دنیا کو دعوت دے سکیں کہ آؤ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے اسلام کی برکات کا مشاہدہ کر لو کہ یہ اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضور ﷺ کی بعثت کا جو گلوبل تقاضا ہے یعنی پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ' اس کے لیے محنت و مشقت اور جدّوجہد جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کی تھی' ہمیں بھی کرنی ہو گی۔ صحابہؓ نے مشقتیں جھیلیں' مصیبتیں اٹھائیں' آزمائشوں میں سے گزرے' عملاً امتحانات کی بھٹیوں میں سے گزرے' تب یہ کام کیا ہے۔ اسی کے لیے ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عنصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

SBU211S